دبستان لکھنؤ کے عظیم ادیب

ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی

شاعر، نثر نگار، ڈرامہ نگار اور صحافی

(۱۸۶۴ء - ۱۹۱۳ء)

ڈاکٹر کومل بھٹناگر

ملک الشعراء

منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی

شاعر، نثر نگار، ڈرامہ نگار اور صحافی

(۱۸۶۴ء تا ۱۹۱۳ء)

ڈاکٹر کومل بھٹنا گر

(سابق پرنسپل آریہ کنیا ڈگری کالج الہ آباد)

کتاب کا نام	:	ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی
مصنفہ	:	ڈاکٹر کومل بھٹناگر
سن اشاعت	:	2007ء
تعداد اشاعت	:	400
ناشر	:	مصنفہ
قیمت	:	Rs, 250/-

ملنے کے پتے:

۱۔ ڈاکٹر کومل بھٹناگر C-2001/28 اندرا نگر، لکھنؤ

۲۔ دانش محل امین آباد، لکھنؤ

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی

حکومت اتر پردیش، لکھنؤ

کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

فہرست

تاثرات

فرقہ وارانہ سیاست نے اردو کے چہرے کو چاہے کتنا ہی مسخ کر ڈالا ہو، مگر اس حقیقت سے نہ اہل علم و دانش نے کبھی انکار کیا ہے اور نہ کر سکتے ہیں کہ اردو ایک مشترک ترکہ ہے جس میں ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے ادبی کارنامے شامل ہیں اور یہ اس قدر وقیع اور اہم ہیں کہ اگر کسی کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا جائے تو اردو شعر و ادب میں اتنی بڑی خلاء پیدا ہوگی جس کو پُر کرنا مشکل ہوگا۔ اردو کے ادبی افق پر غیر مسلم شعراء اور ادباء کی تخلیقات کی جوزریں کہکشاں روشن اور تابناک ہے ان میں دیا شنکر نسیم، برج نرائن چکبست، ترلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق، کرشن چندر، آنند نرائن ملا، راجندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے کارنامے اتنے وقیع اور گرانقدر ہیں جن کو بے دخل کر کے ہم اردو شعر و ادب کی کوئی سچی اور غیر مسخ شدہ تصویر دنیا کے سامنے نہیں پیش کر سکتے۔ ہمارے انہیں قلمکاروں میں جن کی ادبی تخلیقات کے باعث اردو کا سیکولر کردار قائم ہے، معروف شاعر، نثر نگار، ڈرامہ نویس اور صحافی جناب دوارکا پرشاد افق لکھنوی کا بھی نام نامی اور اسم گرامی شامل ہے جن کے اسلاف میں منشی اودے راج مطلع، منشی ایشوری پرشاد شعاعی، منشی پورن چند ذرہ اور معاصرین و اخلاف میں منشی رام سہائے تمنا، منشی ماتا پرشاد نیساں، منشی وشویشور پرشاد منور، منشی بشن پرشاد مقدر، گوپال موہن رازداں اور چندر موہن جاویداں، جیسے صاحبان شعر و ادب میں شامل رہے ہیں۔

نوبستہ لکھنؤ کے اس ادبی خاندان کے تخلیقی کارنامے جو رفتہ رفتہ اردو کے عام قاری کی نگاہ میں طاق نسیاں کی زینت بنتے چلے جا رہے تھے اور جن کے چہرے ماضی کے گرد و غبار میں اٹ رہے تھے ان کو پھر ایک بار ان کے ادبی سیاق و سباق میں ڈاکٹر کومل بھٹنا گر نے زندگی عطا کی ہے یوں تو ان کی زیر نظر کتاب کا محور منشی دوارکا پرشاد اور ان کی نثری اور شعری تخلیقات ہیں، مگر اس حوالے سے انہوں نے اردو کی کلاسیکل شاعری اور دبستان لکھنؤ کے امتیازات کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور انہیں کے پس منظر میں افق کے اکتسابات کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔ یہ سارا جائزہ نہ صرف بھرپور ہے بلکہ مصنفہ کی ژرف نگاہی اور ایک بیٹی اور تنقیدی بصیرت کا غماز ہونے کے ساتھ ساتھ اس عالمانہ بصیرت

کی بھی نشاندہی کرتا ہے جو ایک محقق اور سنجیدہ اہل قلم میں لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر کومل بھٹناگر نے اس بات کی صحیح نشاندہی کی ہے کہ افق کے کلام میں ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی وراثت کی پوری طرح نمائندگی ہوتی ہے اور انکے اظہار میں مادر وطن کے لئے تعمیری جذبات اور ترقی کے تصورات کی ایک موج نشیں ہے جو جابجا ان کے کلام میں موجزن نظر آتی ہے۔ افق نے اپنے افکار وخیالات کی شمعیں ایک ایسے دور میں فروزاں کیں جب ہمارا ملک غلام تھا۔ مگر انسانیت کی وہ اعلی وارفع قدریں جو رنگ ونسل کے امتیازات کو مٹاتی ہیں اور بصائر وتاملات کے وہ پہلو جن کو مہذب دنیا نے تاریخ کے ہر دور میں پسند کیا ہے وہ جابجا افق کے کلام میں موجود ہیں اور ان کی نشاندہی کر کے ڈاکٹر کومل بھٹناگر نے اس آفاقی پیغام کو واضح کیا ہے جو ہر دور میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر کومل بھٹناگر ہدیہ تبریک کی مستحق ہیں کہ انہوں نے افق کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا اور ان محاسن کی نشاندہی کی جو افق کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تلاش وتحقیق اور جستجو وآرزو کی کوئی منزل منزل آخر نہیں ہوتی۔ نئی نئی معلومات اگر ایک طرف پرانے مسلمات کو رد کرتی ہیں تو دوسری طرف ان کی تائید وتوثیق بھی کرتی ہیں ممکن ہے ان کی اشاعت افق کے امتیازات میں مزید اضافے کرے اور اردو شعر وادب کی سمت ورفتار کے تعین میں مفید ثابت ہو۔ مگر یہ بات بلاخوف تردد تمام تر ادبی دیانت داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں افق کی ادبی خدمات کا کوئی بھی جائزہ ڈاکٹر کومل بھٹناگر کی زیر نظر تصنیف کو نظر انداز کر کے نہیں لیا جاسکتا۔ ان کی یہ کتاب افق کی زندگی اور کارناموں پر خشت اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ آنے والے دنوں میں جو بھی کام نوبستہ لکھنؤ کے ادبی خانوادے پر ہوگا، اس مین ڈاکٹر کومل بھٹناگر کی زیر نظر تصنیف بنیادی حیثیت رکھے گی۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ ڈاکٹر کومل بھٹناگر مستقبل میں اور بھی کارہائے نمایاں انجام دیں گی اور نوبستہ لکھنؤ کے ادبی خاندان کے دیگر افراد کو جنہوں نے اپنے خون جگر سے اردو شعر وادب کو سینچا ہے اور اس کے غیر مذہبی کردار کو آگے بڑھایا ہے ان کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنائیں گی۔ اور خوب سے خوب تر کی جانب اپنا ادبی سفر جاری رکھیں گی۔

(ملک زادہ منظور احمد)

پیش لفظ

ملک الشعراء دوارکا پرشاد ''افق'' لکھنوی لکھنؤ کے ایک ادبی خاندان کے ممتاز رکن تھے۔ علم وادب کی دولت انہیں اپنے پردادا اودے راج ''مطلع'' دادا ایشوری پرشاد ''شعاعی'' اور والد محترم پورن چند ''ذرہ'' سے وراثت میں ملی تھی۔ اس وجہ سے ان کی حیثیت دبستان لکھنؤ میں اہم مقام رکھتی ہے۔ افق نے اردو شعروسخن کی سبھی اصناف غزل، مسدس، مثنوی، رباعی، قصیدہ تاریخ وغیرہ پر سخنوری کی ہے۔ افق کو نثر نگاری میں بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔ افق نہ صرف قادر الکلام شاعر اور اعلیٰ درجہ کے نثر نگار تھے بلکہ اس کے علاوہ وہ ایک مشہور ڈرامہ نگار، ناول نگار، مترجم اور اعلیٰ مرتبہ کے صحافی اور مدیر بھی تھے۔ افق کی ادبی خدمات تقریباً بتیس سال پر محیط ہیں۔ اس کتاب میں افق کی اس طویل عرصہ کی ادبی زندگی کی خدمات کو پیش کیا گیا ہے اور اس کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ اردو میں ان کے صحیح مقام کا اندازہ لگایا جا سکے۔

افق فطری طور پر خوش طبع شاعر تھے۔ ان کی شاعری پرانے اور نئے دور کی اردو شاعری کو جوڑنے والی ایک اہم کڑی کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اردو کلاسیکل ادب کو جدید تصورات سے مزین کر کے پیش کیا جو یقیناً ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اردو کلاسیکل ادب کی زبان و بیان کی ساری نزاکتیں جلوہ گر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری نشاۃ ثانیہ کے دور کے جدید ادبی تصورات واحساسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے حب الوطنی، اخلاقیات، سماجی ترقی، سیاسی بیداری اور فطرت کے نئے موضوعات اور ایک نئے اسلوب کی شاعری کے لئے اچھی زمین تیار کی ہے۔

افق کی تخلیقات کا مقصد ادب برائے زندگی تھا۔ ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی وراثت کی پوری طرح سے نمائندگی اور اظہار اس کے فخر کی جلوہ گری اور مادر وطن کے لئے تعمیری جذبات اور ترقی کے تصورات ہی ان کی شاعری کے اصل موضوعات ہیں۔ کثیر المذہبی احترام، مذہبی رواداری، قومی یکجہتی اور قومی شیرازہ بندی جیسے ملک اور قوم کے لئے نہایت

اہمیت کے حامل موضوعات پر انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جو پیغام دیئے وہ آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی آج سے ایک صدی پہلے۔

افق نے اپنی شاعری میں ہندی الفاظ، تشبیہات، استعارات اور تراکیب کا استعمال انتہائی فنی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے ہندی کے لفظوں کو ان کے ہی معنوں میں اور ان کی روایتوں کے ساتھ اردو میں استعمال کیا ہے۔ اس طرح اردو اور ہندی کی سرحدیں ملانے کا کام جس کی آج ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، افق اس کی پہل آج سے تقریباً سوا سو سال پہلے ہی کامیابی کے ساتھ کر چکے تھے۔

افق کی شاعری اور ان کی نثری خدمات کے بارے میں ان کی وفات کے بعد یادگار افق کے نام سے رام نراین مشتاق کی تصنیف شائع ہوئی۔ اور ۱۹۶۴ء میں افق کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر افق کے بیٹے نامور شاعر وشویشور پرشاد منور لکھنوی نے ایک کتاب لمعات افق ایڈٹ کی جو گوپی ناتھ امن کی زیر ادارت افق سینٹی نری کمیٹی دہلی نے شائع کی۔ افق کی تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں پھر بھی ان کا کچھ کلام ایسا ہے جو قلمی نسخوں کی شکل میں میرے چچا منور لکھنوی اور میرے والد بشن پرشاد "مقدر" لکھنوی کے پاس محفوظ رہا اور جس کا مطالعہ کرنے کا موقع مجھے ملا۔

راقم نے اپنی کاوش کے مطابق افق کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے جب کہ بہت سی چیزیں ابھی تشنہ ہیں جن پر تحقیق کر کے ایک نیا "افق" دریافت کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت میں جن کرم فرماؤں نے کسی نہ کسی شکل میں دلچسپی لی ہے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی اور مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ خاص طور سے میں جناب ڈاکٹر نسیم الدین ندوی کی ممنون ہوں جن کی رہنمائی اور مشوروں کے بغیر یہ کتاب موجودہ شکل اختیار نہ کرتی۔

کومل بھٹناگر
C2001/28 اندرا نگر، لکھنؤ
فون: ۲۳۴۰۹۷۰

نو بستہ لکھنؤ کا ایک ادبی خاندان
منشی جگناتھ
منشی بنسی دھر
منشی مہانند
منشی اودے راج ''مطلع'' (فارسی اور اردو شاعر)
منشی ایشوری پرشاد ''شعاعی'' (فارسی، اردو شاعر اور نثر نگار)
منشی پورن چند ''ذرہ'' (فارسی، اردو شاعر اور نثر نگار)
منشی رام سہائے ''تمنا''
(اردو اور فارسی شاعر ۱۹۳۲-۱۸۵۴ء)
منشی ماتا پرشاد ''نیساں''
(اردو شاعر ۱۸۶۰ء)
منشی دوارکا پرشاد ''افق''
(اردو، فارسی شاعر نثر نگار اور صحافی)
(۱۹۱۳-۱۸۶۴ء)
رام شنکر پرشاد
وشویشور پرشاد ''منور''
(اردو شاعر ۱۹۷۰-۱۸۹۷ء)
بشن پرشاد ''مقدر''
(اردو شاعر ۱۹۶۴-۱۹۰۰ء)
جانکی پرشاد
چندر موہن ''جاویداں''
گوپال موہن ''رازداں''

افق کا خاندان

انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب کے ذریعہ نشاۃ ثانیہ کا پیغام دینے والے اور اردو شاعری کو نئی جہت اور آہنگ دینے والے اہم ادباء اور شعراء میں ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد ''افق'' لکھنوی کا ایک اہم مقام ہے۔ افق کی ولادت ۱۳ر جولائی ۱۸۶۴ء (وکرم سموت 1921) کو ماہ اساڑھ کی شکل پکچھ کی پانچویں تاریخ کو لکھنؤ کے محلّہ نوبستہ کے ایک مشہور ادبی خاندان میں ہوئی۔ ان کے آباواجداد دلّی کے باشندے تھے اور مغل بادشاہ محمد شاہ کی سلطنت میں اچھے عہدوں پر تھے۔ بادشاہ کے وفاداروں میں ہونے کی وجہ سے نادرشاہ کے حملہ (۱۷۳۹ء) اور اس کے ساتھ ہوئے قتل وغارت میں اس خاندان کے بھی کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ صرف دو نوجوان اس قہر سے بچ نکلے اور ان دونوں بھائیوں نے لکھنؤ کے محلّہ نوبستہ میں سکونت اختیار کر لی۔

لکھنؤ میں ان دونوں بھائیوں نے کئی موقعوں پر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ کہتے ہیں کہ قدم رسول میں رہنے والے نواب نے ان بھائیوں کی بہادری سے خوش ہو کر انھیں نوبستہ میں بڑی زمین اور جائیداد کا مالک بنا دیا۔ ان بھائیوں میں سے ایک کا نام جگناتھ تھا۔ شری جگناتھ کے نوبستہ کے مکان میں ان کا خاندان پھلا پھولا اور آج بھی ان کی دسویں پیڑی کی آل واولاد وہاں سکونت پذیر ہیں۔

ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد ''افق'' شری جگناتھ کی ساتویں پیڑھی کے چشم و چراغ تھے جو اردو ادب کے آسمان پر ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح روشن ہیں۔ ''افق'' سے پہلے بھی ان کے خاندان میں کئی نامی گرامی ادباء اور شعراء ہوئے جنھوں نے فارسی اور اردو ادب کی دنیا میں اپنی خدمات سے شہرت حاصل کی اور اپنے زمانے کی ادبی دنیا کی سرگرمیوں پر اپنی چھاپ چھوڑی۔

افق کے خاندان میں کئی پیڑھیوں سے فارسی اور اردو شاعری اور نثر نگاری کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ افق کے پردادا، دادا، والد صاحب اور ان کے دونوں بڑے بھائی فارسی اور اردو کے جانے مانے شاعر اور نثر نگار تھے، جن کا شمار اپنے زمانے کے بڑے ادیبوں اور مقبول شاعروں میں ہوتا تھا۔ افق کے پردادا منشی ادے راج ''مطلع''، دادا منشی ایشوری پرشاد ''شعاعی'' فارسی اور اردو کے مایہ ناز شاعر اور نثر نگار تھے۔ افق کے والد محترم منشی پورن چند ''ذرہ'' بھی اردو کے اچھے شاعر اور بہترین نثر نگار تھے۔ ذرّہ صاحب نے ۱۸۷۵ء میں نوبستہ لکھنؤ میں ایک اردو پریس بھی قائم کیا جس سے ہفت روزہ اخبار ''تمنائی'' نکلتا تھا۔ ''افق'' (۱۸۶۴-۱۹۱۳ء) منشی پورن چند ذرہ کے تین صاحبزادوں میں سب سے چھوٹے لیکن سب سے زیادہ باصلاحیت تھے۔ ''افق'' کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا (۱۸۵۴ء-۱۹۳۲ء) بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ اردو شاعری اور نثر میں ان کی تمام تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ افق کے منجھلے بھائی منشی ماتا پرشاد نیساں کی بھی اردو نظم اور نثر میں کئی تصانیف ہیں۔ لیکن لکھنؤ کے اس ادبی خاندان کے سب سے باصلاحیت قادر الکلام اور پرگو شاعر اور عظیم نثر نگار افق لکھنوی ہی ہیں۔

افق کے اپنے گھرانے کا ماحول تو خالص ادبی تھا ہی، ادب کی محبت اور لگاؤ ان کو اپنے ننیہال کی طرف سے بھی ملا تھی جو دو آتشہ کا کام کر گیا اور افق کو عظیم ادیب اور ممتاز شاعر بنا گیا۔ منشی شنکر دیال فرحت (۱۸۳۰ء-۱۸۹۰ء) جو لکھنؤ کے ناسخ اسکول کی شاعری کے نمائندہ شاعر تھے اور جن کا شاہکار اردو رامائن منظوم ہے، افق کے سگے ماموں تھے۔ فرحت صاحب ہی افق کے استاد تھے اور ان کی نگرانی میں ہی افق کی ادبی صلاحیت پروان چڑھی۔

فرحت صاحب فارسی ہندی اور انگریزی زبانوں میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت کامل حاصل تھی۔ لفظوں کے استعمال اور ان میں معنی آفرینی ان کا خاص فن ہے۔ فرحت صاحب کے کلام کے کچھ نمونے پیش کرنا مناسب ہوگا۔ ان کی ایک غزل کا مطلع دیکھئے:

قصہ ہجر بتاں ہوش میں آلوں تو کہوں
تھام لوں، ضبط کروں، دل کو سنبھالوں تو کہوں

فرحتؔ کی اردو رامائن منظوم کے کچھ اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کئے جانے ضروری ہیں، جس سے ان کی زبان و بیان پر قدرت اور منظر نگاری کے فن کا اندازہ لگایا جا سکے۔ دیکھئے سیتا سوئمبر کے موقع پر شری رام چندر کے دھنش توڑنے پر جو منظر ابھرا اس کی تصویر کشی شاعر نے کس خوبصورت انداز میں کی ہے:

دھنش کو توڑ کر پھینکا زمیں پر
اندھیرا چھا گیا عرش بریں پر
ہوا آثارِ محشر مچ گیا شور
چھپے گوشوں میں مرغ و ماہی و مور
پرندوں کے اڑے ہاتھوں کے طوطے
یکا یک چونک اٹھے دریا کے سوتے

یہ ایک باکمال استاد کی تعلیم کا ہی اثر تھا کہ افقؔ لکھنوی بھی محض ۲۰ سال کی عمر میں اپنی بے مثال رامائن منظوم ''رامائن یک قافیہ'' منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوئے۔

خاندان کے خالص ادبی ماحول اور استاد کی دل سے دی گئی تعلیم نے افقؔ کی شاعری اور نثر نگاری میں نکھار لانے میں یقیناً اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، افقؔ کے آباء و اجداد فارسی اور اردو کے اہم شاعر اور نثر نگار تھے اور افق کو ادب کی صلاحیت وراثت میں ملی تھی۔ اس لئے نمونے کے طور پر افق کے پردادا، دادا، والد محترم اور دونوں بڑے بھائیوں کی فارسی اور اردو کی شاعری پر روشنی ڈالنا اور ان کی ادبی خدمات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس ترتیب میں سب سے پہلے افق کے پردادا منشی ادے راج مطلعؔ کا نام آتا ہے۔

منشی ادے راج مطلعؔ

منشی ادے راج مطلعؔ اپنے زمانے کے عربی اور فارسی کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ ان کا زمانہ اردو کے عظیم شاعر میر تقی میرؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کے کچھ بعد کا ہے۔ مطلعؔ

کی فارسی زبان کی حسب ذیل غزل کے پڑھنے سے یہ اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو فارسی زبان وادب پر کتنا عبور حاصل تھا۔ مثال کے طور پر اس غزل کے کچھ شعر قارئین کی نظر کئے جاتے ہیں:

دود بر آتشِ رخسار عیاں می بینم
برق بیتاب دریں ابر نہاں می بینم

(اس تابناک چہرہ کی آگ پر میں دھواں دیکھتا ہوں یعنی اس چھپے ہوئے بادل کے اندر ایک تڑپتی ہوئی بجلی کو دیکھتا ہوں)

ہم چناں یاس زدہ پیک نظر می آید
حاجت حسن تو با تیر و کماں می بینم

(تیری نظر کا پیغام ناامیدی و یاس سے بھرا ہوا ہے ہم تیرے حسن کے لئے تیر کمان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔)

اثر از آہِ دل غمزدگاں خواہد بود
آسمان را کہ پر از آہ و فغاں می بینم

(غمزدہ لوگوں کی آہوں کا اثر ہوگا جو میں آسمان کو آہ وفغاں سے بھرا دیکھتا ہوں۔)

اے شہنشاہِ سر لطف تو کہ جاں در بدنست
مختصر ایں کہ ترا جان جہاں می بینم

(اے شہنشاہ تیرے کرم سے ہی میری جان میرے جسم میں ہے۔ مختصر یہ کہ میں تجھے ہی دنیا کی جان دیکھتا ہوں۔)

ظاہر ہے کہ مطّلع کے کلام میں فصاحت بھی ہے، بلاغت بھی ہے اور ان کا انداز نگارش بھی دلپذیر ہے۔ اس غزل کے ہر شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مطّلع کے پہلو میں ایک خدا پرست دل تھا اور ان کا یہی جذبہ ان کی آئندہ نسل میں منتقل ہو کر روز بروز پروان چڑھتا رہا۔

منشی ایشوری پرشاد شعاؔعی

افقؔ کے دادا منشی ایشوری پرشاد شعاعی منشی ادے راج مطلعؔ کے تیسرے بیٹے تھے۔ شعاؔعی فارسی اور اردو کے مقبول شاعر اور ایک بڑے نثر نگار تھے۔ شعاؔعی کی شاعری میں حب الٰہی اور رازِ حقیقت کے جذبات ابھر کر سامنے آتے ہیں اور ان میں معرفت حقیقت کے خیالات کو اولیت حاصل ہے۔ فارسی زبان میں لکھی ہوئی ان کی اس غزل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری اعلیٰ شعریت کے زیور سے آراستہ ہوتی تھی جس میں حقیقت اور معرفت کے اسرار ورموز جلوہ گر ہیں:

نہ عاقل گفتہ باید ہر کسے را
بود عاقل کہ جوی آئی تو باشد
(ہر شخص کو عقلمند نہیں کہنا چاہئے۔ عقلمند وہی ہے جو تیری تلاش کرتا ہو۔)

بہر کوچہ بود شورِ ز عشقت
بہر بازار سودائے تو باشد
(تیرے عشق کا ہر گلی میں شور ہے۔ ہر بازار میں تیرے ہی چاہنے والے ہیں۔)

دل و دیں قیمت عشق تو آمد
جنوں جن سے ز سودائے تو باشد
(تیرے عشق کی قیمت دل اور ایمان ہے اور تیرے سودے کی قیمت دیوانگی (جنوں) ہے۔)

جہاں در خواہش دنیائے دوں است
شعاعی را تمنای تو باشد
(دنیا والوں کو ایک دوسری دنیا کی خواہش ہے۔ شعاعی کو صرف تجھے ہی حاصل کرنے کی تمنا ہے۔)

شعاعی نے ایک غزل اپنے استاد منشی خوب چند صوفی کی تعریف میں بھی کہی تھی۔ اس غزل کا مطلع ہے:

از کلکِ تو صد گونہ نگارست سخن را
کج ابرِ سیاہ فام بہارست چمن را

یعنی جس طرح سے کالے بادلوں سے چمن میں بہار آجاتی ہے اسی طرح ہمارے شاعر کے قلم سے شاعری کی رونق ہوتی ہے۔ کلک (قلم) کی سیاہی کی کالے بادلوں سے تشبیہ دے کر شاعر نے نئے معانی اور مفاہیم پیدا کئے ہیں۔ شعاعؔ صاحب نے اودھ کے بادشاہ محمد علی شاہ کی شان میں کئی قصیدے بھی فارسی میں لکھے ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب دلی میں مرزا غالب کی شاعری اپنے عروج پر تھی۔

شعاعؔ کے فارسی زبان میں لکھے خطوط کا ایک مجموعہ "رقعات شعاعؔ" ہے جو ایک ہزار صفحات کی کتاب ہے۔ یہ ایک قلمی نسخہ جو شعاعؔ کے چھوٹے بیٹے منشی رگھونندن پرشاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ "رقعات شعاعؔ" کا مطالعہ کرنے سے اس زمانے کے لکھنؤ کی تہذیب اور تمدن کی معلومات آسانی سے ہوجاتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نہایت اچھے تعلقات اور اودھ کی گنگا جمنی تہذیب پر بھی اس کتاب سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ شعاعؔ صاحب کے اودھ کے بادشاہ محمد علی شاہ کی شان میں کہے گئے قصیدے بھی "رقعات شعاعؔ" میں شامل ہیں۔

شعاعؔ صاحب نے ایک کتاب خوشخطی پر بھی لکھی جو نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

منشی پورن چند ذرہ

افقؔ کے والد محترم منشی پورن چند ذرہؔ زمانے شاہی میں رائے صاحب چکلا دار بیسواڑہ کے علاقاجات کے منتظم تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں محکمہ نہر آگرہ کے سرشتہ دار تھے۔ ذرہ صاحب بھی اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو نثر میں بھی لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ ذرہ صاحب کی یادگار میں ایک مطبوعہ نسخہ اودھ سماچار ہے جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اودھ سماچار دراصل اودھ کی حکومت کی ایک مختصر منظوم تاریخ ہے جو مہاراجہ اِچھواک کے ذکر سے شروع ہوکر نواب واجد علی شاہ کی حکومت پر ختم ہوتی ہے۔ ذرہ

صاحب کو تاریخ وفات اور تاریخ ولادت قطعات میں کہنے کی مہارت تھی جس میں شعریت بھی برقرار رہتی تھی، پڑھنے والا محظوظ بھی ہوتا تھا اور تاریخ بھی معلوم کر لیتا تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک تاریخ فارسی زبان میں ملتی ہے جو محمدی بیگم صاحبہ بنت نواب منور الدولہ کی وفات پر کہی گئی تھی۔ یہ تاریخ ''گل کدۂ سخن'' بابت ۲۴ر دسمبر ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذرہ صاحب نے ۱۸۷۵ء میں نوبستہ لکھنؤ میں ایک اردو پریس بھی قائم کیا جس سے ہفت روزہ اخبار ''تمنائی'' نکلتا تھا۔ یہ اخبار ایک عرصہ تک ذرہ صاحب کے بڑے صاحبزادہ منشی رام سہائے تمنا کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اسی مطبع سے ایک اخبار 'مہر ظرافت' ۲۰ر ستمبر ۱۸۸۴ء سے اور ایک گلدستہ شعر موسوم بہ ''گلدستہ سخن'' ۲۴ر جولائی ۱۸۹۴ء سے شائع ہوتا رہا۔ ذرہ صاحب ۱۹ر جولائی ۱۹۰۰ء کو راہی ملک بقاء ہوئے۔ ان کے بیٹے منشی رام سہائے تمنا نے انکی وفات پر ایک نوحہ کہا جس کے آخری شعر سے ذرہ صاحب کی تاریخ وفات نکلتی ہے:

اے تمنا سال تاریخ وفاتش کن رقم
منشی پورن چند صاحب رفت ازیں دار فنا
(۱۹۰۰ء)

منشی رام سہائے تمنا

افقؔ کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا کی ولادت ۱۸۵۴ء میں ہوئی۔ وہ بھی منشی شنکر دیال فرحت کے شاگرد تھے اور اردو اور فارسی کے جانے مانے شاعر تھے۔ تمنا صاحب کی بہت سی تصانیف اردو اور فارسی میں ہیں۔ ان کی اہم تصنیفات میں ملک اودھ کی تاریخ 'احسن التواریخ' (نومبر ۱۸۷۶ء میں شائع) اشرف التواریخ، اور افضل التواریخ ہیں۔ کچھ اور اہم تصانیف قیصر سبھا، زیور حیات، کیمیائے دولت، نظم ہر دلعزیز، آئینہ معلومات وغیرہ بھی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تمنا صاحب ایک عرصہ تک محکمہ تعلیمات میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس رہے۔ ان کو کئی ریاستوں جیسے ریاست دکن، نیپال، بھوپال، رامپور، بڑوانی، الور، کٹک، میسور، بلرامپور، بھاولپور وغیرہ سے اعزازات سے نوازا گیا۔ نواب واجد علی صاحب کے داماد نواب

عظمت الدولہ نے ان کی کتاب احسن التواریخ پر انہیں خاص طور سے اعزاز سے نوازا۔ نواب امیر محل صاحبہ سے ۱۸۸۷ء میں اور نظام دکن سے بھی انہیں اعزازات ملے۔

تمنّا نے ایک لمبے عرصہ تک اودھ اخبار کے لئے مضامین لکھے اور ۱۹۱۱ء میں اپنا رسالہ ''دربار'' نکالا۔ تمنّا نے کئی رامائن مسدس کی صنف میں لکھیں دوسرے موضوعات پر بھی ان کے مسدس مشہور ہوئے۔ ان کی کچھ مثنویاں جیسے رام لیلا، سیتا پر تیاگ، ملک گہر، وغیرہ ان کی حیات میں ہی مشہور ہو چکی تھیں۔ نولکشور پریس لکھنؤ کے لئے انہوں نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ کیا اور بھگوت گیتا کا ان کا ترجمہ بھی نولکشور پریس سے شائع ہوا ہے۔

تمنّا صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ''چمنستان تمنّا'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ رائے دیوی پرشاد بشاش نے تمنّا صاحب اور ان کی شاعری کا ذکر اپنی مشہور کتاب تذکرۃ الشعرائے ہنود میں بہت ہی اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ شری گنپت سہائے شریواستو نے بھی انکے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے۔ ان کی رباعی پیش ہے۔

خزاں آتے ہی پھیکا رنگ ہے گلشن کا محفل کا
چمن کا، سرو کا، شمشاد کا، گل کا، عنادل کا
بقا اصلا نہیں، احوال سب کا ہے حباب سا
صدف کا، موج کا، غوّاص کا، دریا کا، ساحل کا

تمنّا صاحب تصوف کے ہمہ اوست کے فلسفہ کو ماننے والے تھے۔ وہ حق کو ایک سمجھتے ہیں اور اسی کی تجلی ہر شے میں دیکھتے ہیں۔ فلسفۂ ہمہ اوست کے متعلق ان کا یہ شعر دیکھئے:

نہاں ہے نظروں سے موجود ہو کے ہر شے میں
پسند یار کو بھی رسم پردہ داری ہے

تمنّا صاحب کی معرفت حقیقی کی ایک غزل ان کے زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔ انہوں نے خدا کا وجود ہر شے میں دیکھا اور اس کا بیان کرتے ہوئے وہ خدا سے کہتے ہیں:

خدا وند جہاں تو ہے، کہوں کیا میں کہاں تو ہے
اِدھر تو ہے، اُدھر تو ہے، یہاں تو ہے، وہاں تو ہے

ہے بلبل تو، گل ِتر تو، چمن تو، بوستاں تو ہے
بہار باغ تو ہے بوئے گل تو، باغباں تو ہے
جگر تو، سینہ تو ہے، قلب تو ہے، جسم و جاں تو ہے
نظر تو ہے، بشر تو ہے، دہاں تو ہے، زباں تو ہے
مکیں تو ہے مکاں تو ہے، زمیں تو، آسماں تو ہے
سید جن و انساں، مالک کون و مکاں تو ہے
دوا تو ہے، اثر تو ہے، طبیب نکتہ داں تو ہے
شفا بخشے مریضاں چارہ ساز ناتواں تو ہے
زباں پر گفتگو تقریر میں حسن بیاں تو ہے
بیاں میں ہے اثر ، تحریر کو کلک رواں تو ہے
ہے تو دائم ، ہے تو قائم، نشاں تو بے نشاں تو ہے
اجل تو ہے، ابد تو ہے، عیاں تو ہے، نہاں تو ہے
فلک پر مہر و ماہ تو، ابر تو، برق تپاں تو ہے
ہے تو ہی تیزیئے آتش، ہے شعلہ تو، دھواں تو ہے
حسینوں میں نزاکت، حسن کا اعلیٰ نشاں تو ہے
زبان عاشقاں پر نالۂ دردِ فغاں تو ہے
مددگارِ معین کودک و پیر و جواں تو ہے
تمنا کا بھی سچا دستگیر و مہرباں تو ہے

تمنا صاحب نے فارسی شاعری میں بھی کافی کمال حاصل کیا تھا۔ ان کی فارسی غزل کا ایک شعر نمونہ کے لئے پیش ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انہیں فارسی زبان پر کتنا عبور حاصل تھا:

ہادی راہ شریعت یاز دنیادار باش
آنچہ باشی باش، لیکن عاشق دلدار باش

(چاہے تو شریعت کا راستہ کا دکھانے والا ہو یا چاہے تو دنیا دار ہو، تو جو چاہے ہو جا،

لیکن خدا کا عاشق ضرور ہو۔)

تمناؔ صاحب کو اپنے والد ذرہؔ صاحب کی طرح تاریخ لکھنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے سلسلہ میں ہوئے دہلی دربار کی تاریخ تمناؔ صاحب نے فارسی زبان میں کہی ہے۔

منشی ماتا پرشاد نیساںؔ

جناب ماتا پرشاد نیساںؔ افقؔ کے منجھلے بھائی تھے جن کی ولادت ۱۸۶۰ء میں ہوئی۔ پہلے نکہتؔ تخلص رکھتے تھے بعد میں نیساںؔ تخلص رکھا۔ شاعری کی طرف فطری رجحان تھا اور امیر اور داغ کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ نیساںؔ نے بھی غزل مسدس، مثنوی وغیرہ اردو شاعری کی سبھی اہم اصناف میں لکھا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کے مشہور فقیر کامل بابا ہزارا کی حیات مثنوی میں لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ نیساںؔ نے رجب علی بیگ کی فسانۂ عجائب کو بھی نظم کیا ہے۔ ان کی کتاب آئینہ عبرت بھی شائع ہوئی۔

نمونہ کے طور پر ان کی غزلوں کے اشعار پیش ہیں۔

وہ بیٹھے میری بغل میں تو منہ چھپائے ہوئے
جھکے ، دبے ہوئے سمٹے ہوئے لجائے ہوئے

☆

چشم بدور اب ہم ایسے زار ہیں
وہ ہمارے طالب دیدار ہیں
دونوں آنکھوں کا ہے اپنے دل میں دھیان
دیکھئے اک گھر میں دو بیمار ہیں

نیساںؔ کی کچھ غزلیں فارسی میں بھی ملتی ہیں۔

حضرت افقؔ کی رفیقۂ حیات

حضرت افقؔ کی شادی ۱۵ سال کی عمر میں ۹ ۱۸۷ء میں ہوئی۔ ان کی رفیقۂ حیات کا نام مہتاب کنور تھا۔ مہتاب کنور مذہبی خیالات کی تھیں۔ اردو شاعری سے شوق رکھتی تھیں اور کبھی کبھی اشعار بھی کہتی تھیں۔ اعلیٰ انسانی قدروں کی جگہ کام، کرودھ، لوبھ، موہ میں مشغول انسانوں کے بارے میں وہ کہتی ہیں:

سنگ میں رہتے ہیں اے مہتاب سب کے چار چور
جس نے ان سے مترتا کی بس وہی لوٹا گیا

مہتاب کنور کے ایک بھائی منشی جگدمبا پرشاد قیصرؔ بھی شاعر تھے۔ مہتاب کنور کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

کچھ افق کے بارے میں

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے افق منشی پورن چند ذرّہ کے تیسرے فرزند تھے۔ گھر کے شاعرانہ ماحول میں لازم تھا کہ شاعری ان کی گھٹی میں پڑتی اور ویسا ہوا بھی۔ طبیعت کمسنی سے ہی آزاد اور موزوں تھی اور شعر گوئی کا شوق بھی بچپن سے ہی تھا۔ نو سال کی عمر میں پہلا شعر کہا۔ افق بیحد ذہین تھے۔ بچپن میں ہی فارسی اور اردو کے بڑے بڑے شعراء کا کلام حفظ کر لیا تھا۔ بیت بازی سے بہت شوق تھا اور اس میں اکثر اپنے بنائے ہوئے اشعار پڑھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں اپنی حاضر جوابی کے لئے جانے جاتے تھے اور اکثر اپنے استادوں کے سوالوں کے جواب اردو اشعار میں دیتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں ہوئی۔ فارسی، اردو اور ہندی کی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ انگریزی کی تعلیم کو بھی حاصل کی لیکن آزاد طبیعت افق نے اپنی تعلیم کو ڈگریوں سے محدود نہیں کیا۔ ان کے سامنے عربی، فارسی، اردو اور ہندی ادب کا اور باہر کی دنیا میں فطرت کا بیشمار خزانہ بکھرا پڑا تھا جس سے انہیں بہت کچھ سیکھنا تھا۔

کہتے ہیں کہ افق اپنی ملازمت کے سلسلہ میں کسی سے ملاقات کرنے گئے تھے لیکن دوران گفتگو وہاں اپنی شعری صلاحیت اور ذہانت کی ایسی چھاپ چھوڑی کہ رائے صاحب، سپرنٹنڈنٹ محکمۂ جنگلات، ریاست کوٹا بوندی نے اپنی بڑی بیٹی مہتاب کنور کے لئے ان کے گھر شادی کا پیغام بھیج دیا اور ایک بڑے گھرانے کی بیٹی اس ادبی خاندان کی لاڈلی بہو بن کر آ گئی۔ اس وقت افق کی عمر صرف ۱۵ سال تھی۔

افق کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنّا ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس تھے۔ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے افق نے کچھ عرصہ تک محکمہ ایجوکیشن کے ایک دفتر میں ملازمت کی۔ لیکن کسی کے ماتحت ہو کر اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے میں زندگی کے بیش قیمتی سال ضائع کر دینا ان کے جیسے با صلاحیت اور بلند فکر شخص کو راس نہیں آ سکتا تھا۔ کچھ دنوں تک افق نے مشہور انگریزی گرامیرین نیسفیلڈ کے ماتحت بھی کام کیا لیکن وہاں بھی دل نہیں لگا۔ دراصل

ملازمت کی بندشوں کا ان کی آزاد طبیعت اور ادبی رجحان سے کوئی میل تھا ہی نہیں۔

منشی پورن چند ذرہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے تینوں بیٹے تمنا، نیساں اور افق ادبی صلاحیت رکھتے تھے۔ شاید یہی سوچکر انہوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیا اور ۱۸۷۵ء میں ہی محلہ نوبستہ میں اپنا اردو پریس قائم کرلیا۔ اس پریس سے ذرہ صاحب کی نگرانی میں اور تمنا کی ادارت میں ہفت روزہ اخبار ''تمنائی'' نکلنے لگا۔ افق کا اپنے گھر کا پریس تھا گھر سے اخبار نکلتا تھا، انہیں ادب کے ہر میدان میں طبع آزمائی کے مواقع فراہم تھے۔ اسی پریس سے ایک اور اخبار ''مہر ظرافت'' ۱۸۸۴ء سے اور پھر ایک ''گلدستۂ سخن'' ۱۸۹۴ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ ذرہ صاحب نے اپنے سب سے عزیز بیٹے افق کو دفتروں میں ملازمت کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہونے دی گھر کے دوسرے افراد کی بھی صرف یہی تمنا تھی کہ افق کی شعری صلاحیت دن دونی اور رات چوگنی پروان چڑھے۔ افق کی یہ خوش نصیبی تھی کہ ان کے والد محترم کا دست شفقت ان پر کافی عرصہ تک رہا۔ ذرہ صاحب کی وفات ۱۹۰۰ء میں ہوئی جب افق کی عمر ۳۶ برس تھی۔ ذرہ صاحب کی زندگی میں ہی افق نے اپنا مشہور ''نظم'' اخبار بھی ۱۸۸۸ء سے شائع کرنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے گھر سے آئی ان کی شریک حیات مہتاب کنور جلد ہی اس ادبی گھرانے کے شاعرانہ ماحول میں رچ بس گئیں۔ ایک ادیب کی زندگی بسر کرنے والے افق کے پاس بندھی ہوئی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لیکن روپئے کی تنگی بھی گھر میں نہیں تھی۔ بہت سی ریاستوں جیسے ریاست حیدرآباد، بھوپال، رامپور، بڑوانی، الور، جھجر، کٹک، میسور بلرامپور، بھاولپور، کوٹا، ناہن وغیرہ سے انہیں اعزازات سے نوازا گیا تھا، ان کی تمام تصانیف اچھے پریس سے شائع ہوئیں، کئی برس وہ کئی اخباروں کے مدیر رہے، تمام اخبارات اور رسالہ جات میں ان کا کلام اور ان کے مضامین لگاتار چھپتے رہے جس سے انہوں نے روپیوں کی قلت کبھی محسوس نہیں کی۔ ان کی اہلیہ مہتاب کنور نے بھی زندگی کے سفر میں ان کے روپیوں کی بابت کبھی شکایت نہیں کی۔ وہ صحیح معنوں میں افق کی شریک حیات تھیں اور زندگی کے ہر نازک موقع پر انہوں نے ہمت سے افق کا ساتھ دیا۔ چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کی پرورش اور گھر کے دیگر مسائل حل کرنے کی ذمہ داری انہوں نے خوش دل ہوکر نہ اٹھائی ہوتی تو شاید افق صرف ۴۹ سال کی عمر میں اتنا ادبی سرمایہ چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

افق کی یہ بھی خوش بختی تھی کہ کچھ نہایت ادب شناس اور دولتمند بڑے لوگ ان کے قدرداں رہے جنہوں نے وقتاً فوقتاً انکی مالی امداد بھی کی۔ ایسی عظیم شخصیتوں میں نظام حیدر آباد دکن کے مشہور ادیب مہاراجہ گردھاری پرساد باقی اور سنڈیلہ کے مہاراجا درگا پرساد کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ مہاراجا گردھاری پرساد باقی نے افق کو "نظم" اخبار کی اشاعت کے لئے مالی تعاون کیا تھا۔ افق کی بڑی بیٹی دھرم دیوی جو خود بھی شاعرہ تھیں کی شادی کے موقع پر مہاراجا گردھاری پرساد باقی خود لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ زندگی کے آخری چھ مہینوں میں جب افق سخت علالت کے سبب بستر مرگ پر پڑ گئے تو سنڈیلہ کے راجہ درگا پرساد نے ان کی بیماری کا کافی خرچ اٹھایا تھا۔

افق کی شخصیت باغ و بہار تھی۔ خوش مزاجی اور ملنساری ان کی شخصیت کے خاص پہلو تھے۔ جس محفل میں چلے جاتے تھے چھا جاتے تھے۔ انہوں نے نہایت صاف ستھری زندگی جی اور ان کا دل بھی آئینہ کہ طرح صاف تھا۔ وہ صاف دل اور صاف طبیعت کے لوگوں کو ہی پسند کرتے تھے۔

افق ایک خداداد شاعر تھے۔ منشی شنکر دیال فرحت کے شاگرد تھے اپنے استاد کی طرح شاعری میں ناسخ اور وزیر کے پیرو تھے۔ انکی شروعاتی دور کی غزلوں پر امیر اور داغ کی شاعری کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ غزلوں میں زبان، بیان اور تغزل کا لطف بھی ملتا ہے۔ اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق انہوں نے غزلیں کہیں اور ان کی بعض غزلیں اور بعض اشعار اعلٰی شاعری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی جولانیٔ طبع کے لئے غزلوں کا دامن تنگ ہے۔ ادھر اردو شاعری میں آزاد اور حالی کی قیادت میں چلائی گئی نئی تحریک سے بھی افق بیحد متاثر تھے۔ ادیب کی سماجی ذمہ داری بھی ہوتی ہے اور اس کو سماج کے لئے مشعل راہ کا کام بھی کرنا چاہئے، یہ محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنی توجہ غزل کی جگہ نظم گوئی اور ٹھوس ادبی کارناموں کی طرف مبذول کی۔ خاص طور سے انہوں نے مسدس اور مثنوی کو اپنے فن کے اظہار کے لئے میدان چنا۔ افق کی طبیعت کو مسدس سے خاص دلچسپی رہی اور ان کا زور قلم اس صنف میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختلف اور بالکل غیر روایتی موضوعات پر مسدس لکھے اور مسدسوں کے ذریعہ ملک وقوم کی اور سماجی زندگی کی بہبودی کے لئے پیغام

دیئے۔ اپنے قومی، مذہبی، اخلاقی اور دوسری نوعیت کے مسدسوں میں افق نے اپنے بیان کے ثبوت میں ہزاروں تاریخی حوالے دیئے ہیں اور اس طرح موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ انہوں نے اہل ہند کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اور مذہبی اور سماجی یکجہتی کو بڑھاوا دینے کے لئے بہترین مسدس کہے ہیں جن میں کافی زور پایا جاتا ہے۔ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ان کے مسدس ہندوستان کی تاریخی عظمت ''مسدس افق، قومی مسدس'' اور درس عمل زبان اور بیان کے اعتبار سے لاثانی ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کمسنی سے ہی انکا دائرۂ معلومات بیحد وسیع تھا۔ افق نے بزمیہ، منظریہ، رزمیہ اور مذہبی سبھی طرح کی مثنویاں کہی ہیں جو اپنی جگہ بہت کامیاب ہیں۔ ان کی شاعری کی شہرت ۱۸۸۰ء سے جب ان کی عمر صرف ۱۶ برس تھی، ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ۲۰ برس کی عمر میں ہی ان کا ادبی شاہکار راماین منظوم، راماین یک قافیہ، شائع ہو چکی تھی جس میں انہوں نے راماین کی پوری کتھا کو مثنوی کی صنف میں ایک ہی قافیہ میں بیان کیا ہے۔ راماین یک قافیہ میں ۱۳۰۰ اشعار ہیں جو ایک ہی قافیہ میں ہیں۔ ۸۵ صفحات کی اس کتاب کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی اردو ہے۔ اس تصنیف میں ۵۰۰ سے زیادہ محاوروں کا استعمال ہوا ہے جس سے بیان، منظر نگاری اور مکالمہ نگاری بہت پر اثر ہو گئے ہیں۔ سکھوں کے گرو گوبند سنگھ کی سوانح عمری بھی انہوں نے مثنوی کی صنف میں لکھی ہے جو کافی پر اثر اور پر زور ہے اور فنی اعتبار سے اونچے پایہ کی ہے۔ مثنویاں نور جہاں اور پدماوتی میں بھی زبان کی صفائی، روانی، سلاست اور کیفیت سبھی ہیں۔ ان کی منظریہ مثنویاں بیحد پر اثر ہیں اور ان سے شاعرانہ ذوق کی آسودگی کافی حد تک ہوتی ہے۔

کیونکہ افق ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ان میں صلاحیت تھی کہ وہ ہر صنف سخن میں شاعری کر سکیں اس لئے انہوں نے مسدس اور مثنویوں کے علاوہ غزل، قصیدہ، رباعی، نوحہ، تاریخ وغیرہ سبھی اصناف میں اعلیٰ شاعری کی۔ ان کی شاعری میں تشبیہات، استعارات کا دار و مدار تمام تر ہندوستانی ماحول پر ہے۔ افق شاعرانہ خودداری بہت رکھتے تھے اور کبھی اپنے کلام پر کسی کا اعتراض برداشت نہیں کرتے تھے۔ ملک کے تمام ادیبوں نے ان کے زور قلم کا لوہا مانا ہے۔ نظام حیدرآباد، میر محبوب علی خاں نے انہیں ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا اور خلعت اور سروپا دیکر انہیں اعزاز بخشا۔ دیگر ریاستوں سے بھی انہیں اعزازات سے نوازا گیا۔ ایک

وقت تھا جب افقؔ کے کلام کی دھاک شمال سے جنوب تک تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔

افقؔ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر ہی تھے بلکہ ایک فاضل ادیب، صحافی اور اعلیٰ درجہ کے مدیر بھی تھے۔ شعر گوئی کے علاوہ انہیں نثر نگاری میں بھی زبردست ملکہ حاصل تھا۔ مسجع مقفی نثر سے لیکر آسان بول چال کی زبان میں انہوں نے بہترین نثر نگاری کی ہے۔ کیونکہ افقؔ فطری طور پر خوش طبع شاعر ہیں اس لئے کہیں کہیں نثر میں شاعری بھی کرتے ہیں رامائن بالمیکی کا ترجمہ ان کی مسجع مقفیٰ نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ کتاب ۱۱۰۰ صفحات کی ہے۔ مہابھارت کے ترجمہ کی زبان ملی جلی یعنی کلاسیکل اور بول چال کی اردو ہے۔ ۲۰۶۸ صفحات کے 'ٹاڈ راجستھان' کی ۹ جلدوں کی ترجمہ کی زبان وہ ہے جو تاریخ کی کتابوں میں استعمال کی جانی چاہئے۔ ان کی تصنیف 'زلف لیلہ' میں بیگماتی اردو کا لطف ملتا ہے۔ افقؔ کی نثر نگاری کا فن یہ ہے کہ ان کی زبان موقع و محل کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ بحیثیت مدیر وہ الگ قسم کی نثر لکھتے ہیں اور رسالا جات میں انکی نثر موضوع کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ان کو ہر طرح کی نثر لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ افقؔ نے کئی ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں، ناولوں میں کادمبری، عالم تصویر، زلف لیلہ، عشق وفا، اور طلسم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ناول طلسم دیوکی نندن کھتری کی چندر کانتا کے قسم کا ہے۔ ان کے ناولوں میں بعض غزلیں اور گیت اعلیٰ شاعری کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ناول نگاری کے علاوہ افقؔ کو ڈرامہ نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء کے دوران جب افقؔ پنجاب سماچار کے ایڈیٹر تھے، لاہو کے رام ناٹک کلب کی فرمائش پر انہوں نے رامائن کو ڈرامے کی شکل میں منتقل کیا۔ یہ ناٹک بہت مقبول ہوا اور برسوں اسٹیج پر رات رات بھر کھیلا جاتا رہا۔ اس ناٹک کے گیت اور غزلیں خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ اسی کلب کے لئے افقؔ نے کرشن سداما ناٹک بھی لکھا۔ ایک تیسرا ناٹک بھیشم پتامہ بھی وہ لکھ رہے تھے لیکن اسے وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے۔ افقؔ نے الف لیلہ کا ترجمہ اردو نثر و نظم میں کیا ہے جس کی جلدیں نول کشور پریس لکھنؤ میں موجود ہیں۔ یہ ترجمہ کچھ وجوہات سے شائع نہیں ہو سکا۔

افقؔ کا ''نظم'' اخبار جس میں تمام خبریں نظم میں شائع ہوتی تھیں، اپنے ڈھنگ کا

انوکھا واحد اخبار تھا۔ نظم کی اصناف میں کوئی اخبار نکلا ہو اور کئی برس لگا تار شائع ہوتا رہا ہو ایسا اردو ادب میں اشاعت ہوئی ہو تو اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے۔ افق نے اہل ہند کو خطاب کرتے ہوئے ہندوستان اور اپنے وقت کے سماج کی تنزلی کی اصلی وجوہات پہچان کر انکا صحیح حل تجویز کیا۔ انکا کہنا تھا کہ ہماری اپنی خامیاں ہی ہماری غلامی مفلسی اور بدحالی کے لئے ذمہ دار ہیں۔ افق کے سامنے ہندوستان کا ماضی، حال اور مستقبل ایک کھلی کتاب کی طرح تھا، اسی لئے وہ ایسا با مقصد ادب اہل ہند کے سامنے رکھ سکے۔ زمانہ کی ضرورت کے مطابق ادب اور وہ بھی اونچے معیار کا ادب کوئی بڑا ادیب ہی دے سکتا ہے۔ ان کی تخلیقات کا مقصد ادب برائے زندگی رہا۔

افق پنجاب سماچار نظم اخبار، اور دھرم بجیون جیسے اخباروں کے مدیر رہے۔ بھارت پرتاپ اودھ پنچ، زمانہ، شیو شمبھو جیسے مشہور اخبارات میں انکی غزلیں اور مضامین برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ افق کا دورہ انیسویں صدی کا وہ دور تھا جب اس ملک میں انگریزوں کی مخالفت میں سیاسی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی، لالہ لاجپت رائے پنجاب میں، بال گنگادھر تلک مہاراشٹر میں اور وپن چندر پال بنگال میں آزادی کی الکھ جگا رہے تھے۔ حکومت کی مخالفت کے بڑھنے سے خوفزدہ انگریز حکمراں ہندوستانی عوام پر اپنا شکنجہ دن بدن کستے جا رہے تھے۔ عیسائی مشنریوں کی کارکردگیوں کو لگا تار بڑھاوا مل رہا تھا۔ ادھر اپنے ملک میں ایک طبقہ تو تھا ہی جو اپنے مفاد کیلئے انگریزی حکومت کی حمایت کرتا تھا اور یورپ کی تہذیب میں اپنے کو رنگ دینے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اس ماحول میں ملک کے تمام دانشور اور مصلح خوفزدہ ہو گئے تھے کہ تہذیب و تمدن میں سب سے اعلیٰ یہ ملک کہیں اپنی تہذیب و ثقافت کو بھول کر اپنی پہچان ہی نہ کھو دے۔ اس لئے حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہر قوم اور ہر زبان کے ادباء و شعراء اپنے ادب کے ذریعہ عوامی بیداری کے مقصد میں کوشاں ہو گئے۔ افق نے بھی اس زمانہ میں برطانوی حکومت کی مخالفت میں اپنے مخصوص انداز میں کبھی طنز مزاح کے پردہ میں اور کبھی سیدھے ہی آواز اٹھائی اور اپنی شاعری اور مضامین سے ہندوستانی عوام کو غفلت کی نیند سے جگانے کی کوششیں لگا تار جاری رکھیں۔ انہوں نے اپنے قومی مسدسوں میں نوجوانوں کے لئے یہ پیغام صاف الفاظ میں دیا

ہے ''مٹاؤ جبیں سے نشانِ غلامی''۔ افق ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء کے درمیان اپنے پنجاب کے قیام کے دوران شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے سے بیحد متاثر ہوئے۔ افق ان کے جلسوں میں برابر اپنے کلام پڑھتے تھے۔ اوران کی سیاسی میٹنگوں کے پہلے جو جلوس نکالے جاتے تھے اس میں بھی پرچم اٹھا کر افق آگے آگے چلتے تھے۔ افق نے قدیم آریہ ورت کی تہذیب کو پھر سے زندہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا جس کی بنیاد پر وہ نئے ہندوستان کی تعمیر ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جس طرح درخت کی جڑیں زمین میں جتنی گہری ہوں گی اتنا ہی وہ مخالف ہواؤں سے اپنی حفاظت کر سکے گا اور پھلتا پھولتا رہے گا۔ افق کا مسلک صلح کل تھا اور وہ ہر مذہب کی قدر کرتے تھے جیسا ان کے کلام میں جگہ جگہ پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ افق کی سیاسی تحریکوں نے سویدیشی اشیاء کے پرچار کو تقویت پہونچائی۔ ٹیمپرنس سوسائٹی اور کائستھ کانفرنس میں بھی افق کا بڑا زور تھا اور انہوں نے اپنے زورِ قلم سے ان ملکی اور قومی انجمنوں کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ قومی خدمات کا سہرا برابر آپ کے سر پر باندھا جاتا تھا۔

۱۹۱۳ء کا سال افق کی زندگی اور ان کے خاندان پر قہر بن کر نازل ہوا۔ سال کی ابتداء میں افق کے بڑے بیٹے تفریح اخبار کے ایڈیٹر شری رام شنکر صرف ۲۷ برس کی عمر میں ایک ہی دن کی بیماری میں ۲۰ سال کی بیوہ اور دو چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اچانک چل بسے۔ افق اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے اور کہتے ہیں کہ بیٹے کی آخری رسوم ادا کرنے کے بعد سے جو انہوں نے بستر پکڑا تو وہ ان کا بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ افقؔ نے چھ مہینے کی سخت بیماری جھیلی۔ اس دوران ان کی بینائی بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ بیٹے کے غم میں انہوں نے کہا تھا کہ 'اسی کو نورِ نظر کہتے ہیں'۔ اسی درمیان مصیبت کا ایک اور پہاڑ ان پر ٹوٹا۔ ان کی بڑی بیٹی دھرم دیوی کے شوہر کا بھی عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ افق ان صدموں کی وجہ سے بالکل ٹوٹ گئے۔ بیماری کی حالت میں انہوں نے اپنے عقیدت کے محور (ایشٹ دیوتا) ہنومان رگ کی پرارتھنا میں ایک بیحد دلرس نظم کہی جس میں انہوں نے شری وکرم ہنومان سے گذارش کی کہ ان پر پورے گھر کی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کی ذمہ داری ہے، اس لئے ان کو اپنے فرائض پورے کرنے کے لئے کچھ عرصہ اور زندگی بخش دی جائے۔

لیکن ان کی فریاد قبول نہیں ہوئی اور ان کی حالت بگڑتی گئی۔ جب انہیں یہ الہام ہو

گیا کہ پروردگار کے حکم سے انہیں اب اس جہان فانی کو چھوڑنا ہی پڑے گا اور انہیں دنیا میں اپنے ادھورے کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مہلت نہیں ملے گی تب انہوں نے اپنی شریک حیات مہتاب کنور کو ایک خط لکھ کر دیا جس میں انہوں تفصیل سے لکھا کہ کہاں کہاں پر ان کا پیسہ باقی ہے اور کن کن لوگوں سے انہیں تعاون ہوسکتا ہے تاکہ انہیں افق کے بعد گھر گرہستی کی ذمہ داری سنبھالنے کی پریشانی کچھ حد تک کم ہوسکے۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو ۶ مہینہ کی سخت علالت جھیل کر اردو ادب کے آسمان کا یہ چمکتا ستارہ اپنی آب و تاب دکھا کر دنیا والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا لیکن اپنے پیچھے اپنی آفاقی شاعری کی ایسی ضیا چھوڑ گیا جس سے آج بھی شعر و سخن کی دنیا میں نئے راستوں پر آگے بڑھنے والوں کو روشنی ملتی ہے۔

نظم اور نثر میں افق کی جو تصانیف ملتی ہیں ان میں سے کچھ اہم تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ رامائن یک قافیہ
۲۔ رامائن مسدس میں
۳۔ غزلوں کا مجموعہ
۴۔ تین طویل نظمیں
۵۔ مرقعۂ عمل
۶۔ مرقعۂ اخلاق
۷۔ مرقعۂ خیال
۸۔ شری رام ناٹک
۹۔ کرشن سداما ناٹک
۱۰۔ سناتن دھرم پرکاش
۱۱۔ سوانح عمری گرو گوبند سنگھ (کھنڈ کاویہ)
۱۲۔ یادگار جاوید
۱۳۔ حیات باقی
۱۴۔ نل دمینتی

۱۵۔سنسکرت سنجیونی

اردو نثر کو بھی افق نے کچھ بیش قیمت تحفے دیئے۔ان کی اہم نثری تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱۔آئینۂ قواعد
۲۔قواعد خوشخطی
۳۔عالم تصویر (اورنگ زیب اور راجکماری کی کہانی)
۴۔فتنہ (ناول)
۵۔کادمبری (ناول)
۶۔طلسم (ناول)
۷۔شہزادی (اورنگ زیب اور شیواجی مراٹھا)
۸۔انقلاب (ناول)
۹۔زلف لیلیٰ (دو حصوں میں)

ان تصانیف کے علاوہ افق نے اردو میں کئی کامیاب ترجمہ بھی کئے ہیں جن کے نام اس طرح ہیں:

۱۔رامائن بالمیکی
۲۔مہابھارت
۳۔شریمد بھاگود گیتا
۴۔بھاگوت
۵۔ٹاڈ راجستھان

''عربین نائٹس'' کا ترجمہ بھی افق نے ''الف لیلہ'' کے نام سے کیا جو نول کشور پریس لکھنؤ میں ہے اور جو ابھی شائع نہیں ہو سکا ہے۔

افق نے اپنی شعر و سخن کی اور نثری خدمات سے اردو ادب میں نئی جان پھونکنے والے سرسید، آزاد، اور حالؔی کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کو آگے بڑھانے اور انکے پیغام کو عملی جامہ پہنا کر آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ کا اہم کام انجام دیا۔ان کا جو بھی ادبی سرمایہ نظم یا نثر

میں ہے اعلیٰ درجہ کا ہے۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شاعر یا ادیب مختلف اصناف پر قدرت رکھتا ہو۔ جیسے اگر علامہ حالؔی کی بات کی جائے تو وہ نظم، غزل اور مسدس کے شاعر ہیں مثنویاں یا دیگر اصناف ان کے یہاں نہیں ہیں۔ اسی طرح اردو کے مایہ ناز مثنوی نگار میر حسن کی بات کی جائے تو وہ صرف مثنوی کے شاعر ہیں، اگر کچھ غزلیں ملتی ہیں تو معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ اسی طرح پنڈت دیا شنکر نسیمؔ صرف مثنوی کے شاعر ہیں۔ ان کا جو کچھ کمال فن ہے وہ مثنوی کا محور ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے نثر نگاری کی طرف توجہ نہیں کی۔

افقؔ لکھنوی کی قادر الکلامی ہے کہ انہوں نے شاعری کی ہر صنف میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے اور ان کو مسجع مقفیٰ نثر سے لیکر آسان اور سلیس نثر تک ہر طرح کی نثر نگاری پر ملکہ حاصل تھا۔

افق ایک ایسے قادر الکلام شاعر تھے جن میں صلاحیت تھی کہ وہ ہر صنف سخن میں اعلیٰ درجہ کی سخنوری کر سکیں۔ افقؔ کے مسدسوں کا موازنہ حالؔی اور چکبستؔ کے مسدسوں سے کیا جا سکتا ہے، ان کی مثنویوں کا موازنہ میر حسن، نسیمؔ اور زہر عشق کے مصنف مرزا تصدق شوقؔ لکھنوی کی مثنویوں سے ہوسکتا ہے۔ افقؔ نے صرف بزمیہ ہی نہیں بلکہ رزمیہ، منظریہ اور مذہبی سبھی طرح کی مثنویاں تخلیق کی ہیں۔ یہی چیز ان کو مثنوی کے ان تین بڑے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی مثنویوں کے کردار ہندوستانی تہذیب سے لئے گئے ہیں۔ اور ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ کردار تصوراتی نہیں ہیں۔ گرو گو بند سنگھ، پدماوتی اور نور جہاں جن پر افقؔ نے مثنویاں کہی ہیں، ہندوستان کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی مثنوی رامائن یک قافیہ تو درحقیقت اردو ادب میں درشہوار کی حیثیت رکھتی ہے۔

فطرت کے حوالہ سے اور عام زندگی سے لئے گئے موضوعات پر افقؔ نے بہترین نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں کا موازنہ نظیرؔ کی نظموں سے ہم کرسکتے ہیں۔ نظیر کی طرح ہی افقؔ نے ہندوستان کی کوئل، تتلی، پپیہے، چکور اور بھوروں کا تذکرہ اپنی شاعری میں کیا ہے۔ گیندے، چمیلی، کنول، ٹیسو، سورج مکھی، کیسر اور ببول کے خوبصورت پھولوں کو شاعری میں جگہ دی ہے یہاں کے کھیت کھلیان اور امرائیوں کا دلکش بیان کیا ہے۔ انہوں نے نئے سے

نئے موضوعات پر سخن سنجی کی اور وہ بھی ایسی تشبیہ اور استعارات کے ساتھ جنکا دارومدار تمامتر ہندوستانی ماحول پر ہے۔ان کا شعری سرمایہ مختلف صنف شاعری میں ہے اور ادب کے نقطۂ نظر سے نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔

افق کی نثری خدمات پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ انہیں مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان نثر نگاری پر ملکہ حاصل تھا۔ان کی مسجع، مقفیٰ نثر کا رجب علی بیگ سرور کی نثر سے موازنہ کیا جاسکتا ہے، ان کی آسان اور سلیس نثر کا سرسید، آزاد اور حالی کی نثر سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ان کے ادب کو زبان و بیان اور تخیل کی پرواز کسی بھی زاویہ نظر سے پرکھا جاسکتا ہے۔جب بھی کبھی کوئی مؤرخ یا نقاد موازنہ کرے گا تو اس کو مایوسی نہیں ہوگی۔

افق اردو ادب کے بڑے محسن اور خدمت گذار تھے۔انہوں نے اردو زبان و بیان کے گیسوؤں کو اس طرح سنوارا ہے کہ بجا طور پر اردو ادب کو ناز ہونا چاہئے۔غرض یہ کہ افق نے ادب کو برائے ادب ہی نہیں رہنے دیا بلکہ ادب برائے زندگی مانا اور اپنے کلام میں اس کا ثبوت بھی دیا۔

مشاہیر کی نظر میں حضرت افق کا مقام

ملک الشعراء منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی کی ولادت کا جشن صد سالہ ۱۹۶۴ء میں دہلی، لکھنؤ، بنارس، حیدرآباد، انبالہ میں بہت ہی جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا۔ اس جلسہ کی یادگار میں ایک کتابچہ شائع کیا گیا تھا جس میں ملک کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے پیغامات اور منظومات جو انہوں نے صد سالہ جشن کے سلسلہ میں بھیجے تھے شامل ہیں۔ یہ پیغامات افق کے بیٹے نامی شاعر بشیشور پرساد منور لکھنؤی کے نام تھے۔ فاضل دوراں عالی جناب ڈاکٹر رادھا کرشن، صدر جمہوریہ ہند، جناب ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، نواب مہدی نواب جنگ بہادر گورنر گجرات، جناب ممتاز حسن گورنر نیشنل بینک آف پاکستان، شری ۱۰۸ سوامی چیتنانند مہاپربھو چدا کاشی، جناب مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر مسعود حسن رضوی سابق صدر شعبہ اردو اور فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، جناب خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، جناب پروفیسر احتشام حسین صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، جناب بدرالدین طیب جی وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور شاعر اعظم جوش ملیح آبادی اس مجموعہ کی زینت ہیں۔ حضرت جوش ملسیانی، پروفیسر ترلوک چند محروم، مقبول شاعر جگنات آزاد، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر جاوید وششٹ، غلام احمد فرقت کاکوروی اور دیگر شعرائے کرام نے بھی اپنے نظریے کے مطابق افق لکھنوی کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں قابل قدر مقالے تحریر فرمائے ہیں۔ ان ادیبوں اور شاعروں کے پیغامات کی کچھ جھلکیاں مندرجہ ذیل ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل نظر کی نگاہ میں افق کا کیا مقام تھا۔

جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب

یہ خبر میرے لئے بڑی مسرت کا باعث ہے کہ کچھ فرض شناس اردو دوست منشی دوارکا پرساد افق کا صد سالہ جشن ولادت مرحوم کے شایان شان منانے والے ہیں۔ جناب افق کے

گوناگوں ادبی کارنامے ان کو ہر طرح سے اس اعزاز کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ جناب افق ایک خانوادۂ علم و ادب کے ممتاز رکن تھے۔ انہوں نے شاعری وراثت میں تربیت شعر و ادب کے ماحول میں پائی تھی اور جو صلاحیتیں بزرگوں سے ان کو ورثہ میں ملی تھی ان پر ان کی طبعی ذکاوت اور فطری شعریت نے اور جلا کر دی تھی۔

جناب افق نے مختلف حیثیتوں سے شعر ادب کی بڑی خدمت کی۔ وہ کئی اخباروں کے ایڈیٹر رہے، کئی ناول تصنیف کیئے، کئی مختصر سوانح عمریاں لکھیں، رسالوں میں مضامین شائع کیئے، گیت بنائے، ڈرامے لکھے، اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کیئے اور خاص طور پر شاعری میں شہرت حاصل کی۔ انہوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی۔ وہ تمام اصناف سخن پر قادر تھے اور ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا نظم اخبار جو تقریباً تمام و کمال نظم میں ہوتا تھا ان کی پرگوئی کا شاہد ہے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ مقدار اور معیار دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے۔ جناب افق کے سے ذوحیثیت محسن شعر و ادب کا صد سالہ جشن ولادت منانا حقیقت میں بارگاہ اردو میں خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔

سوامی چیتن آنند چدا کاشی

انگریزی دور حکومت میں جب اردو کا بول بالا تھا حضرت افق کا نام نامی ہر ایک کی زبان پر تھا۔ وہ بھارت ورش کے ان چوٹی کے شاعروں صحافیوں اور فنکاروں میں تھے جن پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے ان کو اردو، فارسی، ہندی پر عبور کامل تھا.......... ملک الشعراء کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ صرف ۴۹ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں انہوں نے ضخیم لٹریچر بہم پہونچایا۔ ناول بھی لکھے، مزاحیہ کالم بھی، اخبار نویسی بھی کی، بالمیکی رامائن اور مہابھارت کا ترجمہ بھی کیا۔ شریمد بھاگوت کو نثر میں لکھا، یک قافیہ رامائن منظوم کر کے کمال دکھایا وغیرہ وغیرہ.......... ملک و قوم جو انسان کے جسم کثیف کہے جاتے ہیں وہیں شاعری اس کا عنصر لطیف بلکہ اس کی روح ہے۔ شاعر ہی ہے جو جسم کی تازگی کو قائم رکھتے ہیں اور فرحت بہم پہونچاتے ہیں، خون ساکت کو روانی دیتے ہیں اور بوڑھے رگ و پے میں جوانی کے نام و نشان کا ابھار۔ جس قوم میں شاعر نہیں وہ قوم مردہ ہے۔ فی زمانہ ایسی لہر چل رہی ہے کہ اردو کو

نظر انداز کیا جارہا ہے اس لئے یہ بہت موزوں تھا ایسے بزرگوں کا نام نامی فراموش نہ ہونے پائے جنہوں نے ادب اور ملک کی خدمت بدرجہ احسن سرانجام دی ہے۔

جناب مولانا عبدالماجد دریابادی (بی۔اے)

افق صاحب کا نام نامی اس وقت پڑھا جب میں اسکول کے ساتویں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ان کی ایک نظم اردو کے کورس میں داخل تھی غالباً ان کا مسدس شہر آشوب تھا۔ ...... پھر جب بڑا ہوا تو اودھ اخبار میں کہ وہی اپنے دور کا سب سے زیادہ سرکردہ اخبار تھا ان کے مضمون پر مضمون دیکھنے میں آئے۔شاعر کا نام بھی جب ہی معلوم ہوا ملک الشعراء کا لقب بھی ان کو نام کے ساتھ پڑھنے میں آیا۔انکے قدرت کلام کا اندازہ بھی اسی وقت ہوا ...... کانستھ اہل قلم برادری کے صف اول میں ایک جوالہ پرساد برق تھے اور دوسرے یہی دوارکا پرساد افق۔

شاعر اعظم جوش ملیح آبادی

میرے فرشتہ سیرت اور اقطاب مزاج بھائی حضرت منور لکھنوی اپنے والد محترم کی صدسالہ سالگرہ منانے جارہے ہیں آپ کے والد محترم تھے، ہمارے مرحوم لکھنؤ کے شاعر اعظم حضرت دوارکا پرساد افق۔ ہر چند افق کو کون نہیں جانتا۔ مطلع شاعری پر آج بھی آپ کا آفتاب دمک رہا ہے اور ہمیشہ دمکتا رہے گا۔ ہر چند افق صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی ۴۹ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔لیکن اس فرصت قلیل اور مہلت گریزاں کے باوجود آپ اردو زبان اور اردو ادب کو وہ عظیم سرمایہ دے گئے ہیں کہ دوسرے ایسا بیش بہا سرمایہ سو برس میں بھی نہیں دے سکتے۔

سید احتشام حسین

ہندوستانی زبانوں میں اردو کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کے پرستاروں اور خدمتگاروں میں اس قدیم ملک کی ہر قوم، ہر فرقے اور ہر طبقے کے باشعور افراد شامل ہیں۔ یہ ایک ایسا فخر ہے جس پر اردو ہمیشہ ناز کرسکتی ہے کیونکہ یہ محض اس کی ہردلعزیزی کا

ثبوت نہیں وسیع المشربی اور ہمہ گیری کی شہادت بھی ہے۔ اس میکدہ عام کے بادہ آشاموں میں منشی دوار کا پرساد افق لکھنوی بھی تھے جو اپنے دور میں ادبی افق کے روشن ستاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان اور ادب کے کئی گوشوں کو منور کیا اور شعر و ادب کے ذریعہ ان تہذیبی قدروں کی ترجمانی بھی کی جس کے روشن پہلوؤں کے وہ رازداں تھے۔ یوں تو انہوں ناول، ڈرامے، تاریخ اور داستان ہر صنف کو اپنی قوت تخلیق کا کچھ حصہ دیا لیکن انکا اعلیٰ ترین کارنامہ وہ ہے جو رامائن کے ترجموں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے ان کے منظوم ترجمے ان کے قدرت زبان اور قوت اظہار کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ ترجمے پھر شائع کئے جائیں تاکہ موجود نسل کے پڑھنے والے بھی ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔

عالی جناب بدرالدین طیب

حضرت افق نے اردو زبان وادب اور ہماری مشترکہ تہذیب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کو وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ یوں تو حضرت افق.......... جامع حیثیت تھے مگر میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ رامائن، مہابھارت اور شریمد بھاگوت کا اردو ترجمہ ہے۔ ان ترجموں اور افق کی دوسری نظموں کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندو دھرم کے متعلق افق کے قلم سے جو کچھ اردو میں آ گیا ہے وہی اردو ادب کو ایک سرمایہ ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ میری دعا ہے کہ حضرت افق کے کارناموں کا اعتراف بڑھے بلکہ آزاد ہندوستان میں اردو ادب کے شاندار سرمایہ کی قدر ہو اور اس ادب کی ترقی کے لئے فضا اور سازگار ہو۔

گوپی ناتھ امن

حضرت افق کی زندگی خالص ادبی رہی۔ انہوں نے اردو، ہندی، فارسی تینوں زبانوں میں لکھا اور نظم کی طرف غزل سے زیادہ توجہ کی۔ افق کا فارسی کلام بہت کامیاب ہے۔ لیکن ان کا خاص میدان اردو ہی تھا۔ اس زبان میں انہوں رباعی، قطعہ، غزل، مسدس، مثنوی،

ڈرامہ، طنز، اخلاقیات، مذہبیات، ہجو، مدح، ترجمے اور مقالے سب کچھ لکھے۔ پر گوئی میں علامہ سیماب یا مولانا ظفر علی خاں سے ان کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت افق کا اصل میدان مسدس ہے، مسدس میں افق نے ایک رامائن بھی لکھی۔ حضرت افق نے رباعیات میں محاورے اور کہاوتیں بھی خوب نظم کی ہیں۔ افق صاحب کی نظم ''اتفاق'' (مسدس) جو ۱۹۰۴ء میں لکھی تھی آج بھی ہندوستانیوں کے لئے نیک درس ہے اور شاید پہلے سے زیادہ 'حفاظت مذہب وایمان' کے عنوان سے افق صاحب نے جو نظم لکھی ہے اس سے ان کی وسیع النظری بھی نظر آتی ہے اور مجاہدانہ اسپرٹ بھی۔ وہ اکبراللہ بادی کے ہم خیال ہیں کہ مذہب میں کوئی ترمیم، تنقیص نہ ہونی چاہئے۔

افق صاحب کا رام ناٹک ایک زمانہ میں اسٹیج پر کھیلا جاتا رہا۔ اس ناٹک کا ایک حصہ ایک رات اور دوسرا حصہ دوسری رات کو کھیلا جاتا تھا۔ اس ناٹک کے مکالمے بہت جاندار اور پر زور ہیں۔ انہوں نے نظم اور نثر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

لسان العصر جناب منشی شیام نارائن لعل جگر بریلوی

(یادرفتگاں ۲۹۱ سے ۳۰۰) آپ کا میدان فکر وخیال وسیع تھا۔ شاعر، ناثر، اخبار نویس، مترجم، مؤرخ، ڈرامہ نگار، ناول نویس، ظرافت نگار غرض ادب کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا جس میں آپ کے قلم نے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ علم عروض وقافیہ اور صرف ونحو کے ماہر تھے۔ کئی کتابیں آپ نے قواعد پر لکھیں۔ تاریخی معلومات بہت وسیع تھی۔ نثر تو قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ نظم میں بھی یہ حال تھا کہ بات بات میں مصرعے اور شعر زبان سے نکلتے تھے۔

نظم میں ہر صنف میں آپ نے زور قلم دکھایا۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مسدس، مثنوی غرض سب کچھ لکھا اور بہت لکھا۔ آپ کی تصنیفات بے حساب اور بیشمار ہیں۔

تصنیفات کے اس ضخیم وعظیم ذخیرہ کو دیکھ کر حضرت افق کی قابلیت اور قوت تحریر سے حیرت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ تحریر وتصانیف سے خالی نہ تھا۔ آپ کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور آپ نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت پائی۔ آپ کی تحریر میں روانی اور دلکشی ہے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا چٹخارہ۔

سید رفیق مارہوی نے ''ہندوؤں میں اردو'' نامی اپنی کتاب میں لکھا ہے (صفحہ ۲۳۲-۲۳۳) ''افق کی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ سے باہر گذرا۔ یعنی ریاست کوٹا، نابھن، دہلی، حیدرآباد، لاہور اور پنجاب کے بہت سے مقامات کی بسلسلہ شعر و شاعری سیر کی۔ اور ہر جگہ آپ کی قدر و منزلت ہوئی۔ آپ کا میدان فکر و خیال بہت بلند تھا۔ آپ بیک وقت ناثر، شاعر، اخبار نویس، مترجم، مؤرخ، ڈرامہ نگار، ناول نویس اور ظرافت نگار تھے۔ ادب کا شاعر ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر افق نے قلم فرسائی نہ کی ہو۔ علم عروض، قافیہ اور صرف و نحو کے ماہر تھے، ہر موضوع پر آپ کی کتابیں موجود ہیں جن میں مذہبی کتابیں بھی ہیں۔ اور علمی و اخلاقی بھی۔ الغرض افق ایک ایسا ہمہ داں انسان تھا کہ اس کی تصنیفات کے اس عظیم ذخیرہ کو دیکھ کر اس کی قوت تحریر اور قابلیت پر حیرت ہوتی ہے۔ آپ کی تحریر میں روانی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ غزلیں آپ نے بہت کم کہیں۔ کچھ عرصہ بعد غزلیں کہنا بالکل چھوڑ دی۔ آپ کی نظموں میں سادگی، روانی، سلاست اور مٹھاس ہے۔

رام چندر شاؔد دہلوی

حضرت افقؔ کی مشہور منظوم تصنیف گرو گوبند کی سوانح عمری کے دیباچہ میں لکھا ہے:
''ملک الشعراء منشی دوارکا پرساد افقؔ لکھنوی شکر گذاری کے قابل ہیں کہ انہوں نے اردو کے آفتاب صبح کو مہر نیمروز کر دکھایا۔ اور اپنی معجز بیانی و شیریں بیانی سے تاریخ تصویر اس طرح آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دی کہ حسن شاعری، بلاغت، وضاحت، برجستگی، مضامین میں چستی الفاظ، شائستگی، زبان، محاورہ بندی اور حاضری طبیعت خود بول رہی ہے کہ آج فن شاعری میں چار چاند لگ گئے۔''

لالہ شری رام ایم۔ اے۔ مصنف مؤلف خمخانہ جاوید

''فارسی میں دستگاہ کامل تھے۔ بچپن سے شاعری کا شوق ہے۔ سنسکرت اور انگریزی سے بھی واقف ہیں۔ چنانچہ ٹاڈ راجستھان رامائن وغیرہ سنسکرت اور انگریزی کتب کا ترجمہ نہایت لطافت اور عمدگی سے کیا ہے۔ بڑے ذکی، فہیم اور خوش فکر شاعر ہیں۔ طبیعت موزوں اور

فکر عالی پائی ہے۔ آخر میں اخلاقی اور نیچرل مضامین پر جھک گئے نیچرل طرز میں بھی بانکپن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔"

بھارت پرتاپ جھجر

"رسالہ بھارت پرتاپ جھجر مارچ ۱۹۰۲ء کی اشاعت میں ایک نوٹ ریویو کے تحت درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب سماچار لاہور سے ہر منگل اور سنیچر کو شائع ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اس کو جاری ہوئے ۱۴ سال ہو چکے تھے۔ اس نوٹ کے مطابق "چند ماہ سے اس اخبار کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ کیونکہ اب یہ مشہور سخن سنج ملک الکشعراء منشی دوار کا پرساد صاحب افق لکھنوی کے زیر ادارت شائع ہونے لگا تھا۔ بھارت پرتاپ نے حضرت افق کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بھارت پرتاپ کے قارئین منشی صاحب کی علمی لیاقت اور ان کی شاعرانہ فضیلت سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے ہم کو پنجاب سماچار کی بابت کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے کیونکہ حضرت افق کی عالمانہ لیاقت سے آج اہل پنجاب مستفید ہو رہے ہیں۔ پنجاب سماچار کو افق صاحب کی بدولت جو عروج حاصل ہوا اور جس قدر ترقی کی امید کی جا رہی ہے وہ اس قابل ضرور ہیں کہ اہل نظر قدر کریں گے۔ شعر و سخن کا پلہ جس قدر بھاری ہے اسی قدر نثر کا بھاری ہے وہ اخبار لالہ ہیرا لعل کپور کی ملکیت میں ہفتہ وار بھی شائع ہوتا ہے۔"

حضرت افق کا مقام شعرائے گرامی کی نظر میں

ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی:

ادب میں دوامی ہے نام افق
ادب ہی سے پوچھو مقام افق
پس مرگ بھی تو ضیا کم نہیں
سحر بن کے روشن ہے شام افق
کہا دل کی بالیدگی نے یہی
حیات آفریں ہے کلام افق
در وبست الفاظ کو دیکھئے
منظم ہے کتنا نظام افق
مٹیں گے نہ شاہکار ان کے کبھی
کلام افق ہے دوام افق
عجب کیف پرور تھا وہ دور بھی
چھلکتا رہا جس میں جام افق
سر راہ سب دیکھتے رہ گئے
عجب خوش ادا تھے خرام افق
ہوا ثبت ہر دل میں اے جوش یوں
نہ بھولے گا محفل کو نام افق

پروفیسر ترلوک چند محروم

توصیف افق زبان پر ہے
پائے فکر آسمان پر ہے
وہ پیکر قادر الکلامی
ہر نوع سخن میں تھا گرامی
ہے بحر رواں ادب سراسر
اس بحر کا تھا افق شناور
ہو شعر کی اس سے بڑھ کی کیا دھوم
اخبار لکھتا تو وہ بھی منظوم
اقلیم سخن کی تاجداری
پائی تھی بفضل ذات باری
تاریخ فسانہ اور اخبار
ہر فن کو کیا رہین اشعار
اشعار بھی وہ کی جن پہ قرباں
باران سحاب گہر افشاں
رامائن اور عظیم بھارت
بھارت کے صحیفہ ہائے شوکت
وہ دور کہن کی یادگاریں
تہذیب وطن کی یادگاریں

ہیں عقدہ کشائی دین و دنیا — لازم ہیں برائے دین و دنیا
اردو کا لباس ان کو دے کر — احسان بڑا کیا وطن پر
ہر گھر میں انہیں ہوئی رسائی — ہر روح میں روشنی در آئی
اعزاز افق نے یوں دکھایا — سوتی ہوئی قوم کو جگایا
دلچسپ، طویل داستانیں — بنیاد ادب کی جنکو مانیں
افسانے جو رزم و بزم کے ہیں — قصے جو عزم و جزم کے ہیں
اردو میں زبان فارسی سے — اترے ہیں ان کے خوب چربے

پڑھتے ہیں ادب کو شوق والے
یا جو ہیں قدیم ذوق والے

سُمِت پرکاش شوؔق دہلوی

از افق تا افق ہے نام افقؔ — کیا بتاؤں تمہیں مقام افق
طائران چمن کا ذکر ہی کیا — اک جہاں ہے اسیر دام افق
آنکھ ہو تو کرو کلام کی سیر — کان ہوں تو سنو پیام افق
سو برس بعد بھی نہیں بھولے — کر رہے ہیں سب احترام افق

شوق کیوں ہوں نہ گوش بر آواز
سن رہا ہوں صدائے عام افق

جناب بسمؔل سعید دہلوی

وہ نامور افق افق آسمان شیر
جن کو رہا ہے زیر زمیں اک جہان شیر

اک آفتاب کہنہ کی اوج فلک پہ ضو
فکر افق تھی مطلع صد آفتاب نو

ذہن رسا میں ذوق سخن تھا جو موجزن
طبع رواں تھی قلزم ذخار فکر و فن

اللہ رے ان کے کارِ نمایان بے شمار
اردو زباں پہ ان کے ہیں احسان بے شمار

ہیں دفتر فیوض وہ سب نظم و نثر کے
ناول، ڈرامے، مثنویاں، غزلیں، ترجمے

جو کچھ دیا تھا ان کو خدا نے وہ دے گئے
شعر و سخن کے ہم کو خزانہ وہ دے گئے

حد ہے کہ ان کی قوت شعری کے معجزے
ڈانڈے ملا گئے ہیں صحافت سے شعر کے

جو کارنامہ ہائے افق ہیں وہ باکمال
سرمایۂ ادب ہیں متاعِ ہنر تمام

بے رنگ و بو نذر عقیدت کے پھول ہیں
بسمل، کہیں وہ کاش، ہمیں یہ قبول ہے

باوا کرشن گوپال مغموم کیتھلوی

...... افق بھی آسمان لکھنؤ کا اک ستارہ تھا
ضیا سے جس کی ظلمت کا گریباں پارہ پارہ تھا

پڑھی کس شوق سے اسرار فطرت کی کتاب اس نے
اٹھا دی رمز پنہانی کے چہرہ سے نقاب اس نے

میسر یوں تو ہر صنف سخن پر پوری قدرت تھی
مسدس میں مگر ضرب المثل اس کی مہارت تھی

وہ نظم دلپذیر اس کی و نثر دل پسند اس کی
وہ جدت اس کی، جودت اس کی وہ فکر بلند اس کی
دقیقہ جو، دقیقہ سنج عقل اس کی، نظر اس کی
نکات شاعری سے آگہی تھی معتبر اس کی
دکھائے شعر کے میدان میں جوہر فصاحت کے
بہائے اس نے دریا حسن معنیٰ کے، بلاغت کے
مضامیں کا تنوع آئینہ اس کی ذہانت کا
نمونہ آپ ہی تحریر تھی اپنی سلاست کا
بنا دیتی تھی ششدر خلق کو اس کی ہمہ دانی
تھی فکر و فن کے ایواں میں بلا کی اس سے تابانی
بہت کچھ مذہب و تاریخ کے موضوع پر لکھا
نہایت سوچ کر لکھا، نہایت ڈوب کر لکھا
جسے کہتے ہیں 'نظم اخبار' اس کا کارنامہ تھا
خبر بھی نظم میں ہوتی تھی ایسا زور خامہ تھا
تھی حاصل قدرت کامل فن تاریخ گوئی میں
بہار اس سے تھی پیدا گلشن تاریخ گوئی میں
تراجم سے کیا اردو کا دامن مالامال اس نے
دکھایا یوں طبیعت کی رسائی کا کمال اس نے
کیا ہے منتقل اردو میں راجستھان کا قصہ
رواں ہے ہر زباں پر راجپوتی آن کا قصہ
بہت کیف آفریں ہے اس کی رامائن، مہابھارت
نہایت دلنشیں ہے اس کی رامائن، مہابھارت
فسانے الف لیلیٰ کے لکھے بیحد روانی سے
نئی جاں ان میں ڈالی ہے نہایت خوش بیانی سے

لکھے منظوم حالات اس نے دسویں پادشاہی کے
گرو گوبند کی عظمت کے ، شان کج کلاہی کے

در شہوار ہے رامائن یک قافیہ اس کی
برنگ مہر تاباں آشکارا ہے ضیا اس کی

گل فردوس بھی قائل ہے اس کے رنگ نزہت کا
انوکھا پھول ہے یہ اس کے گلزار عقیدت کا

کئی ناول لکھے،ناٹک لکھے، کتنے ہی افسانے
طبیعت کی ہمہ گیری کا عالم کوئی کیا جانے

دیئے علم و ادب کو کیسے کیسے شاہکار اس نے
عطا کی فن کے پژمردہ گلستاں کو بہار اس نے

زمانے بھر نے مانی منزلت اس کی وقار اس کا
تھا اک تصویر حیرت خامہ جادونگار اس کا

کہاں تک ذکر ہو اس کے کمالات و فضائل کا
فقیرانہ روش کا اس کی رندانہ خصائل کا

دیا ہے نکتہ سنجوں نے عقیدت کا خراج اس کو
پنہاں ہے برنگ شاخ گل پھولوں کا تاج اس کو

جناب رتن پنڈوروی

اے لسان عصر اے گلزار اسرار سخن
تاج اقلیم سخن ، دنیائے معیار سخن

اے فروغِ بزم امکاں اے مسیحائے جہاں
گوہر بحر معانی، صدر دربار سخن

اے نوا سنج حقیقت، طوطی شکر مقال
بلبل باغ ادب، روداد گلزار سخن

اے فدائے جوش ملت، آشنائے درد قوم
تاجدار ملک معانی، ابر در بار سخن

تھی تری ذات گرامی حامی اردو زباں
تیرا ہر مصرعہ حقیقت میں تھا معیار سخن

بذلہ سنجان جہاں کرتے تھے تیرا احترام
اب تیرا ہمسر کہاں ہے بخت بیدار سخن

بزم فرحت میں تو وجہ رونق محفل رہا
تو افق ہو کر بھی بن کر ہر بشر کا دل رہا

شاخ سدرہ پر کبھی تو زمزمہ پرداز تھا
یا کبھی اپنی صدا پر گوش بر آواز تھا

تیرا ہر نغمہ حقیقت میں تھا سحر سامری
تیری فکر دل نشیں کا اک نیا انداز تھا

قدر کرتے تھے تیری اہل نظر اہل کمال
اک میں کیا سب کی نظروں میں تیرا اعزاز تھا

کیوں نہ پھر روح القدس کا ہم زباں کہئے تجھے
ہر سخن تیرا میری نظروں میں اک اعزاز تھا

تیرا ہر مصرعہ تھا تفسیر رموز بے خودی
تیرا ہر شعر رواں دنیائے ساز و ساز تھا

تھی حقیقت کی حدوں سے آشنا تیری نظر
راز عرفان تصوف تجھ کو شرح راز تھا

اہل ایراں کیوں نہ کہتے تجھ کو صد ناز عجم
تیری گویائی میں جوش حافظ شیراز تھا

تشنہ کامان سخن کی آرزو کہئے تجھے
ہند میں اردو زباں کی آبرو کہئے تجھے

ایک دنیائے تصوف تھا ترا رنگ سخن
رومی آتش بیاں کا ہم زباں کہیے تجھے

بادۂ عرفاں سے تھا لبریز پیمانہ ترا
کہیے کہیے قبلۂ روحانیت کہیے تجھے

یہ تخیل یہ بلندی اور یہ فکر رسا
سر زمین شاعری کا آسماں کہیے تجھے

نظم میں بھی تو نے انداز تغزل بھر دیا
شعر کی دنیا میں میر کارواں کہیے تجھے

افق کی ادبی خدمات کی قدر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ایران میں بھی خوب کی گئی۔ ان کے کمالات کے اعتراف میں ہز ہائنیس سید علی عباس سہام الملک ماساہادی، جواس وقت ایران (پرشیا) کے شاہ کے داماد تھے نے نظام حیدرآباد کے وزیر اعظم مہاراجہ گردھاری پرساد باقی کو فارسی زبان میں ایک خط لکھا جس میں ہز ہائنیس نے افق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افق ہندوستان کا مایہ ناز شاعر ہیں ان کی شاعری کی خصوصیت ان کی مکمل صلاحیت ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو کی معلیٰ ان کی شاعری میں عیاں النکار شاستر کے علم اور نثر نگاری کے ملکہ کے قائل ہیں۔ اپنے نظم اخبار اور اپنے روشن خیالات سے وہ ساری دنیا میں مشہور ہیں اور وہ خود اپنی مثال ہیں۔ ان کی شاعری ایران کی روزمرہ کی زبان اور لحظہ سے آراستہ ہے۔ ان کی شہرت افق کی ایک جانب سے دوسری جانب تک پھیلی ہے۔ اگر وہ ملک ہندوستان میں نہ ہو کر ایران میں ہوتے تو ان کی ادبی خدمات کی ستائش اور تعریف نظر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ میں تصور نہیں کر سکتا کہ میں کس حد تک ان کی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کو بیان کر سکوں۔ اس خط کا کچھ حصہ اس طرح ہے:

Rai Dwarka Prasad Ufuq is poet pride of India. He is a charming Writer of prose also. His talent lies in his perfection and he is of a high pedigree. Urdu-e-mualla acknowledges his

rhetorics and sublimity and his Nazam Akhbar and the radiant gems of his ideas speak for him throughout the whole world. He has decorated his works with the colloquial language of Iranian diction and the fame of his rhetorics expanded from one horizon to another. Had India been the land of Iran, the Mansion of admiration and praise would not have been so much desolate. I wonder how much should I be exuberant in describing his graceful virtues.

کلاسیکل اُردو شاعری کے اہم ستون

جدید اردو شاعری کے اہم ستونوں میں سب سے پہلا نام شمس الدین ولی دکنی (۱۶۶۸-۱۷۴۴ء) کا آتا ہے۔ ولی ایک صوفی فقیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مرید تھے۔ ولی پہلے صوفی فقیروں کی طرح فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ ۱۷۰۰ء میں اورنگ زیب کی حکومت کے دوران وہ دہلی آئے۔ دہلی میں صوفی بزرگ شاہ گلشن سے ان کی ملاقات ہوئی۔ شاہ گلشن نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی اردو شاعری میں فارسی کی ساری روایات کو اس طرح پرو دیں کہ وہ عظیم شاعری کی حامل ہو جائے۔ شاید ان کے مدنظر یہ بات رہی ہوگی کہ فارسی کا لمبا سفر اردو شاعری کو مقبول عام بنانے میں کافی مددگار ثابت ہوگا۔ ولی دکنی نے اس مشورہ پر عمل کیا اور اپنی اردو شاعری میں فارسی کی ساری روایات کو اسی زبان کے انداز اور الفاظ کو ہم آہنگی کی ساتھ شعری پیکر دیدیا۔ ولی نے فارسی زبان کی خصوصیات کو اپنی زبان میں ادا کرنا شروع کیا اور فارسی کے شیریں اور سبک الفاظ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہوئے۔ یہیں سے دبستان دہلی کی بنیاد پڑی جو مختلف واقعات اور حوادثات کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ دبستان دہلی یا اردو زبان کا عروج ایک شاندار اور عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہوا۔ ۱۷۲۲ء میں جب ولی دوبارہ دہلی آئے تو ان کا اردو دیوان تیار ہو چکا تھا اور ان کے شعر صوفی مرکزوں سے لیکر محفلوں میں اور دہلی کے ہر گلی کوچہ میں مشہور ہو چکے تھے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ ولی کے کلام سے لوگوں کا رجحان اردو میں شاعری کرنے کی طرف ہوا۔

ولی دکنی کی شاعری سے متاثر ہو کر کئی شعراء نے اردو زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ابتدائی دور کے اردو شعراء میں شاہ مبارک آبرو (............۱۷۵۰ء)، ایک اہم نام ہے۔ آبرو اپنے زمانہ میں، ریختہ کے مشہور شاعر تھے اور انہوں نے اردو شاعری کی فکر اور اسلوب میں جدید کاری بھی کی اس دوسرے کے اہم شعراء میں محمد شاکر ناظم، شرف الدین، مضمون اور غلام مصطفےٰ خان یکرنگ کے نام خاص طور سے لئے جاسکتے ہیں۔ اس دور کی اردو شاعری میں چار عناصر خاص طور پر نمایاں ہیں۔ پہلے دکنی الفاظ کے استعمال سے بچا جانے لگا،

دوسرا عشق حقیقی اور صوفیانہ خیالات کو نظر انداز کر کے عشق مجازی کے بیان کو اہمیت ملنے لگی، تیسرا روانی، برجستگی اور بیان میں صفائی پر زیادہ زور دیا جانے لگا اور چوتھا ایہام گوئی کو شاعری میں زیادہ استعمال کیا جانے لگا (ایہام گوئی ایک صنعت ہے جس میں شاعر اپنے کلام میں ایسے لفظوں کا استعمال کرتا ہے جس کے دو معنیٰ ہوتے ہیں، ایک نزدیکی اور دوسرا دور کا) اس پہلے دور کی شاعری میں کیونکہ عشق مجازی کو اہمیت دی گئی تھی اس لئے اس میں دنیاوی چیزیں زیادہ بیان کی گئیں۔ لیکن اس دور کی شاعری کی کشش جلد ہی کم ہوگئی۔ آگے کے دوسرے دور میں دنیاوی چیزیں کم بیان کی گئیں اور تصوف یا عشق حقیقی اور صوفیانہ خیالات کے بیان کو توجہ دی جانے لگی۔ دوسرے دور کے شعراء میں سراج الدین علی خاں آرزو (۱۶۸۹ -۱۷۵۶ء)، اشرف علی خاں فغاں (...... ۱۷۷۲ء)، شاہ حاتم (۱۷۰۰-۱۷۹۱ء) اور مظہر جان جاناں (۱۶۹۹ سے ۱۷۸۱ء) اہم ہیں۔ خان آرزو کو اردو کے نئے دور کا بانی کہا جاتا ہے۔ خاں آرزو کو اردو زبان کی قوت اظہار میں اضافہ کرنے کا اور صفائی لانے کا شرف حاصل ہے۔

انہوں نے اردو زبان میں نئے محاورے داخل کئے اور غیر مروج محاوروں کو زبان سے نکالا خان آرزو کے زمانہ سے اردو زبان کو صاف ستھرا پن ملنا شروع ہوا اور انہوں نے اردو شاعری میں ایہام گوئی کو ہٹا کر اس کی جگہ فارسی شاعری کے اسلوب اور فارسی شاعری میں ادا کئے گئے جذبات واحساسات کی ترجمانی کو ترجیح دی۔ فغاں کی شاعری میں ایہام گوئی اور خارجیت نہیں ہے اس میں ہندی اور فارسی محاوروں کا دلچسپ اور خوبصورت استعمال بھی ملتا ہے جس سے اردو زبان میں اور پختگی آئی۔ فن شاعری کے لحاظ سے ان کی زبان کامیاب اسلوب اور حاضر جوابی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ شاہ حاتم نے بھی زبان کو کافی سجایا سنوارا۔ حاتم نے روزمرہ میں استعمال ہونے والے عام فہم عربی فارسی الفاظ اور رائج محاوروں کو اپنی شاعری میں جگہ دی ان کی زبان بھی صاف ستھری اور منجھی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ زبان سلیس ہو اور مشکل نہ ہونے پائے۔ جان جاناں کی شاعری کی زبان بھی صاف آسان اور روانی سے پر ہے اس میں ایہام گوئی کا استعمال نہیں ہے اور بیان میں بھی زور اور نکھار ہے۔ جان جاناں نے اردو زبان کے پرانے پن کو کافی حد تک دور کیا شاعری کے دوسرے دور میں دنیاوی چیزوں کے بیان کی جگہ تصوف اور عشق حقیقی کے بیان پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔

اس طرح پہلے دور کے شعراء کے کلام میں برجستگی اور اظہار خیال میں بیباکی ہے اس

میں استعارات اور تشبیہات کی بھر مار نہیں ہے۔ صاف اور سادہ زبان اور سیدھے سادہ محاوروں میں ان شعراء نے اپنا دل کھول کر رکھدیا ہے، لفظوں کے بناوٹی پن اور لفظی صنعتوں سے دور سیدھی سادی زبان میں جذبات واحساسات کا بیان ہے۔

حاتم اور مظہر کے دور کے فوراً بعد اردو شاعری کا وہ دور شروع ہوا جو اردو ادب میں سب سے اہم ہے۔ دبستان دہلی کے اس تیسرے دور میں میر تقی میر (۱۷۰۹-۱۸۱۰ء) جیسے غزل گو، مرزا محمد سودا (۱۷۱۴-۱۷۸۱ء) جیسے قصیدہ کہنے کے ماہر اور میر غلام حسن حسن (۱۷۲۴-۱۷۸۷ء) جیسے مثنوی کے عظیم شاعر ہوئے جن کی اپنی اپنی صنف شاعری میں حاصل کی ہوئی بلندیوں کو آج تک کوئی شاعر نہیں پہنچ سکا۔ خواجہ میر درد (۱۷۲۱-۱۷۸۵ء) اور سید محمد میر سوز (۱۷۲۱-۱۷۹۸ء) بھی اس عہد کے اہم شاعر تھے۔ اس دور میں شاعری میں داخلیت کا غلبہ رہا جس کے سبب اس دور کے شعراء کے کلام میں اندرونی جذبات کی اعلیٰ ترین ترجمانی ملتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں پہلے سے کہیں زیادہ اثر، طاقت اور نکھار تھا۔ اس وقت بھی اردو شاعری میں فارسی کی تلمیحات اور استعارات کو اپنایا گیا۔ کیونکہ اس وقت کے حکمراں ادیب اور شاعر عربی اور فارسی کے ماہر تھے اور ہندی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے تھے اس لئے اردو میں عربی فارسی ترکیبوں، محاوروں اور لفظوں کا استعمال بڑھتا گیا اور ہندی کے لفظ متروک ہوتے گئے۔ ہندی زبان کی تشبیہات استعارات اور ہندی زبان کے زیادہ تر الفاظ استعمال کیا جانا چھوڑ دیا گیا۔ زبان میں گرامر کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے پر توجہ دی گئی۔ ان سبھی شعراء کا کلام نہایت پر اثر ہے اردو زبان کی تصحیح، اصلاح، صفائی، اسے آراستہ کرنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے کا شرف بھی انہی شعراء کو جاتا ہے اس دور میں قصیدہ، واسوخت جیسی شاعری کے کچھ نئی اصناف بھی اردو شاعری میں شامل ہوئے اور تذکرے بھی کافی لکھے گئے۔

دہلی صوفیانہ شاعری کا مرکز رہی ہے اس لئے دہلی کے شعراء پر تصوف کا رنگ غالب تھا، فلسفہ وحدت الوجود جس کے معنیٰ ہیں کہ دنیا میں سوائے ایک خدا کے کچھ نہیں ہے، کی ان پر گہری چھاپ تھی اس لئے دہلی کی دبستان شاعری کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ اس پر تصوف کے فلسفہ کا گہرا اثر رہا۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد تصوف کے اہم شاعر ہیں۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کی شاعری میں روحانی اور فلسفیانہ جذبات کی ترجمانی نمایاں طور پر ہے اور ان کے اشعار درد اور زبان کی شیرینی سے پر ہیں۔ ذوق (۱۷۸۹-۱۸۶۴ء) اور غالب کی

شاعری (۱۷۹۶-۱۸۶۹ء) میں بھی فلسفیانہ خیالات کی چھاپ نظر آتی ہے ان مایہ ناز شعراء کے کلام میں بیان کئے گئے جذبات واحساسات کی شدت نے دبستان دہلی کی شاعری کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ حسن وعشق، گل وبلبل، ساقی وشراب، شمع و پروانہ کی روایتی شاعری کے دائرہ میں بھی زندگی کا فلسفیانہ پہلو ہمیشہ ان شعراء کے پیش نظر رہا ان شعراء کے آفاقی کلام نے اردو شاعری کی پوری فضا کو پرنور کردیا۔ دبستان دہلی کے ایک اور اہم شاعر مومن خاں مومن (۱۸۰۰-۱۸۵۱ء) کی شاعری میں صوفیانہ، روحانی احساسات و جذبات بہت نمایاں نہیں تھے لیکن انہوں نے عشق مجازی کی واردات کا بیان احساس کی جس شدت کیساتھ کیا اس نے انہیں عاشقانہ رنگ کی شاعری کے بے مثال ہونے کا شاعر کا مرتبہ دلا دیا۔ مومن کی شاعری کی انوکھی ٹیس اردو شاعری کے قدردانوں کو سحر زدہ کرنے میں کامیاب رہی۔ حالانکہ دبستان دہلی کی شاعری میں عشقیہ شاعری کا ذکر بخوبی ملتا ہے لیکن نہایت احتیاط کیساتھ واردات عشق کا بیان پاکیزگی کے حدود کے اندر ہی رہتا ہے اور اس میں ہجر کی کیفیت کا ہی زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ محبوب کا ذکر ادب واحترام کیساتھ کیا گیا ہے اور حسن وعشق کے بیان میں داخلی واردات کو اہمیت دی گئی ہے۔ اظہار کا انداز بھی سادہ ہے، شوخی اور بناوٹ کم ہے۔ تشبیہات واستعارات میں دلآویزی ہے مگر بیان نمایاں طور پر سادگی کے زیور سے ہی آراستہ ہے۔

بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵-۱۸۶۲ء) کی شاعری میں صوفیانہ خیالات اور عالمی ہمدردی کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی ہے جو ان کے رخصت ہوتے ہوئے شہنشاہی جاہ واقبال کے درمیان ان کی بے بسی کے دلگداز حالات کے سبب پیدا ہوئی تھی۔ ظفر نے زندگی کے درد کا خود احساس کیا تھا اور ان کی زندگی نہایت سخت مرحلوں سے گذری تھی اس لئے ان کی شاعری میں شدت سے محسوس کی گئی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا پر درد بیان ہے ان کی شاعری میں ان کی آپ بیتی زندگی کا عکس ابھر کر آیا ہے اس لئے اس میں سچائی سے بیان کیا گیا وہ درد اور کسک ہے جو کسی کا بھی دل کچوٹ کر رکھدینے کی طاقت رکھتی ہے۔ ظفر کی شاعری میں سادگی، سلاست، روانی اور شیرینی کیساتھ دل میں کھپ جانے والی سنجیدگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مختصراً دبستان دہلی کے اس دور میں بے مثال شاعری کی گئی اور شاعری میں احساسات کی پاکیزگی سادگی اور صاف بیانی کافی حد تک قائم رہی۔

لکھنؤ کی اُردو شاعری

اٹھارویں صدی میں نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور مراٹھوں اور جاٹوں کے دہلی پر لگا تار حملے ہوئے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دلی پر حملہ کیا، احمد شاہ ابدالی نے تین بار ۱۷۴۸ء، ۱۷۵۱ اور ۱۷۵۶ء میں دہلی پر حملے کیے۔ ان حملوں کی وجہ سے دہلی میں کئی بار تباہی آئی اور مغلیہ سلطنت کی طاقت اور شان وشوکت لگا تار کم ہوتی گئی۔ اس ماحول میں اردو شاعری کو بھی گہری ٹھیس لگی۔ شاہی سرپرستی کے عادی ہو چکے دہلی کے شعراء دہلی چھوڑ کر چھوٹی ریاستوں کے راجاؤں اور نوابوں کی طرف رخ کرنے لگے۔ شعراء کے دہلی کو الوداع کہنے کا اثر یہ ہوا کہ لکھنؤ، رامپور اور حیدر آباد شاعری کے نئے مرکز کی شکل میں ابھرنے لگے۔ خواجہ میر درد کے علاوہ دہلی کے تقریباً سبھی اہم شاعر سراج الدین آرزو، فغاں، میر، سودا، میر سوز، میر حسن وغیرہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے۔ یعنی اردو شاعری کا مرکز دہلی سے کھنچ کر لکھنؤ آ گیا۔ یہاں کے راج درباروں میں شعراء کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کی قدر ومنزلت کی گئی۔ خاص کر لکھنؤ کے نوابوں نے اردو شاعری کو ایسے اپنے پن سے گلے لگایا اور اپنے خاص نوابی ماحول میں پنپنے کے ایسے مواقع فراہم کیے کہ مدھیہ کال کے عہد کی اردو شاعری ہی خاص طور پر دو اسکولوں میں بٹی نظر آئی۔ ایک دبستان دہلی اور دوسرا دبستان لکھنؤ کے نام سے جانا جانے لگا۔

دبستان لکھنؤ کے شروعاتی دور میں وہی شاعر اہم رہے جو دہلی سے آئے تھے۔ ان شعراء کے کلام کی اپنی خصوصیات تھیں جن کے لئے وہ پہلے ہی سے مشہور تھے۔ ان کے بعد کے دور کے شعراء کی شاعری نوابی عیش وعشرت کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اودھ راج کی بنیاد تقریباً ۱۷۲۴ء میں پڑی لیکن اس کو اصلی اہمیت نواب شجاع الدولہ کے دور میں ملی۔ شجاع الدولہ نے ۱۷۵۴ء سے ۱۷۷۵ء تک حکومت کی۔ آصف الدولہ جنہوں نے ۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۷ء تک حکومت کی، اودھ کے جاہ وجلال کے بانی کہے جا سکتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے میں دلی سے کئی بڑے شعرا نے اودھ کا رخ کیا جن میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی، سید انشاء اللہ خاں انشا، سعادت یار خان رنگین، شیخ قلندر بخش جرأت اہم نام ہیں۔

مصحفی (۱۷۵۰-۱۸۲۴ء) آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آ بسے۔ جرأت ۱۸۰۰ء میں لکھنؤ آئے۔ ان کی وفات ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ ۱۹ویں صدی کی شروعات میں اودھ راج قائم ہو چکا تھا یہاں کی زندگی کا اپنا رنگ تھا جس کا اثر باہر سے آنے والے شعراء پر پڑا اور انہوں نے بھی یہاں کے ادب پر اپنی چھاپ چھوڑی۔ سعادت یار خاں رنگیں (......۱۸۳۴ء) نے خواتین کی زبان میں انہیں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر لکھا اور اپنی شاعری کو ریختی کا نام دیا۔ انشا (۱۷۵۶-۱۸۱۷ء) کی شاعری میں بھی خواتین کی اپنے گھر کی گھٹن، درد اور پابندیوں کا بیان ہے۔ دلی سے لکھنؤ آنے والے کئی شعراء کو مرزا سلیماں شکوہ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔۔ سلیماں شکوہ دلی کے بادشاہ شاہ عالم کے بیٹے تھے اور آصف الدولہ کے دور حکومت میں لکھنؤ چلے آئے تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

مصحفی، انشاء اور جرأت کے وقت لکھنؤ کی شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس دور کے شاعر حالانکہ میر اور سودا کی طرح دلی سے آئے تھے لیکن ان پر دبستان دہلی کی شاعری کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ دلی میں یہ شاعر اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی رہے دوسرے اس وقت دہلی میں کوئی ایسا بڑا شاعر تھا بھی نہیں جو ان نئے شعراء کے کلام پر اثر ڈال سکتا۔ لکھنؤ میں پہلے سے شاعری کا کوئی بنا بنایا رنگ نہیں تھا۔ دبستان دلی کے ختم ہونے کے بعد دبستان لکھنؤ کی بزم جب آراستہ ہوئی تو یہاں خوشحالی، فارغ البالی وافر مقدار میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دبستان دہلی کی اردو کی وہ شاعری جو داخلی جذبات سے مزین تھی خارجیت کی طرف مائل ہوگئی۔ یہ فطری بات ہے کہ ادب کے اوپر زندگی کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں پروان چڑھنے والی شاعری پر نشاطیہ عناصر کا غلبہ ہوتا گیا جسے ناقدین ادب نے خارجیت کا نام دیا جبکہ لکھنوی ادب کا بہت سا حصہ ایسا بھی ہے جو داخلیت سے پُر ہے۔ لکھنؤ اور دہلی میں زندگی کی قدریں تقریباً ایک جیسی ہی تھیں۔ اس لئے دونوں جگہ کے ادب میں بھی ایک سی ہی زندگی کے بیان ہیں۔ ادب کے میدان میں اسلوب اور خیالات کے اعتبار سے لکھنؤ میں کچھ مخصوص حالات کی وجہ سے تبدیلیاں ضرور آئیں لیکن انکا اثر اتنا گہرا نہیں تھا کہ ادب کا رنگ ایکدم جداگانہ ہو جاتا۔ دہلی میں مغل سلطنت تباہ ہو رہی تھی اور اس کے جاہ و جلال کے پھر سے قائم ہونے کی کوئی امید نہیں بچی تھی اس لئے دہلی کی شاعری میں مایوسی اور ناامیدی گھر کر

گئی تھی جبکہ لکھنؤ میں جونئی حکومت قائم ہوئی تھی اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ یہاں شعراء کونوابوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اودھ کے نواب انگریزوں کی بخشی ہوئی عیش وعشرت کی زندگی جی رہے تھے اور شاید بخشش میں ملی شان وشوکت کے اندرونی غم کو وہ شاعری اور ناچ رنگ کے ماحول میں بھلا دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کی لکھنوی شاعری میں سنجیدگی کی جگہ ایک طرح کی سطحیت آ گئی تھی۔ اس دور کی لکھنوی شاعری کے شعراء نے میر اور سودا کی سنجیدہ اور روایتی شاعری کو اپنایا ہی نہیں۔ لکھنؤ میں اس وقت عیش وعشرت اور فارغ البالی کا ماحول تھا جس کا تقاضا تھا کہ خوشی اور امنگ سے بھری شاعری کی جائے اس لئے ان شعراء نے شاعری کے مضمون اور بلندی خیال کی طرف توجہ نہیں دی اور شوخی و بناوٹ سے بھری ہوئی غیر سنجیدہ شاعری کرنے پر ہی اپنا فن صرف کیا۔ شاعری میں موجز بیانی، زبان کی زیبائش، الفاظ کی بندش اور بلاغت کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ سراپا بیانی میں جدت پیدا کی جانے لگی اور اس میں خارجیت کے عناصر کا بھی دخل ہونے لگا۔ لیکن اسی دور میں لکھنؤ میں دو نامی شاعر ہوئے جنہوں نے اردو شاعری کے میدان میں قدم رکھنے والوں پر شاعری کے الگ اسلوب عمل میں لانے کی پابندی عائد کی۔ یہ دو عظیم الشان شعراء شیخ امام بخش ناسخ (......۱۸۳۸ء) اور خواجہ حیدر علی آتش (......۱۸۴۶ء) تھے۔ بہر حال اسی سرزمین پر ان کے جداگانہ طرز سخن کے زیر اثر دبستان لکھنؤ میں ادب کے دو اہم اسکول آباد ہوئے جس کو اردو ادب کی تاریخ میں ناسخ اسکول اور آتش اسکول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انہیں دونوں اسکولوں کی بدولت اردو ادب کا شاندار محل تعمیر ہوا ان دونوں شعراء کی دین سے اردو شاعری ہمیشہ مقروض رہے گی۔

ناسخ نے اردو زبان میں پرانی روایتیں چھوڑ کر عربی، فارسی کے الفاظ اور جملوں کی ترکیب استعمال کرنے پر بیحد زور دیا۔ انہوں نے ہندی کے بہت سے میٹھے الفاظ کو بھی ترک کر دیا جو اردو شاعری میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ ناسخ نے فارسی شاعری کا نچوڑ لے کر اردو کو بالکل ٹکسالی زبان بنا دیا۔ ناسخ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری کے اسالیب کو خیال میں رکھ کر شاعر کرتے تھے اور انہیں عمل میں لانے کی سختی سے پابندی عائد کرتے تھے۔ ناسخ کی غزلیں فنی اعتبار سے اونچے معیار کی ہیں۔ وہ نئی نئی تشبیہات، ترکیب، روزمرہ اور محاورے استعمال کرتے ہیں اور ہر شعر میں خیال کو بہت ہی باریکی سے چھان بین کرنے کے بعد شعری

پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ ناسخ کے اثر سے اردو زبان میں مشکل سے مشکل اور اونچے سے اونچے خیالات کو بیان کرنے کی وسعت آ گئی اور اس میں آگے کے لئے بھی گنجائش ہو گئی۔ لیکن ان کی شاعری میں جذباتیت یا قلبی درد و غم کا اظہار بہت کم ہے۔ وہ زبان کے ماہر ہیں اور کلاسیکی اردو شاعری کے بھی ماہر ہیں۔ ان کی شاعری میں تخیل کی پرواز کم ہے مگر فنی اعتبار سے زبان کے استعمال میں انکا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ ان کی شاعری میں ساری توجہ زبان، محاورات، تشبیہات اور استعارات کے استعمال پر رہی ہے اور ان کے حاوی ہو جانے کی وجہ سے ان کی شاعری میں جذبات کا بیان دب گیا ہے۔ ان کی شاعری میں قلبی درد و غم کا اظہار بہت کم ہے یعنی اس میں جذبات کی عکاسی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے بعض اشعار محض مشکل لفظوں کی الٹ پھیر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے ان کی شاعری ایسی سجی سنوری گڑیا کی طرح معلوم ہوتی ہے جو دیکھنے میں تو اچھی لگتی ہے مگر اس میں جان یا روح نہیں ہوتی ہے۔ ناسخ اسکول میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں استعمال کئے جانے والے عربی، فارسی کے الفاظ تراکیب، روزمرہ، محاورے سب معیاری، کھرے اور درست ہوں۔ انہوں نے بہت سے خوبصورت لفظ اور تراکیب کو یہ کہہ کر نکال دیا کہ یہ شرفاء کے یہاں استعمال نہیں ہوتے ہیں، جبکہ لسانیات یا بھاشا وگیان کے اسکول کے مطابق اس سے زبان کا بیحد نقصان ہو سکتا ہے۔

ناسخ کے ہمعصر آتش تھے۔ وہ ناسخ کی لفظوں سے کھلواڑ کرنے والی بناوٹی قسم کی شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آتش نے اپنی شاعری میں احساسات اور جذبات کی ترجمانی کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی بناوٹی شاعری کے زمانے میں بھی انہوں نے بیحد پُر اثر اور مستی اور بیخودی سے لبریز اشعار کہے ہیں جو آج تک سخن فہموں کو روحانی مسرت دیتے ہیں۔

آتش آزاد رو تھے اور ان کی طبیعت فقیرانہ تھی۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ آتش کی شاعری میں لفظوں کی آراستگی کو خاص اہمیت نہیں دی گئی پھر بھی اس دور میں اور آج تک ان کی شاعری کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ اس میں سادگی، نغمگی جذباتیت اور روحانیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ وہ دل کو زیادہ چھوتی ہے کیونکہ اس میں بناوٹ نہیں ہے۔ آتش کی شاعری میں تخیل یا فکر کی ناموزوں اڑان نہیں ہے اور اس میں صوفیانہ فلسفہ کی ماہیت کو زیادہ

توجہ دی گئی ہے۔ یہ علامت ان کی شاعری میں فطری طور پر تھی کیونکہ آتش خود صوفی فقیر تھے۔ ان کی سیدھی سادی اور سچی زندگی کا اثر ان کی شاعری پر صاف جھلکتا ہے ان کے سچے دل سے نکلے ہوئے اشعار اپنی سادگی، نغمگی اور روانی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے۔ ناسخ کے بنائے ہوئے شاعری کے معیار کے زیر اثر آتش کی شاعری میں عربی، فارسی لفظوں کا اچھا استعمال اور بیان کی صفائی بھی ملتی ہے اور لفظوں کے جو معانی مراد لئے گئے ہیں ان کی صفائی سے ادائیگی ہوتی ہے۔ ان کی عام فہم زبان اور محاوروں کے خوبصورت استعمال سے جو شاعری وجود میں آئی وہ بے حد پر اثر اور دلرس ثابت ہوئی۔ اپنے مخصوص انداز اور مخصوص کشش کی وجہ سے ہی لکھنوی شاعری میں آتش کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ آتش کی جیسی گرمی سخن لکھنؤ اسکول کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی شاعری میں ایک خداداد کیفیت ہے جو صرف انہیں کی شاعری کا حصہ ہے۔ آتش کی زندگی میں جو بیباکی، دلیری اور سادگی تھی وہی ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں تصوف کے باریک سے باریک اور لطیف سے لطیف اور عشق حقیقی کے گہرے سے گہرے خیال کا اظہار ملتا ہے۔ آتش کی شاعری میں اخلاقی قدروں کا ذکر بھی بار بار آتا ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ زندگی میں اچھائی کی کھوج کو انسانی زندگی کا مقصد اور فرض سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ شاعری بہترین فن ہے جس میں خیالات اور لفظوں کا استعمال نہایت خوبصورتی سے ہونا چاہئے۔ ان کا فن شاعری دلکش جذبات نگاری سے آراستہ ہے اور دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی زبان ناسخ کی زبان سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش ہے۔ ان کی غزلیں اردو کی اعلیٰ درجہ کی شاعری کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

آتش اسکول کا سارا زور بیان پر تھا اس لئے ان کے یہاں بھی اور ان کے اسکول سے منسلک شعراء کے یہاں اچھی شاعری پائی جاتی ہے۔ اسی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کی دبستان لکھنؤ کی شاعری میں نشاطیہ عنصر کے ساتھ ساتھ داخلیت بھی پائی جاتی ہے جو اصلی شاعری ہے۔ ایک رواج یہ چل پڑا کہ لوگ کہنے لگے کہ دلی اسکول کی شاعری میں داخلیت پائی جاتی ہے اور لکھنؤ اسکول میں خارجیت جبکہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ درحقیقت لکھنؤ کی شاعری میں بھی کافی داخلیت پائی جاتی ہے۔

دبستان لکھنؤ کے اسی دور کے ایک اور مشہور شاعر پنڈت دیا شنکر کول نسیم

(۱۸۱۱-۱۸۴۳ء) ہیں جو آتش کے شاگرد تھے اور اپنی مشہور مثنوی ''گلزار نسیم'' سے اردو شاعری میں اپنا نام امر کر گئے ہیں۔ نسیم ناسخ کی دقیق قسم کی شاعری سے متاثر ضرور تھے لیکن خداداد صلاحیت ہونے کی وجہ سے ان کا کلام ناسخ کے کلام کی طرح مشکل ہونے کے بجائے کہیں زیادہ پراثر اور کیف پرور رہا۔ نسیم کی شاعری میں لکھنوی شاعری کے تمام عناصر ایجاز واختصار، مناسبت الفاظ، برجستگی، روانی، محاورات تشبیہات اور استعارات سب اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ باوجود اس کے تصنع یا بناوٹی پن کی وجہ سے شاعری میں کشش اور اثر پذیری میں کمی ہے۔ پھر بھی مثنوی گلزار نسیم کی دو ایسی خصوصیت ہیں جو میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے اسکو ممتاز کرتی ہیں۔ پہلی ہے ایجاز واختصار اور دوسری محاوراتی زبان کا استعمال۔ فن کے اعتبار سے اور تخیل کی پرواز کے لحاظ سے یہ ایک اعلیٰ پیمانے کی تصنیف ہے۔ مناسبت لفظی اور بیان کی خوبی کی وجہ سے شاعری کا فن مجروح نہیں ہوا اور اس میں دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔ نسیم کی شاعری کی بابت چکبست نے درست کہا ہے ''گو یہ آتش کے شاگرد تھے لیکن آتش کی گرمی سخن ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی .... طبیعت میں ایک خداداد کیفیت ہے جو کلام کو مزیدار بنا دیتی ہے.......... نسیم کے اشعار زبان کی پاکیزگی اور ترکیب الفاظ کی چستی کے لحاظ سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔''

مختصراً دبستان لکھنؤ کی شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب تھے کیونکہ یہاں امن، چین اور خوشحالی تھی۔ زبان کے نقطۂ نظر سے شاعری زیادہ پرکیف اور پرکشش ہے۔ یہاں کی زبان اور زبان سے زیادہ لہجہ نرم اور شیریں ہے۔ اس زمانہ میں یہاں کے معاشرہ میں صوفیوں کے صبر وقناعت کی تعلیم پر توجہ دیئے جانے کی طرف کسی کا رجحان نہیں تھا۔ اس لئے تصوف کے اور اخلاقی مضامین شاعری میں غالب نہیں تھے۔ غزل، مثنوی، مرثیہ سبھی پر معاشرے کا اثر تھا، اچھی اور بری چھاپ سبھی قسم کی شاعری پر تھی۔ نوابی ماحول میں خواتین کے حسن کا بھرپور بیان کیا گیا۔ بیان میں خارجیت کا غلبہ تھا اس لئے معشوق کے زیور کپڑوں وغیرہ کا اور جسم کے ہر عضو کے بیان پر توجہ دی گئی۔ سیرت سے زیادہ صورت پر توجہ تھی۔ لکھنؤ کی شاعری میں عربی، فارسی کے الفاظ اور فارسی کی تراکیب کا بہت زیادہ استعمال کیا جانے لگا جس سے زبان خالص اور بے میل ہوگئی۔ محاورات، اصطلاحات کو فصاحت کے اصول سے جانچ کر استعمال کیا گیا۔

ہندی کے الفاظ اصطلاحی (پوجا وغیرہ لفظوں کا جن کا ترجمہ نہ ہو) اور مستعمل (جو استعمال میں آتا ہو اور غیر مانوس نہ ہو) کا استعمال کم ہو گیا، یعنی کچھ ایسے الفاظ استعمال کرنا بند کر دیا گیا جن کا کوئی بدل تھا ہی نہیں۔ یقیناً اس سے اردو ادب میں الفاظ کی کمی ہوئی اور ہندی اور اردو میں دوریاں بڑھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اہل لکھنؤ دہلی سے الگ اپنی پہچان بنانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ادب میں اہل دہلی سے الگ راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ لفظوں کی مناسبت اور فن عروض پر ضرورت سے زیادہ زور دینا، ہر قافیے کو اور مشکل سے مشکل قافیہ کو قلمبند کرنا، صرف ونحو (گرامر) کی غلطیوں سے کلام کو پاک رکھنے کی غیر معمولی احتیاط برتنا لکھنؤ اسکول کی شاعری کی خصوصیات میں شامل ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دبستان لکھنؤ میں زبان کو نکھارنے کا کام بخوبی ہوا۔ صرف ونحو کی پابندی، محاورات کے استعمال، تراکیب کی بندش کے قوانین نے لکھنؤ کے پورے ادب کو ایک ایسے ہموار راستے پر چلنا سکھا دیا جس سے اس کا مستقبل روشن ہو گیا۔

لکھنؤ کی شاعری کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ لکھنؤ کے نواب اور بادشاہ شیعہ تھے۔ شیعہ حضرات اپنے مذہب کے عقیدہ کے مطابق محمد صاحب کے داماد حضرت علی ان کے نواسہ امام حسن اور امام حسین، حضرت عباس جو رشتے میں حسین کے بھائی ہیں، حضرت حسین کے بیٹے علی اکبر، حضرت حسین کے چھ مہینہ کے بیٹے علی اصغر، حسین کی چھوٹی بہن زینب، امام حسین کی چھوٹی بیٹی صغریٰ، سکینہ جو حضرت حسین کی بیٹی ہیں اور کربلا میں شہید ہونے والے حسین کے ۷۲ وفاداروں کی کربلا میں دردناک شہادت کی یاد میں محرم میں ہر سال ماتم مناتے آئے ہیں۔ ان عظیم شخصیات کے یوم پیدائش اور وفات کے دن کو بھی یہاں جوش وخروش سے منایا جاتا رہا ہے اور لوگ ان کی زندگی سے درس حاصل کرتے ہیں۔ اردو ادب کے کئی اصناف جیسے مرثیہ، نوحہ، مقاصدہ، سلام وغیرہ انہیں مذہبی عقیدے کی وجہ سے مقبول ہوئے۔

اس وقت کی لکھنؤ کی بناوٹی شاعری کے ردعمل کے طور پر بھی مرثیہ لکھنے میں ترقی ہوئی کیونکہ یہی ایسی صنف شاعری تھی جس کا تعلق مذہب سے ہونے کی وجہ سے اس میں زندگی کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تبلیغ ممکن تھی۔ اس فن کی ترقی کے لئے جیسا ماحول چاہئے تھے وہ لکھنؤ میں موجود تھا۔ لکھنؤ میں مرثیہ شاعری کی اہم صنف کی شکل میں بیحد مقبول ہوا، بہت سے شاعر مذہبی ثواب حاصل کرنے کے لئے اس صنف میں اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کرنے لگے۔ مرثیہ کہنے

والے لکھنؤ کے دو عظیم شعراء میر ببر علی انیسؔ (۱۸۰۲-۱۸۷۴ء) اور مرزا سلامت علی دبیر (۱۸۰۳-۱۸۷۵ء) نے اس صنف شاعری کو معراج کمال تک پہونچا دیا۔ مرثیہ میں ہر طرح کے اور ہر عمر کے آدمیوں اور خواتین کے کردار کی عکاسی ہوتی ہے۔ انیس نفسیات کے ماہر تھے، انہوں نے ہر کردار کی ذہنی کیفیت بیان کرنے میں اسی کی فطرت کے مطابق بالکل سہی لفظوں کا انتخاب کیا ہے۔ یہ کردار کیونکہ شاعر کے عقیدے کے مظہر ہیں اس لئے بیان نہایت مہذب انداز میں کیا گیا ہے۔ انیسؔ نے مذہبی اور تاریخی موضوعات پر بہت سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ انہوں نے مقدس کرداروں کے بارے میں ایسی باتیں لکھی ہیں جو انکے خیال میں اس وقت ہونا ممکن ہو سکتا تھا۔ بیان کی صفائی خوبی بندش محاوروں کا استعمال حسن اسلوب اور طرز ادائیگی میں ان کا کلام بے مثال ہے۔ انیسؔ نے فطرت کے حوالے سے بھی بہترین شاعری کی ہے۔ انکی زبان خالص سلیس اور شیریں ہے۔ انیسؔ کے مرثیہ نہایت پراثر ہیں اور قارئین کے پاکیزہ جذبات کو جگانے والے ہیں۔ انکے مرثیے سن کر عقیدتمندوں میں خود پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔

مرثیہ کے دوسرے اہم لکھنؤ کے شاعر مرزا دبیرؔ نے بھی کربلا کے حادثہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دبیر بڑے عالم تھے اور مذہب اور شاعری دونوں سے انہیں رغبت تھی، انیسؔ کے مقابلہ میں انہوں نے لکھنے میں مشکل اسلوب کو ترجیح دی اور تشبیہات اور استعارات سے سجی ہوئی زبان کا استعمال کیا۔ ان کے مرثیوں میں فارسی اور عربی کے مشکل الفاظ اور صنعتیں بھری پڑی ہیں۔ دبیر کے مرثیوں میں الفاظ کی شوکت بلند پروازی مضامین کی تازگی اور رنج والم کا ماحول پیدا کر کے دل کو پگلا کر رکھ دینے والے بیان سے یقیناً مرثیہ گوئی کا اصل مدعا اور حق ادا ہو گیا ہے۔

لکھنؤ میں مرثیہ کی صنف شاعری میں جو ترقی ہوئی اس سے قوت زبان میں اضافہ ہوا اور اس نے اردو شاعری کے دائرے کو اور وسیع کر دیا۔ لکھنؤ میں اس وقت کی شاعری کے معیار میں جو گراوٹ آگئی تھی وہ مرثیوں کے لکھے جانے کی وجہ سے کافی حد تک رک گئی۔ لیکن مرثیہ کے چلن سے اردو شاعری میں کسی نئے دور کا آغاز نہیں ہوا کیونکہ جو مسائل اردو ادب میں نشاۃ ثانیہ کے دور میں شاعری میں اٹھائے گئے اور معاشرہ میں جو نئی بیداری ابھر کر سامنے آرہی تھی، اس کے بیان کا مرثیہ کے بیان سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ دونوں کے موضوعات الگ

الگ تھے۔ مرثیہ میں جو بھی نیاپن تھا وہ مذہب سے تعلق رکھنے والے موضوع کو نئے طریقہ اور نئے اسلوب کے ساتھ ادا کرنے تک محدود تھا اس میں بدلتے وقت کی اور نئے زمانے کی چیتنا کا نیاپن نہیں تھا۔

آتش اور ناسخ کے بعد کے لکھنؤ کے شعراء نے عربی، فارسی اور ہندی کے خاص لفظوں کا شاعری میں استعمال کرنے پر زور دیا۔ ایسے لفظوں کے استعمال پر زور دیا گیا جو اپنے معنی خود ہی بیان کر سکتے تھے۔ محاوروں اور اصطلاحات کو جانچ کر استعمال کرنے پر زور دیا گیا۔ دبستان لکھنؤ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہاں زبان و بیان کو بہت اہمیت دی گئی اور اسے کافی حد تک نکھارا اور سنوارا گیا۔ زبان کی صحت اور صفائی کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ حالانکہ اس وجہ سے بہت سے الفاظ اور محاورات ترک ہو گئے لیکن دوسری طرف بہت سی تراکیب بھی وجود میں آ گئیں۔ الغرض اردو زبان کی قوت اظہار میں کافی اضافہ ہوا۔

اُردو ادب کا پس منظر

(۱۹ویں صدی کے اوائل میں)

۱۹ویں صدی کے اوائل میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں چار عناصر بطور خاص کارفرماں ہیں انمیں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے قائم ہونے اور کچھ عرصہ بعد دلی کالج سوسائٹی بننے، اردو کو عدالتی زبان بنائے جانے اور لیتھو پریس کھل جانے کا اہم رول رہا۔ فورٹ ولیم کالج کی سنگ بنیاد ۴؍جنوری ۱۸۰۰ء کو رکھی گئی۔ حالانکہ اس کالج کا خاص مقصد نئے انگریزی ملازموں کو اردو سکھانا تھا تا کہ سرکاری کام کاج میں دقت نہ آئے۔ اس کالج کو شروعاتی دور میں فارسی کے قصے کہانیوں اور اخلاقی مضامین کو اردو ترجموں کا کام انجام دیا گیا۔ ۱۸۲۷ء میں دلی کالج وجود میں آیا جہاں ہر موضوع پر اردو میں اعلیٰ تعلیم دیئے جانے کا ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم دینا بھی شروع کیا گیا۔ بہت جلد ہی اردو نثر نگاری پر انگریزی کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور اس کے ساتھ ہی اردو میں نشاۃ ثانیہ یا (پُنر جاگرن) کا دور شروع ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں دلی ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی جس کے زیر اہتمام انگزیزی کی کچھ اہم دقیق مسائل کی کتابوں اور سنسکرت کی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک اردو زبان اتنی طاقتور ہوگئی تھی کہ اس میں تقریباً سبھی موضوعات پر اعلیٰ تعلیم کی اہلیت تھی۔ کمپنی سرکار نے ۱۸۳۲ء میں فارسی کے بجائے اردو کو عدالتی زبان بنائے جانے کا اعلان کیا جس سے اردو زبان کی کافی ترقی ہوئی۔ ۱۸۳۷ء میں لیتھو پریس کھلنے سے کتابوں کا شائع ہونا آسان ہوگیا۔ جس سے اردو زبان میں کتابوں کے چھپنے کی تعداد برار بڑھتی گئی۔ ان سبھی وجوہات سے اردو ادب میں نشاۃ ثانیہ کی لہر میں تیزی آئی۔

دوسری طرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہونے اور اس کے بعد برطانوی حکومت کے بڑھتے قدم اور عیسائی مشنریوں کے مذہبی اشاعتوں، تبلیغ یا پرچار پرسار سے ہندوستانی قوم خوفزدہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملک کی مذہبی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی جڑیں کمزور ہو

جائیں اور پورے ہندوستان پر انگریزی تہذیب وتمدن کے بادل سایہ فگن ہو جائیں اور ملک اپنی پہچان ہی کھو دے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت کے دانشوران قوم نے اپنے تہذیبی وراثت کو بچانے کے لئے اور اپنے مذہب، کلچر اور زبان کی حفاظت کرنے کے لئے دل و جان سے ہر ممکن کوشش شروع کر دی۔ مذہب، تہذیب اور تمدن پر حملہ کے خطرہ سے ہندوستان کے سبھی مذہبوں کے مصلح، دانشور اور مفکر بیدار ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات کے مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہی وہ دور ہے جب ملک میں بنا مذہب وملت کی تفریق کے ایک انقلابی ایکتا قائم ہوئی۔ اس وقت برطانوی حکومت کے استحصال کے خلاف اور انگریزی کلچر کے بڑھتے اثرات سے سماج کو بچانے کے لئے جدوجہد اور کشمکش شروع ہوئی۔ ہندوستان کی عظمت توقیر کو بچانے کے لئے، عوام کو بیدار کرنے اور انہیں ملک کو آزاد کرانے کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے تن من دھن، ایثار وقربانی سب کچھ نچھاور کرنے پر آمادہ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اس دور میں ملک کے تمام دانشوروں نے ادب کے ذرائع سے ہندوستانی عوام کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرنے کی مہم چھیڑی اور پژمردہ قوم میں روح پھونکنے کا بیڑہ اٹھایا۔ سوامی دیانند سرسوتی، سر سید احمد خاں، پنڈت دین دیال شرما، پنڈت مدن موہن مالویہ اور ان جیسے خیالات رکھنے والے مصلحین اپنے ملک اور قوم کو بیدار کرنے کے لئے کوشاں تھے اور عوام کو غفلت کی نیند سے جھک جھور کر جگانے کی کی کوشش کر رہے تھے۔

ہر دور کا ادب اپنے وقت کے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اردو ادب میں بھی اس زمانے میں نیا موڑ آیا۔ اردو ادبا نے نظم اور نثر دونوں میں ایسی زبان لکھنے کے آغاز کیا جو حملہ آوروں کی زبان نہ ہو کر عوام کی زبان ہو کیونکہ اسی زبان کے ذریعہ ملک اور قوم کی اصلاح، فلاح و بہبود ممکن تھی۔ یہیں سے اردو نظم اور نثر میں اہم بدلاؤ آئے۔ اردو ادب میں اسی دور کو نشاۃ ثانیہ (پنر جاگرن) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس وقت نثر نے مسجع، مقفع عبارتوں کی جگہ آسان اور سلیس نثر لکھنے کو وقت کی ضرورت سمجھی گئی، کیونکہ اسے سمجھنا اور سمجھانا آسان تھا۔ سنجیدہ قسم کے غور طلب موضوعات پر خیالات کی وسعت کے لئے پر اثر نثر لکھنے کی طرف بھی توجہ ہوئی۔

اردو نثر میں سماجی چیتنا کی شروعات پر سر سید احمد کی رہنمائی میں ہوئی۔ اس دور میں اردو نثر نگاری، تنقید، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور صحافت سبھی میدانوں میں اہم تبدیلیاں آئیں۔ ان میدانوں میں نئی زمین تیار کرنے میں جن ادبا نے اہم کردار ادا کیا ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

نثر کے میدان میں سر سید احمد (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء)، محمد حسین آزاد ۱۸۲۹ ۱۸۱ - ۱۹۲۰ء الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) پروفیسر رام چند (...... ۱۹۰۵ء)، ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۱-۱۹۱۲ء)، مولوی ذکاء اللہ (۱۸۳۲-۱۹۱۰ء)، نواب مہدی علی خاں محسن الملک ۱۸۳۸-۱۹۰۷ء) جیسے بڑے ادیبوں نے روانی، برجستگی سے پُر اور معانی اور مفاہیم سے بھری ہوئی زبان میں لکھ کر اردو نثر نگاری کو بہت اونچے مقام پر پہونچا دیا۔ آزاد کی نثر کے اسلوب کو بہت سراہا گیا کیونکہ اس میں روانی، کشش، جوش، سلاست تازگی اور کیفیت کے ساتھ ساتھ لفظوں کا خوبصورت استعمال ملتا تھا۔ ان ادباء نے ان موضوعات اور اس زبان میں لکھنا پسند کیا جو زندگی کے اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہوں اور جس کی ترسیل عوام تک آسان ہو۔

اسی زمانہ میں تنقید کے میدان میں بھی آزاد، حالی اور علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے اپنی تنقید نگاری سے اردو ادب کو نئی جہت سے آشنا کیا۔ خصوصاً حالی ''مقدمہ شعر و شاعر'' اور ''شعر عجم'' اور محمد حسین آزاد کی ''آب حیاب'' سے تنقید نگاری میں نئی راہیں کھلیں۔ حالانکہ ان کی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں لیکن لفظوں کا انتخاب اور جملوں کا دروبست ایسا ہے کہ کشش پیدا کرتے ہیں اور بیان میں چستی اور روانی برقرار رہتی ہے۔ ان باکمال تنقید نگاروں کی نگارشات سے اردو ادب کی بنیاد میں پختگی آ گئی۔

اسی نئے اردو ادب کی بنیاد پر دیوکی نندن کھتری اور ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے بہترین ناول نگاری اور کہانیاں لکھنے کے فن سے اس صنف میں ایک نیا راستہ کھولا۔ اسی دوران راشد الخیری (......۱۹۳۶ء)، مولوی عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰-۱۹۲۶ء) ، پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶-۱۹۰۲ء)، منشی سجاد حسین ۱۸۵۶-۱۹۱۵ء) اور مرزا ہادی رسوا (۱۸۵۸-۱۹۳۱ء) جیسے بڑے ناول نگاروں نے اپنی بے مثال تخلیقات پیش کیں اور اردو نثر کے خزانہ کو اور بھی مالا مال کیا۔ ان ناول نگاروں نے اردو ادب میں کہانی کے موجودہ دور کا آغاز کیا۔ ان میں سے کئی

ادباء کے ناولوں کی صرف ادبی ہی نہیں بلکہ تاریخی اور سماجی اہمیت بھی ہے۔ راشد الخیری نے ہندوستانی خواتین کی زندگی کے ان چھوٹے پہلوؤں پر قلم اٹھا کر انکی زندگی کو بہتر بنانے کو اپنے ناولوں کا مقصد بنایا۔ مولوی عبدالحلیم شرر ایک ہی وقت میں ناول نگار، ڈرامہ نگار، تنقید نگار اور مؤرخ کے طور پر اپنے فن کے جوہر دکھا رہے تھے۔ سرشار نے فسانہ آزاد جیسی نئی قسم کی تصنیف لکھ کر بے شمار شہرت پائی۔ سجاد حسین کا شمار اردو کے پہلے طنز و مزاح لکھنے والے قلمکاروں میں ہوا۔ مرزا ہادی رسوا کی ناول ''امراؤ جان ادا'' میں ناول نگاری کے فن کا بہترین مظاہرہ ہوا۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں اردو ڈراموں نے بھی ترقی کی۔ اس میدان میں ونائک پرساد طالب (......۱۹۱۴ء) نارائن پرساد بیتاب دہلوی، آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹-۱۹۳۵ء) اور احسن لکھنوی کے نام اہم ہیں۔ طالب نے انگریزی ڈراموں کو اردو میں اپنا کر ایک نیا تجربہ کیا۔ بیتاب دہلوی نے ہندو مذہب سے وابستہ کہانیوں کو ڈرامہ کی شکل میں دکھایا۔ آغا حشر کاشمیری نے شیکسپئر کے ناٹکوں کو ہندوستانی کہانی میں ڈھال کر ڈرامے کی شکل میں پیش کیا اور قدیم ہندوستانی اساطیر (پرانوں) کی بہت سی کہانیوں پر بھی ناٹک لکھے۔ حشر نے اردو اور ہندی اور ملی جلی زبانوں میں بھی ناٹک لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ احسن لکھنوی نے بھی شیکسپئر کے ڈراموں کو اردو ڈراموں کی شکل میں ڈھالا اور زیادہ تر کہانیوں کو ہندوستانی بنا کر لکھا۔ ان ڈرامہ نگاروں نے اردو ڈراموں میں نئے اسلوب کا آغاز کیا۔ ان کی جدید کاری سے اردو ڈراموں کی زبان بھی بہتر ہوئی۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اردو ڈراموں کو اوپر اٹھانے میں ان ڈرامہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا اور ان کی ڈالی ہوئی بنیاد پر اور ان کے بنائے ہوئے راستوں پر بعد میں آنے والے ڈرامہ نگار آگے بڑھے۔

اسی عہد میں صحافت کے میدان میں اس دوران میں پنڈت بال مکند گپت، سجاد حسین، محبوب عالم اور اخبار عام کے پنڈت رام گپت اردو ادب کو نئی جہت دینے کے ساتھ صحافت کے ذریعہ سماج کو نئے راستہ اور نئے سماجی آہنگ پر چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دور میں رسالہ جات کی اشاعت بھی بڑھ رہی تھی اور ان کا معیار بھی اونچا اٹھ رہا تھا۔ سیاسی، ادبی، سماجی، تاریخی، اقتصادی اور سائنس کے موضوعات سے جڑے مضامین وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق شائع کئے جانے لگے تھے۔

نشأۃ ثانیہ اور اردو شاعری

۱۹ویں صدی کے جس دور میں اردو نثر نگاری، تنقید، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری اور صحافت کے میدا میں نئے نئے تجربے کئے جا رہے تھے اور ان میں اہم تبدیلیاں آ رہی تھی اسی زمانہ میں اردو کے میدان مین بھی اہم جدید کاری کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پہلے اور کچھ بعد کے زمانہ تک اردو کی روایتی شاعری اپنے پورے شباب پر تھی۔ اردو شاعری کے دبستان دہلی کی عظیم شعراء ذوقؔ (۱۷۸۹-۱۸۵۴ء) غالب، بہادر شاہ ظفرؔ اور مومنؔ نے اردو شاعری کا خزانہ انمول موتیوں سے بھر دیا تھا۔ ان مایہ ناز شعراء کے آفاقی کلام نے اردو شاعری کو نئی زندگی اور نئی آب و تاب دی۔

اردو زبان کے ان عظیم شعراء کے کلام میں آفاقیت ہے اور یہ صدیوں سے آج تک اردو شاعری کے دیوانوں اور قدر دانوں کے دلوں پر دستک دیتے رہے ہیں۔ ان شعرائے کرام کے اشعار زندگی کے ہر سخت مرحلہ پر قارئین کو حوصلہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اور انسانی ذہن و دل کو سکون پہونچاتے ہیں۔ ایسے تمام اشعار موتیوں میں تولے جانے کے قابل ہیں۔ ان شعراء کے بعض اشعار محاوروں اور کہاوتوں کی شکل میں ہماری گنگا جمنی تہذیب کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ اس سب کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ اس دور میں جو ادب لکھا جا رہا تھا وہ سماج کے اونچے طبقے کے لوگوں کے ذوق و شوق کے مطابق ہی تھا۔ ادب کے دروازے عوام کے لئے کھلے ہی نہیں تھے۔ اس دور میں روزمرہ کی بول چال اور عوام کی زبان میں ادبی تخلیقوں کی اہمیت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ جاگیردارنہ عہد میں ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

اس دور میں اردو شاعری کے موضوعات کے لئے جو اسلوب اپنایا جاتا تھا اس میں فارسی زبان کی شاعری غالب تھی۔ عربی، فارسی الفاظ اور ان زبانوں کے جملوں کی در و بست سے مزین زبان کا استعمال اعلیٰ درجہ کے ادب کا پیمانہ سمجھا جاتا تھا۔ س کی وجہ بھی یہ تھی کہ ادبی تخلیقات میں ادباء کی توجہ صرف سماج کے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی دلی تسکین تک ہی محدود تھی۔ اس وقت عام آدمی کی خواہشات، ان کے مسائل اور ان کے امید و یاس کو انہیں کی زبان میں ادب میں عکاسی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی۔ جہاں تک زبان کا سوال ہے،

شاعری کی زبان کو آسان اور عام فہم بنانے کے بجائے اس کی صفائی اور اسے آراستہ کرنے پر زیادہ زور تھا۔ شاعری عام طور پر قلبی تھی اور اس میں سماجی مسائل کو نہیں اٹھایا گیا تھا۔ ادبی اقدار تلمیحات تشبیہات استعارات وغیرہ فارسی شاعری سے لئے گئے تھے۔ ایک طرح سے روایتی شاعری کی جارہی تھی جس میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ موضوع بیان میں قومیت کے جذبہ، سماجی بیداری، قومی یکجہتی، قومی شیرازہ بندی جیسے بیحد اہم مدوں جو جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اس وقت کی شاعری میں ملک اور قوم کے لئے نہایت اہمیت کے ان مسائل کے بارے میں کوئی پیغام نہیں دیا جارہا تھا۔ روزمرہ کے واقعات، فطرت کی عکاسی اور روزمرہ کی عام فہم زبان میں ادب کی تخلیقات کے امکانات تلاش نے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔

زمانہ کے کروٹ بدلنے کے ساتھ ایک نئی صبح کی شروعات ہوئی جس نے ایک نئے دور کا آغاز کرنے کا پیغام دیا۔ یہ پیغام تھا کہ لوگ صرف خیالوں کی دنیا میں نہ رہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے تقدیر کا رونا نہ روئیں بلکہ جاگیں اور کارکردگی کا مضبوط سہارا لے کر اپنے مستقبل سنواریں۔ یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی کہ شاعری عوام کی مشکلات کے بارے میں توجہ دلائے، عوام کے احساسات کی عکاسی کرے اور خاص طور پر پسماندہ طبقات کے لوگوں کی تکلیفوں کو اجاگر کرے۔ شاعری میں مقامی اثرات اور منظر نگاری کو بھی توجہ دیئے جانے کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا۔ مختصر یہ بات شدت سے محسوس کی جانھے لگی کہ ادب برائے زندگی ہو اور اس میں قوم کی شیرازہ بندی اور ملک کی بہبودی کے لئے کوئی پیام ہو۔ روایتی اردو شاعری کی خامیوں کو اور وقت کی ضرورت کے مطابق ادب کی تحریک کو جن عاقبت اندیش نظریہ رکھنے والے شعراء نے محسوس کیا ان میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے نام اہم ہیں۔

جس طرح انگریزی ادب کے اثر سے اردو نثر نگاری میں فارسی کا غلبہ ہٹا کر آسان اور سلیس اردو زبان لکھنے کا چلن بڑھا اسی طرح اردو شاعری پر بھی انگریزی کا اثرات نمایاں ہوئی۔ آزاد اور حالی نے اردو ادب اور خصوصاً اردو شاعری میں جو تحریک چلائی اس کے نتیجہ میں اردو شاعری میں یورپ کی شاعری کے عناصر عیاں ہونے لگے اور اردو شاعری جو عموماً قلبی رہی اس میں سماجی بیداری کے لہر اٹھنے لگی۔ آزاد اور حالی کا نظریہ سیاسی نہیں تھا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک بہتر سماج بنانا چاہتے تھے اور اس بہتر سماج کی تصویر ان کے پیش نظر تھی۔

آزاد نے زیادہ تر سیدھی اور آسان زبان میں چھوٹی چھوٹی نظمیں کہیں، نظموں کے موضوعات عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جن میں استعارات وغیرہ کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ ان نظموں کی خاص اہمیت جتنی تاریخی ہے جس سے اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اتنی ادبی نہیں ہے۔ حالی اردو شاعری کے جذبات اور زبان دونوں میں اہم تبدیلیاں لانے میں انقلابی شاعر ثابت ہوئے۔ انہوں نے روایتی تشبیہات، تلمیحات اور استعارات کے دائرہ میں محدود اردو شاعری کو بلند پرواز کے لئے کھلا آسمان دیا۔ اخلاقی موضوعات پر شاعری کرنے میں بھی انہوں نے پہل کی۔ انہوں نے روایتی شاعری میں تسلیم شدہ قدروں والی شاعری کو بیجان شاعری کہا اور اس کو اہمیت نہیں دی۔ انہوں انگریزی شاعری سے موضوعات لینے اور زندگی کے سیدھے سادہ اور ذی روح موضوعات کو شاعری میں جگہ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ نئے موضوعات کا پُرزور بیان کرنے کے لئے غزل اور قصیدوں کی بہ نسبت نظم کی صنف زیادہ موزوں تھی۔ اسی لئے اسی صنف شاری کو زیادہ ترجیح دی جانے لگی۔ اسی طرح مصرعہ طرح دینے کی روایت کی جگہ شاعری میں نئے نئے عنوانات کو جگہ دی گئی۔

آزاد اور حالی اور انکی تحریک سے متاثر جدید دور کے شعراء نے اخلاقیات، مذہب، حب الوطنی سماجی ترقی، سیاسی بیداری اور فطرت کی شاعری وغیرہ کے نئے موضوعات کو شامل کر کے اردو شاعری کے دائرہ کو وسیع تر کر دیا۔ بیداری کا بگل بجانے والے آزاد اور حالی نے نئے موضوعات اور نئے مضامین کو لاکر اردو شاعری کو ہمہ جہت اور کثیر الجہات دائرہ میں شامل کرا دیا۔ نئے مضامین کا بیان کرنے کے لئے فطری طرپر غزلوں اور قصیدوں کی جگہ نظموں نے لے لی۔ پرانے ادبی اقدار اور مبالغہ آرائی وغیرہ کی جگہ عام زندگی کی حقیقی چیزوں کے بیان کو ترجیح دی جانے لگی جو انسانی زندگی سے شاعری کو قریب تر کرنے میں معاون اور مددگار رہو۔ مختصراً اس دور میں اردو شاعری کی زبان و اسلوب اور مضامین اور موضوعات کو فارسی غلبہ سے نکال کر پوری طرح سے ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سماجی اصلاح، حب الوطنی اور قومیت کی آواز اردو شاعری میں صاف طور سے سنائی دے رہے تھی۔

اردو شاعری کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے ملک میں اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیاں ہوئی جنکا اثر اردو شاعری

پر پڑا۔ اودھ اور دلی کی حکومتیں ختم ہونے سے اردو شعراء کو حکومت کا سہارا لکھنؤ اور دلی کے بجائے رامپور اور حیدرآباد میں ملا جہاں نوابی اور نظامت پہلے کی طرح برقرار تھی۔ ۱۸۸۷ء میں رامپور میں کلب علی خاں جو خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان تھے، کی وفات کے بعد ان کی وراثت کا بھی جھگڑا اٹھا اور رامپور میں ریزیڈنسی قائم ہوگئی۔ ان حالات میں کئی شاعر رامپور چھوڑ کر حیدرآباد جانے کو مجبور ہوگئے۔ حیدرآباد کے نظام محبوب علی خاں اور وزیر اعظم سرکشن پرشاد شاد خود شاعر تھے اور حیدرآباد شروع سے ہی شاعروں اور ادیبوں کی عزت اور احترام کرنے کے لئے مشہور تھا، اس لئے ۱۹ویں صدی کے اواخر میں حیدرآباد ہندوستان کا اہم ادبی مرکز بن گیا۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم و ماہراجہ سرکشن پرشاد شاد شعراء اور ادباء کے بڑے قدرداں تھے۔ اس وقت تک آزاد اور حالی کی قیادت و رہنمائی میں اردو شاعری کے نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا اس لئے جو شاعر اس نئی فطری تحریک سے نہیں جڑے تھے اور غزل اور قصیدہ وغیرہ پرانے اقدار میں شاعری کر رہے تھے، انھیں شروع میں رامپور اور پھر حیدرآباد ریاست میں درباری شرف حاصل ہوا۔ اس دوران اردو شاعری کے آسمان پر دو نہایت جگمگاتے ستاروں امیر مینائی (۱۸۲۸-۱۹۰۰ء) اور نواب مرزا خاں داغ دہلوی (۱۸۳۱-۱۹۰۵ء) نے روایتی اردو شاعری کی آب و تاب کو برقرار رکھا۔ امیر مینائی لکھنوی زبان اور داغ دہلوی دہلی کی زبان کے استاد تھے۔ داغ اور ان کے ہمعصروں نے اردو شاعری کی زبان اور بیان کو کافی حد تک ہندوستانی بنا دیا تھا لیکن شاعری کے مضامین خاص طور سے عشق حقیقی اور عشق مجازی پر مرکوز رہے۔

مختصراً اس دور میں اردو شاعری کی زبان و اسلوب مضامین اور موضوعات کو فارسی کے غلبہ سے نکال کر پورے طور سے ہندوستانی بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ سماجی اصلاح، حب الوطنی اور قومیت کی آواز اردو شاعری میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس دور کے ادباء کی تخلیقات میں اپنے مذہب کے لئے فخر کا احساس، اپنے ملک کی عظمت رفتہ کا پرزور بیان اپنی عظیم تہذیب و تمدن اور ثقافت کی نغمہ سرائی ملک اور سماج کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ اور قومیت کی آواز نمایاں تھی۔ یہ عناصر ملک اور سماج کو نئی جہت سے آشنا کرا رہے تھے جس سے ایک اچھے سماج کی تعمیر ہو سکے اور آزاد ہندوستان کا سپنا پورا ہو سکے۔ ہندو مسلم یکجہتی کے جذبات بھی اس وقت کی شاعری میں خاص طور سے نمایاں ہوئے۔ اس وقت کی نظموں میں

اپنے مذہب، ملک اور تہذیب کی عزت اور سربلندی کے جذبات اور احساسات موجزن ہوئے۔ حالانکہ اردو شاعری کی زبان، اسلوب، مضامین اور موضوعات کو پورے طور سے ہندوستانی بنانے کی پرزور کوشش کی جارہی تھی لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ اردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثرات اس قدر غالب ہو چکے تھے کہ انہیں دور کرنے میں وقت لگ رہا تھا۔

آزاد اور حالی نے اردو شاعری میں سماجی بیداری کی بنیاد ڈالی اور جو زمین تیار کی اس پر جلد ہی ان کے بعد آنے والے شعراء نے ایسی راہیں تیار کر دی جن پر چل کر اردو شاعری بہت آگے بڑھ گئی۔

اردو ادب کے اسی پس منظر میں ملک الشعراء منشی دوار کا پرشاد افق لکھنوی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جانا مناسب ہوگا۔ افق کی تخلیقات پر اردو نثر نگاری، ڈرامہ نگاری، صحافت اور ناول نگاری میں سرسید کی رہنمائی میں ہوئی تبدیلی اور حالی اور آزاد کی قیادت میں اردو شاعری میں آئی اہم تبدیلیوں کے اثرات مرتب ہوئے اور اسی ادبی سماجی ماحول میں انہوں نے اردو شعری و ادب کو ایک نیا موڑ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ افق نے اردو ادب کے ہر میدان شاعری، نثر نگاری، صحافت، ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری سبھی ذرائع سے اردو ادب میں پروان چڑھ رہے نئے ادبی رجحانات اور نئی فطری شاعری کی تحریک کو آگے بڑھایا اور اس طرح اردو ادب میں نئے اقدار قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے افق نہ صرف ایک عظیم شاعر اور بہترین نثر نگار تھے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ایک مشہور ڈرامہ نگار، ناول نگار اور ایک اعلیٰ مرتبہ کے صحافی اور مدیر بھی تھے۔ ان کی یہی خصوصی ہمہ گیری اور ششِ جہتی اور مکمل ادبی صلاحیت ان کو اردو ادب میں ایک خاص مقام کا حقدار بناتی ہے۔ اسی پس منظر میں ہمہ گیری ادبی صلاحیت سے مزین افق کی یادگاری ادبی خدمات کا جائزہ لیا جانا مناسب ہوگا۔ یہ بھی مناسب ہوگا کہ ہمہ جہتی اہلیت کے ادیب افق لکھنوی کی ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ پہلے ہم ان کی شاعری سے کریں۔

افق کا ادبی ماحول اور ان کی شاعری

افق نے اردو شاعری کے جس دور میں آنکھ کھولی وہ محمد حسین آزاد (۱۸۲۹-۱۹۱۰ء) الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) اور پیارلال آشوب (۱۸۲۲-۱۹۱۰ء) کا زمانہ تھا۔ امیر مینائی اور نواب مرزا خاں داغ کی شاعری بام عروج پر تھی۔ دبستان لکھنؤ میں آتش، ناسخ، دیا شنکر نسیم، انیس، دبیر اور مرزا شوق جیسے باکمال شاعر شہرت کی بلندیوں کو حاصل کر چکے تھے۔ افق کے معاشرہ میں لکھنؤ کی دوسری ادب کی ہستیوں میں للتا پرساد شفق، (جو افق کے استاد بھائی تھے) جوالہ پرساد برق، بال کرشن قمر، بشن نارائن درابر، مولانا شفیق (۱۸۶۲-۱۹۵۰ء) محشر، منشی نوبت رائے نظر (۱۸۶۶-۱۹۲۳ء)، مرزا محمد ہادی رسوا ۱۸۵۸-۱۹۳۱ء) آرزو (۱۸۷۲-۱۹۵۱ء) اور مرزا ذاکر حسین ثاقب (۱۸۶۹-۱۹۴۶ء) کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

اردو شاعری میں سماجی چیتنا یا سماجی احساس کی شروعات آزاد اور حالی سے ہوئی۔ ان کے کلام میں سچائی، سادگی اور نیاپن تھا لیکن ان کے مقصد برطانوی حکومت سے ٹکرانا نہیں تھا۔ وہ حکومت کا ساتھ دے کر سیاسی ترقی کرنا چاہتے تھے۔ سرسید، حالی آزاد اور سرور کی تخلیقات میں اس کی جھلک ملتی ہے لیکن یہ ماحول زیادہ دن نہیں رہا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے زیر اثر عوام کی سوچ میں بنیادی تبدیلی آنے سے سماجی، سیاسی بدلاؤ میں تیزی آئی۔ جلد ہی لارڈ کرزن کی پالیسیوں کی سارے ملک میں مخالفت شروع ہوگئی اور سماجی چیتنا کا حکومت سے ٹکراؤ شروع ہو گیا جس کے اثرات اردو ادب پر نمایاں ہونے لگے۔ اس دوسرے عہد میں سیاسی مخالفت کا عکس ہمیں جن بڑے شعراء کے کلام میں ملتا ہے ان میں اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی ۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) دوارکا پرشاد افق لکھنوی (۱۸۶۴-۱۹۱۳ء) ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۵-۱۹۳۸ء) اور پنڈت برج نارائن چکبست (۱۸۸۲-۱۹۲۶ء) کے نام اہم ہیں۔

افق کی شاعری، نشاۃ ثانیہ کا پیغام لے کر منظر عام پر آئی۔ حب الوطنی اور اپنی تہذیبی و ثقافتی وراثت کی پوری طرح سے نمائندگی اور اظہار اور اس کے فخر کی جلوہ گری ہی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ مادر وطن کے لئے تعمیری جذبات اور ترقی کے تصورات ہی ان کی شاعری کے اصل موضوعات ہیں۔ یہ تصورات اقبال اور چکبست کی شاعری کے پہلے ہی افق کی شاعری میں پورے آب و تاب

کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وطن کو تعمیر اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے اور ہندوستانی سماج میں صدیوں سے جڑ جمائے ہوئے مختلف عیبوں اور خامیوں کو دور کرنے کے مقصد سے عوام میں بیداری موجزن کرنے کے لئے افق نے کئی نظموں مسدس، مثنویاں، رباعیاں وغیرہ لکھیں جو آج کے دور میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی آج سے ایک صدی پہلے۔ اخلاقی اور سماجی موضوعات پر لکھی گئی ان کے تمام نظموں سے ان کی ایک مصلح کی شخصیت ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب برائے زندگی افق کی شاعری کا خاص مقصد تھا۔ ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر کے مقصد سے عوام کی زندگی پر اثر ڈالنے والے موضوعات کا انتخاب انہوں نے خصوصاً اپنی شاعری کے لئے کیا۔ شراب کی مذمت، اتفاق، شجرِ اخلاق، مرقع عورت، استاد، خودی، دین و ایمان کی حفاظت، آہ مظلوماں، غریبوں کی غریبی، زبان، زر، کی تعریف، فضول خرچی، پابندیٔ وقت، تندرستی جیسے نئے موضوعات پر ایسی سخن سنجی کی ہے جو ادب کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ درجہ کی ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کے لئے مشعل راہ کا بھی کام کرتی ہے۔

افق نے سیاسی موضوعات پر بھی اپنے مخصوص انداز میں نظمیں، مسدس اور رباعی کہی ہیں۔ سیاسی موضوعات پر لکھی گئی اپنی نظموں سے افق برطانوی حکومت کی مخالفت میں عوامی جذبات کو آگے بڑھانے کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ ان موضوعات پر لکھے گئے انکو اشعار وقتی اور ہنگامی نہ ہوکر دائمی جذبات و احساسات کو حامل ہیں۔ وطنیت کے زیر اثر افق نے طنز و مزاح کے لحظہ میں بھی کچھ نہایت پر اثر نظمیں کہی ہیں۔ اس بارے میں ان کی نظمیں، پولیٹیکل نوحہ اور ٹیکس نامہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حب الوطنی کے جذبہ سے لبریز ان کی شاعری نے بعد کے ترقی پسند شعراء کے لئے راہیں ہموار کیں۔

افق کا انداز سخن نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین ہے۔ جذبات نگاری، زبان کی صفائی، بندش کی چستی تخیل کی اونچی اڑان ان کی شاعری کی خصوصیت میں داخل ہیں۔ جدید سے جدید موضوعات پر لکھی گئی ان کے نظموں میں سادگی، روانی اور ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی ہے جس میں قاری کو قلبی سکون دینے کی صلاحیت ہے۔ ان نظموں میں مبالغہ آرائی سے ہٹ کر اور تشبیہات، استعارات کی جگہ سیدھی سادی باتیں میں اتنی کشش پیدا کی گئی ہے کہ کلام دل کو چھو لیتا ہے۔ مثال کے طور پر نئے موضوعات پر لکھی گئی چھوٹی نظمیں جیسے صبح کی بہار، سورج کی

بہار، چاند کی بہار، بچپن کی بہار، پیری کی بہار، بہار روانی، ہولی، بسنت اور ہولی کی بہار، برسات کی بہاریں، حسن و عشق، حسن کی بہار، شکار، شکار میں شکار، قلم، پریم، اعتبار، فرزند، تیرتھ یاترا وغیرہ پیش کی جا سکتی ہے۔ ان نظموں میں مبالغہ آرائی اور روایتی تشبیہات استعارات سے ہٹ کر سیدھے سادہ زبان و بیان میں اتنی کشش پیدا کی گئی ہے کہ جذبات کا دل پر سیدھا اثر ہوتا ہے۔ یہ نظمیں سادگی، سلاست، نرمی اور مٹھاس کے ساتھ ساتھ چستی اور روانی جیسے اعلیٰ شاعری کے زیوروں سے آراستہ ہے۔ یہ بات بھی نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ افق نے جن تشبیہات اور استعارات کے ساتھ سخن سنجی کی ان کا دار مدار تمامتر ہندوستانی ماحول پر ہے۔

دبستان لکھنؤ کے اہم شاعر ہونے کی وجہ سے اور ناسخ اسکول کی شاعری سے بھی متاثر ہونے کی وجہ سے افق کی شاعری میں لکھنؤ کی محاوراتی زبان، تراکیب، بندشوں اور روزمرہ کا استعمال بہت دلکش انداز میں ہوا ہے۔

یہ بات بھی بطور خاص قابل ذکر ہے کہ افق نے اپنی شاعری میں ہندی لفظیات، تشبیہات، استعارات، تراکیب کا استعمال نہایت چابکدستی سے کیا ہے اور اس میں اپنی فنی مہارت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ ہندی الفاظ کا اتنا خوبصورت استعمال کسی اردو شاعر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ان کی صرف ایک تصنیف "رامائن یک قافیہ" (۶۵ صفحات) میں ہی ۴۰۰ ہندی الفاظ اپنی پوری روایتوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ افق نے یقیناً اردو زبان و ادب کے شعراء اور ادباء کے لئے ہندی الفاظ اور تراکیب کا استعمال بہت آسان بنا دیا۔ یہ کام افق اب سے تقریباً سوا سو سال پہلے ہی انجام دے چکے تھے۔

افق کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں انہوں نے ہندو مذہب اس کی تہذیب اور ثقافت کا بیان کیا ہے ہے وہیں انہوں نے اسلام مذہب کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرنے کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ اسلامی روایت کے بیان کرنے میں بھی انہوں مخصوص تہذیبی لفظوں کا استعمال کیا ہے جس سے تہذیب کی روح اور مفہوم قاری کے ذہن میں واضح ہو جاتے ہیں۔ افق کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سبھی مذہبوں کی عزت کرتے تھے اور عالمی بھائی چارہ و اتحاد کو بڑھانے کے حامی تھے۔

افق کی شاعری پرانے اور نئے دور کی اردو شاعری کو جوڑنے والی ایک اہم کڑی کی

شکل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک طرف جہاں انہوں نے اردو کلاسیکل شاعری سے متاثر ہو کے روایتی اور پرانے شاعری کے اسلوب میں نئے سے نئے موضوعات پر بہترین شاعری کی وہیں دوسری طرف انہوں نے آزاد اور حالی کی زیر اثر شروع ہوئے جدید دور میں فطری اور بیداری کی تحریک جس کا مقصد ادب برائے زندگی تھا، کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ افق نے ادب کے اس موڑ پر دونوں تصورات کو جمع کرنے کی خوبصورت اور کامیاب کوشش کی۔ انہوں نے کلاسیکل ادب کو جدید تصورات سے مزین کر کے پیش کیا جو یقیناً ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ اگر ان کے ادب کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے کہ کلاسیکل ادب اور جدید ادب میں ان کا کیا مقام ہے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ کلاسیکل ادب کی زبان و بیانکی ساری نزاکتیں جلوہ گر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری جدید ادبی تصورات و احساسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دبستان لکھنؤ کے ادب کی ساری فنی خوبیوں کے ساتھ حالی، آزاد وغیرہ کے جدید خیالات انکی شاعری میں ملتے ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ انہوں نے غزلوں کی بہ نسبت مثنوی اور مسدس کی طرف زیادہ توجہ دی۔ انہیں اصناف کے وہ عظیم شاعر ہیں جس کی وضاحت آنے والے صفحات میں ہوگی۔

افق کا انداز سخن بیحد واضح ہے انہیں جذبات اور احساسات کی عکاسی کی مہارت ہے۔ بندش الفاظ کی مرصع سازی ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ افق نے اپنی ادبی زندگی کا بیشتر حصہ مناظر قدرت کی مصوری، جذبات محبت کی ادائیگی، سیاسی، مذہبی اور اخلاقی قدروں سے متعلق بہترین کلام پیش کرنے میں صرف کیا ہے۔ اخلاقی اور سماجی موضوعات پر لکھی گئی ان کی نظموں کی ایک الگ ہی پہچان ہے۔ اس طرح افق نے مختلف موضوعات کو اردو کی شاعری کے دائرہ لا کر اردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے اور ایک نئے اسلوب کی شاعری کے لئے ایک اچھی زمین تیار کرنے میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

زبان کی صفائی بندش کی چستی، روانی، الفاظ کا دلکش جڑاؤ، جذبات نگاری ار تخیل کی گہرائی افق کی شاعری کی ایسی خصوصیت ہیں جو بحیثیت شاعر انہیں ایک اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہے۔ عربی فارسی، اردو، سنسکرت، انگریزی اور ہندی جیسی مختلف زبانوں اور ان کے ادب کی روایتوں، تشبیہات، تلمیحات اور استعارات کے عمیق مطالعے نے انہیں الفاظ کے بیش قیمتی

نگینوں کے ایک بڑے ذخیرہ کا مالک بنا دیا تھا جس کا استعمال انہوں نے اپنے شاعری میں نہایت خوبی کے ساتھ کیا۔اس اعتبار سے انہیں الفاظ کا ممتاز جادوگر کہنا مناسب ہوگا۔

افقؔ کی شاعری ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی عظیم تہذیب اور ثقافت کے حوالوں سے بھری پڑی ہے لیکن انکی وسیع النظری کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ انہوں نے اسلامی، مغربی اور یونانی تہذیب اور ثقافت کی مختلف روایتوں اور مختلف حوالوں کو بھی اپنی شاعری میں بے انتہا مہارت اور احترام کے ساتھ جگہ دی ہے۔ مذہبی رواداری، کثیر المذہبی احترام کا پیغام اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب ان کی شاعری کے دریا میں موجیں مارتی دکھائی دیتی ہے۔

اقؔ کی ابتدائی شعر گوئی

اردو کے زیادہ تر شعراء کی طرح اقؔ کی شاعری کا آغاز بھی غزل سے ہی ہوا بعد میں ان کا رجحان نظم، مسدس، مثنوی اور دیگر اصناف شاعری کی طرف ہوا۔ اقؔ پہلے دلؔ تخلص رکھتے تھے اور اسی تخلص سے انہوں نے اپنا پہلا شعر کہا تھا۔ رائے دیوی پرشاد بشاشؔ نے اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ شعرائے ہنود'' میں اقؔ کے دلؔ تخلص سے مندرجہ دو شعر نقل کئے ہیں:

عاشق بے ساز و ساماں سے نہ تم اے مہرباں
رشتۂ الفت نہ توڑو عہد پیماں کی طرح

***

ساتھ غیروں کے نہایا جس گھڑی وہ بہر حسن
پھٹ گیا دریا کا دل عاشق کے داماں کی طرح

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پندرہ سال کی عمر میں اقؔ نے دلؔ تخلص سے ایک تاریخ بھی لکھی تھی۔ یہ تاریخ ان کے بڑے بھائی تمناؔ صاحب کی تصنیف ''نافع صحت'' کی اشاعت کے متعلق تھی۔ بعد میں اقؔ نے دلؔ کے بجائے اپنا تخلص اقؔ رکھ لیا اور پھر اسی تخلص سے انہیں بیشمار شہرت ملی۔ یہ تخلص غالباً پندرہ سے انیس سال کی عمر کی درمیان رکھا گیا تھا۔ بشاشؔ نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ شعرائے ہنود'' کے صفحہ ۹ پر اقؔ کے متعلق لکھا ہے ''اقؔ تخلص، منشی دوارکا پرشاد لکھنوی،

خلف منشی پورن چند، مالک مطبع اخبار تمنائی، نوجوان، خوش فکر اور عالی طبیعت ہیں۔ انگریزی و فارسی میں طاق اور طرزِ سخن میں شیخ ناسخ خواجہ وزیر کے پیرو۔ شاگرد منشی شنکر دیال فرحتؔ"۔
بشاش نے افقؔ کے حسب ذیل اشعار اپنے تذکرہ کے صفحہ ۹ پر درج کئے ہیں:

یم اشک رواں میں ڈوبتا ہے مردم دیدہ
مدد یا خضر دوڑیں نوح کی کشتی ہے طوفاں میں

ہے آنسو چشم تر میں، عکس چشمہ تر ہے آنسو میں
در غلطاں صدف میں ہے، صدف ہے در غلطاں میں
لکھا ہے جا بجا ہم نے جو وصف دیدہ جاناں
نظر آئے افقؔ ہیں، صاد ہی صاد اپنے دیواں میں

***

باغ کی آب ہوا ہوتی ہے صحت بخش اگر
کس لئے نرگس کی پھر بیمار آنکھیں ہو گئیں
چشم احول سے دو چنداں لطف نظارہ ملا
اور چار آنکھیں ہوئیں جب چار آنکھیں ہو گئیں

***

نہیں معیوب گرنا میرا نظروں سے زمانہ کی
بنا ہوں حرف ساکن مطلع ابروئے جاناں کی

***

وائے صحت ہم نے صدہا کھائے پیشانی پہ زخم
خط دھلا لیکن نہ آب تیغ سے تقدیر کا

***

خاک زاہد سے اگر تسبیح کے دانے بنیں
مانگ لیں ہم رند انگلی پر نچانے کے لئے

***

جب زباں چاہتے ہیں زخم کے منہ
تیغ سے مانگ لیا کرتے ہیں

***

اس بت کافر کی پوجا کر رہے ہیں برہمن
پھول لے کر ڈھال سے، پھل خنجر فولاد سے

افق کی ابتدائی غزلیہ شاعری میں لکھنؤ بولتا نظر آتا ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں رعایت لفظی اور تشبیہات کی بھر مار ہے۔ معانی و مفہوم پر زیادہ توجہ نہیں دکھائی دیتی۔ تمام اشعار میں خیالات کی بال کی کھال نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لفظوں کا کھلواڑ زیادہ ہے۔ فنی پہلو پر توجہ کی ہے لیکن احساسات اور جذبات سے خالی ہے۔ افق کی ابتدائی شاعری میں لفظوں کی بازی گری اور خیالات کے ساتھ لفظوں کی آنکھ مچولی کی بہترین مثالیں ملتی ہیں جو ظاہر ہے دبستان لکھنؤ کا خاص وصف رہا ہے۔ ناسخ اسکول کی شاعری میں خصوصاً اس بات پر زور دیا جاتا تھا۔ مندرجہ بالا اشعار میں مختلف صنعتوں کا استعمال ہوا ہے زیادہ تر شعروں میں صنعت تضاد یا بے جوڑ صنعتوں کا بیان ہے مثلاً پھول اور ڈھال، پھل اور خنجر۔ صنعت موافق، یعنی جوڑ والی صنعتوں جیسے جام و مینا، گل و بلبل وغیرہ کا بیان کم ہے۔

غزل

افق کا پورا غزلیہ کلام دستیاب نہیں ہے لیکن جو کلام سامنے ہے اس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انکی بعض غزلیں تشبیہات استعارات، تلمیحات کے اعتبار سے بہت اچھی ہیں۔ غزل کے میدان میں افق کسی خاص شاعر کے مقلد نہیں تھے۔ ان کی شروعاتی دور کی غزلوں میں لکھنؤ کے ناسخ اسکول کی شاعری کا اثر جھلکتا ہے بعد میں انہوں نے امیر مینائی اور داغ کے رنگ میں بھی غزلیں کہیں۔ اپنے زمانے کی شاعری کی خصوصیات کے مطابق افق کی غزلوں میں زبان اور بیان کی خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں تغزل، معاملہ بندی، رنگینی اور شوخی کی نایاب مثالیں ملتی ہیں۔ انکی غزلوں میں نرمی اور مٹھاس برابر ملتی ہے اور وہ پراثر بھی ہیں۔ افق رومانیت پسند ہیں اور غزل کو عشق کی واردات کا اظہار کرنا سمجھتے ہیں لیکن ان کی غزلوں میں عشق کا پاکیزہ جذبہ موجزن ہوتا رہتا ہے۔ جذبات کی صداقت، گہرائی اور گیرائی کو افق بیحد سلیس لیکن پراثر ڈھنگ سے شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھئے:

ہمارے زخم میں ٹھنڈک لہو سے ہوتی رہتی ہے
تسلی دل کی تکلیف رفو سے ہوتی رہتی ہے
نہیں تکلیف سے خالی کسی کا پھولنا پھلنا
شجر پر سنگ باری چار سُو سے ہوتی رہتی ہے
زمانہ قدرداں ہوتا ہے صورت اور سیرت کا
گلوں کی قدر جیسے رنگ و بو سے ہوتی رہتی ہے

افق کی میکشی کی حافظ شیراز کی صورت
زمانہ بھر میں شہرت لکھنؤ سے ہوتی رہتی ہے

***

تغزل اردو غزل کی جان کہی جاتی ہے۔اس میں معشوق کی اداؤں کے بارے میں اس کی چال ڈھال کے بارے میں اور عاشق اور معشوق کے آپسی تعلقات کا خاص طور سے بیان ہوتا ہے۔غزل کی یہ خوبی دکنی اُردو غزل میں تو کم دکھائی دیتی لیکن جیسے جیسے اردو غزل گوئی میں نکھار آتا گیا ویسے ویسے یہ سب خصوصیت دلی اور لکھنؤ کی اردو شاعری کے اسکولوں میں بخوبی عیاں ہونے لگی۔ان اسکولوں کی غزلوں میں فارسی کا غلبہ تھا ان میں تشبیہات، تلمیحات اور استعارات سب فارسی شاعری سے لئے گئے تھے۔میر تقی میر کے زمانہ سے ہمیں اردو غزل میں تغزل کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔افق کی غزلوں میں بھی تغزل پایا جاتا ہے جو دراصل غزل کی روح ہے۔معشوق کی آنکھوں میں تیزی سے بدلتے ہوئے مختلف انداز اور مختلف طور پر عیاں ہوتے ہوئے جذبات کی منظر کشی کرتے ہیں افق کہتے ہیں:

کبھی شوخی ، کبھی مستی، کبھی غصہ، کبھی شرم
نہیں معلوم ان آنکھوں میں تیری کیا کیا ہے

***

تغزل سے پر افق کے کچھ اور اشعار سے بھی لطف اندوز ہوں:

دل پے قابو نہیں کچھ چاہے جس پہ آ جائے
چاند سا بدن، سانولی صورت کیسی

***

پتلیاں سانولی صورت پہ فدا رہتی ہیں
نظر منتظر چشم وفا رہتی ہیں
کہتے ہیں دیکھ کے آئینہ جو کرتے ہیں سنگار
آج ہم نور کے سانچے میں ڈھلے جاتے ہیں

***

سوزش عشق کا ہے دشت نوردی میں جو پاس
آبلے آنکھ کف پا پہ ملے جاتے ہیں

حالانکہ افقؔ کا فطری رجحان، اندرونی جذبات کی عکاسی کی طرف تھا اور ان کی غزلوں کے اشعار داخلیت سے لبریز ہیں لیکن اپنے دور کی لکھنؤ کی شاعری جس کی خاصیت خارجیت تھی اور جس میں باہر کے جذبات اور بناوٹی جذبات کو شعری پیکر دیا جاتا تھا یہی اکثر مزاج پر حاوی ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر لکھنؤ اسکول کی شاعری سے متاثر انکے کچھ اشعار پیش ہیں۔ ان اشعار میں بھی زبان کی صفائی، لوچ اور سلاست دیکھنے کے قابل ہے:

مجھ پہ ظلم اور رقیبوں پہ عنایت کیسی
جس میں ہو دخل رعایت وہ عدالت کیسی
میل ہو جانے پہ اے جان شکایت کیسی
ہو گیا صاف جب آئینہ کدورت کیسی

***

آئی صبا جو کوئے صنم سے چلی ہوئی
گل پھولے، عندلیب کی قسمت بلی ہوئی
کیا حال ہجر ہم کو سناتے ہو عاشقوں
یہ تیغ ہے ہمارے گلے پر چلی ہوئی

***

جرم بخشی کی تمنا میں عبادت کیسی
منصف اللہ ہے اس کے لئے رشوت کیسی

***

روئے صنم صفائی سے آنے لگا نظر
احسان آئینہ پہ ہے میرے غبار کا
میں جو کھنچواؤں گا نقشہ پہ پریزاد کے ہاتھ
ہاتھ تصویر کے بک جائیں گے بہزاد کے ہاتھ

میری تصویر سے بھی رعشۂ تن کا ہو ظہور
کانپے اللہ کرے مانی و بہزاد کے ہاتھ
کیا کہیں برہمنوں ہم بھی نجومی نہ ہوئے
دیکھتے خوب بتان ستم ایجاد کے ہاتھ
صرف دامن میرے ہاتھوں کو بنایا پس مرگ
چومتا ہوں لب تصویر سے بہزاد کے ہاتھ

***

رہتی ہیں بادلوں کے عوض آنکھ اشک بار
دنیا میں ایک بس یہی برسات رہ گئی
دشمن ملے، رقیب ملے محتسب ملے
محفل میں صرف ان سے ملاقات رہ گئی

عاشق اپنے عشق میں کتنا صادق ہوتا ہے اس نازک سی بات کو افق نے لکھنؤ کی غزلیہ شاعری کی سیدھی سادی زبان میں کس طرح کہا ہے دیکھئے:

جوہری جس کا نہیں در عدن ہی کیا ہے
باغباں جس کا نہیں ہے وہ چمن ہی کیا

***

جس طرف دیکھئے آتے ہیں نظر اہل جمال
بڑھ گئی اے میرے یوسف تیری امت کیسی

***

عاشقی کا جو ہے اس شمع سے رشتہ مجھکو
غیر کیا رشک سے پروانے جلے جاتے ہیں

***

اے افق رنگ صفائی نہیں جس محفل میں
ہم وہاں صرف دکھاوے کو چلے جاتے ہیں

لکھنؤ کے اردو شعراء نے اپنی غزلوں میں زبان کی صفائی، لوچ، سلاست اور سادگی کا برابر خیال رکھا ہے۔ افق کی غزلوں میں یہ خوبیاں خصوصی طور پر ابھر کر آئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی غزلوں کے یہ شعر پیش ہیں:

صراحی خم کرے گردن اٹھیں تعظیم کو ساغر
افق مسجد میں سجدہ کر کے میخانہ میں آتا ہے
جو عالی ظرف ہیں جھک جھک کے کم ظرفوں سے ملتے ہیں
صراحی سر جھکاتی ہے جو خالی جام آتا ہے

***

ہمارا بھولا پن دیکھو جب آئی آخری ہچکی
محبت میں یہ ہم سمجھے وہ ہم کو یاد کرتے ہیں

***

جو نکلا حلق سے تیر اس ناوک افگن کا
بغل سے دل بدن سے روح سینے سے جگر نکلا

***

بند کرتے نہیں جو غیر کا آنا جانا
لو میری جان ہمیں اٹھ کے چلے جاتے ہیں

***

اپنے ہمعصر داغ، امیر مینائی اور جلال جیسے شاعروں کا انداز بیان بھی افق کی غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ داغ کا لہجہ طنز اور شوخی کا رنگ افق کی آسان لیکن چٹیلی زبان میں دیکھئے:

دم میں پھر جائے جو وہ چشم عنایت کیسی
ایک نقطہ سے جو زحمت ہو وہ رحمت کیسی
جرم بخشی کی تمنا میں عبادت کیسی
منصف اللہ ہے اس کے لئے رشوت کیسی

دل پہ قابو نہیں کچھ چاہے جس پہ آ جائے
چاند سا کیسا بدن سانولی صورت کیسی
***

آپ قاتل ہے یہاں بالوں کا ہے گل قاتل
قاتل آنکھوں کی نظر آنکھ کا ہے تل قاتل
مردم دیدہ ہے قاتل کے مقابل قاتل
دائیں بائیں ہیں یہ دو آنکھوں میں قاتل قاتل
***

عمر کیوں زہد میں اے شیخ گنوائیں عشاق
حور دنیا میں جو مل جائے تو جنت کیسی
***

ساتھ میرا جو ہوا حور پہ مرنے لگے شیخ
جلد انساں پہ اثر کرتی ہے صحبت کیسی
شیخ تم حور پہ ہم اپنے صنم پر قرباں
خود فصیحت ہو تو اوروں کو نصیحت کیسی
***

شکل خدا بتوں میں نظر آئے شیخ جی
سرمہ لگائے جو ہمارے غبار کا
***

رات دن اپنے گناہوں کو گنا کرتے ہیں
صبح گرداں نہیں بے فائدہ زہاد کے ہاتھ
لیں گے تسبیح یہ پڑھ پڑھ کے نماز ساقی
آب انگور سے دھو دیجئے زہاد کے ہاتھ
***

سونا نہ عاشقوں کو کبھی حشر تک ملے
بند آنکھ ہو مگر نہ پلک سے پلک ملے
تاریخ نظم شمس و قمر مجھ سے کر بیاں
یہ داغ کس کے غم میں تجھے اے فلک ملے
خوب آزمائش زیر تقدیر ہم کریں
گر آستانہ سنگ صنم کی مہک ملے

غزلوں میں افقؔ صرف جذبات کی دنیا تک ہی محدود نہیں رہتے انہوں نے اپنے غزلوں میں تخیل کے دامن کو ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑا۔ مثال کے طور پر ان کے حسب ذیل اشعار دیکھئے، جن میں معرفت اور فلسفہ الٰہیات کے طرح طرح کے خیالات ملتے ہیں:

زمانہ اپنا تھا، اپنا برابر جب زمانہ تھا
تھا ربط و ضبط قسمت سے فلک سے دوستانہ تھا
جہاں گلزار میں چنتے ہو تم بکھرے ہوئے تنکے
کبھی میرا بھی واں اے ہم صفیروں آشیانہ تھا
طیور باغ کیوں صیاد تیرے جال میں پھنستے
وہاں تقدیر لے آئی جہاں کا آب و دانہ تھا
پھڑکتے بھی نہ پایا طائر جاں نیم لبسمل میں
غضب کی نوک ناوک تھی قیامت کا نشانہ تھا

***

اجاڑ کر نہ میرے باغ کو خزاں اِترا
پھریں گے ایک نہ ایک روز پھر بہار کے دن
کوئی نوشتہ قسمت کے رمز کیا سمجھے
بھلے برے افقؔ آتے نہیں پکار کے دن

***

نہ اگر پھول جہاں میں لقب گل ہوتا
شیفتہ گل پہ نہ ہرگز دل بلبل ہوتا

***

افق کی شاعری میں داخلیت کا اثر برابر دکھائی دیتا ہے انہوں نے صوفیوں کے فلسفوں سے متاثر ہو کر بھی کچھ بہترین شعر کہے ہیں، حسب ذیل اشعار دیکھئے:

ارے مست خوابِ غفلت ہے وہ خواب گاہ دنیا
نہ کھلیں دوبارہ آنکھیں اگر ایک بار سو جا

***

ہم ہیں فقیر ہم کو نہیں فکر ساز و عیش
بیٹھے جہاں بھی چھاؤں وہیں ہے ڈھلی ہوئی

***

قناعت کرتی رہتی ہے جو سیپی ابر نیساں پر
بسر در عدنکی آبرو سے ہوتی رہتی ہے
کلی سے پھول ماہ نو سے مہوش بدر بنتے ہیں
ترقی عمر کی سن نمو سے ہوتی رہتی ہے

وحدۃ الوجود صوفی فلسفہ کا ایک اہم اصول ہے جس کا مطلب ہے کہ دنیا میں صرف خدا کا ہی وجود ہے اسی کی اکیلی ایک ذات ہے یہی دراصل سچ ہے اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ صوفی فلسفہ کو ماننے والے سبھی چیزوں میں خدا کا وجود مانتے ہیں اور خدا کے عشق میں ڈوب کر خدا سے ایک ہو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہبی اختلافات، کفر، ایمان، ذات، پات کے سبھی بندھن انکے لئے کوئی معنیٰ نہیں رکھتے، سِرّیت کی اس حقیقت کو افق نے اپنے حسب ذیل شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

دیر میں، کعبہ میں، گرجا میں تجھی کو دیکھا
دنگ ہوں یا میرے اللہ یہ وحدت کیسی

یار نے گر مجھے اے مرگ نہیں یاد کیا
آئی ہے پھر مجھے ہچکی دم رحلت کیسی

افقؔ کے کچھ اور صوفیانہ رنگ کے اشعار دیکھئے جن میں فلسفہ تصوف کے مختلف مدارج کو بہت اچھی طرح واضح کیا گیا ہے:

غرق دریائے فنا ہوں یہ مجھے کیا معلوم
کسے کہتے ہیں کفن ہوتی ہے تربت کیسی

***

آتے ہستی میں ہو کیوں اے مرے یاران عدم
خاک میں ملنے سے تم لوگوں کو ملتا کیا ہے

***

طلبی کی عدم آباد میں کس یوسف نے
بند آنکھیں کئے سب لوگ چلے جاتے ہیں

***

آتش طور میری آہ کے شعلوں کو کہا
لن ترانی کی تھی موسیٰ کو بھی عادت کیسی

***

دیکھو گردش کی نظر ڈھونڈ رہی ہے پھر بھی
گو نگاہوں میں پھرا کرتا ہے مسکن ان کا

***

افقؔ صاف طور سے کہتے ہیں کہ حق کی راہ پر چلنے والے حق کو اپنی عبادت سے حاصل کرتے ہیں اور اسی کے مطابق انہیں احساسات ہوتے ہیں۔ حق ایک ہے یا اس کے کئی شکلیں ہیں اس کا علم ریاضی کو اپنے ذاتی احساسات کی بنا پر ہی ہوتا ہے۔ افقؔ کہتے ہیں:

وہی آئے نظر جس بھاؤنا سے جو کوئی دیکھے
کوئی کثرت میں وحدت، کوئی وحدت میں دوئی دیکھے

***

پہچاننے نہ پائے تیری شکل کیا کریں
آنکھیں کھلی نہ تھیں ہمیں جب مردمک ملے

افقؔ نے اخلاقیات کے متعلق بھی کچھ بہترین شعر کہے ہیں جو کہیں تو محاوروں کی شکل لے لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وقت کے سماجی ماحول کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کیا کہ ہندوستانی سماج میں مختلف قسم کی برائیاں گھر کر گئی ہیں اور اخلاقی قدروں کو قائم کر کے ہی سماج میں مطلوب بہتری لائی جا سکتی ہے۔ افقؔ اپنے مخصوص انداز میں طرح طرح کے سماجی اور اخلاقی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور پراسرار انداز میں نصیحت بھی کرتے ہیں۔ جہالت اور لاعلمی جو تمام مسائل کی جڑ ہے اس کو دور کرنے میں سماج کی ذمہ داری اہم ہے اس کا احساس افقؔ اپنے اشعار میں برابر دلاتے رہتے ہیں کچھ اشعار نمونہ کے طور پر پیش ہیں:

غافل کو لاؤ ہوش میں یہ جان کر افقؔ
اندھے کو راستہ نہ بتانا گناہ ہے

***

تکبر، غرور اور سرکشی آدمی کو اتنا اندھا بنا دیتے ہیں کہ اسے حقیقت اور غیر حق میں کوئی اختلاف نہیں دکھائی دیتا۔ مغرور آدمی گھمنڈ کے نشہ میں چور ہو کر اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا ہے اور بعد میں اپنے کئے پر پچھتاتا ہے۔ دیکھئے مغرور اور سرکشی پر آمادہ آدمی کو افقؔ کس طرح سمجھاتے ہیں:

افقؔ انسان کی ذلت ہے زعم خود پرستی میں
غبار دیکھو اونچے ہو کے گر پڑتے ہیں پستی میں

***

اے افقؔ چھوڑا نہیں مغرور کو تعذیر نے
شمع کا گل جب بڑھا کاٹا گل تدبیر نے

***

دیکھ لو شاخ ہے اونچی تو ثمر نیچا ہے
اے افقؔ یوں ہی بڑے بول کا سر نیچا ہے

افقؔ کا ماننا ہے کہ سماج کی ترقی تب ہی ممکن ہے جب سبھی لوگ اخلاقی اصولوں کو قائم رکھیں اور انہیں کے مطابق زندگی جئیں۔ ایک خوبصورت زندگی جینے کے لئے ہر فرد کو اپنا دل صاف رکھنا ضروری ہے۔ کسی کے لئے بھی دل میں رنجش یا کشیدگی رکھنے سے سماجی رشتوں پر برا اثر پڑتا ہے اور آپس کے تعلقات میں درار پڑ جاتی ہے۔ دل کی صفائی کی اہمیت اور دل میں میل رکھنے سے پیدا برائیوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے افقؔ کہتے ہیں کہ صاف دل انسان ہر طرح سے قابل قدر رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

ہے کدورت سے زمانے میں صفائی اچھی
صاف آئینہ میں صورت نظر آئی اچھی

***

جو بگڑتا ہے بگڑ جاتی ہے صورت اس کی
اندھا آئینہ کو کرتی ہے کدورت اس کی

اخلاقیات کے متعلق افقؔ کے کچھ اشعار دیکھئے جن سے بہتر زندگی جینے کے بارے میں نصیحت ملتی ہے:

صلح کر لیتی ہے اپنا دشمن خونخوار کو
میاں رکھتی ہے کلیجہ میں افقؔ تلوار کو

***

افقؔ کس نے کیا ہے راستی سے ٹھیک دشمن کو
ہو کیا سیدھا ہتھوڑے سے اگر پیٹیں نہ آہن کو

***

لکھنؤ اسکول کے اہم شاعر ہونے کی وجہ سے افقؔ کی غزلوں کے اشعار میں محاوروں کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی غزلوں کے کچھ اشعار

پیش ہیں:

ہجر کیا کیسی جدائی، شب فرقت کیسی
لایئے سر پہ اٹھا لوں ہو مصیبت کیسی

***

غم ہے محرومیٔ دشمن کا میرے وصل کے دن
ہاتھ مہندی کے بنانے میں ملے جاتے ہیں

***

حق وصف کیونکر قلم سے ادا ہو
بھلا بند مٹھی میں کیونکر ہوا ہو

***

بھولے ہوؤں کی یاد ہوئی حشر میں اقتؔ
پھر آ گئی بلا میرے سر سے ٹلی ہوئی

***

ہے مرغ جاں تپاں قفس جسم زار میں
ہاتھوں کے طوطے اڑنے لگے انتظار میں

***

چوما جو ہے قدم فرس شہسوار کا
ہاتھوں اچھل رہا ہے کلیجہ غبار کا

***

مانع عشق کوئی لاکھ ہو ہوتا کیا ہے
ہم جو مرتے ہیں کسی پر تو کسی کا کیا ہے

***

جان شیریں لب شیریں پہ جو دیتے ہو اقتؔ
نہیں معلوم کہ اس میں تمہیں میٹھا کیا ہے

دماغ اہل خودی کا خلل نہیں جاتا
افقؔ جو رسی جلے بھی تو بل نہیں جاتا

***

افقؔ کی طرحی غزل

افقؔ نے ایک طرحی غزل نظام حیدر آباد دکن میر محبوب علی خاں کے دربار میں منعقد ایک طرحی مشاعرہ میں پڑھی تھی، جسکا مصرعہ طرح تھا "الٰہی ایسی مصیبتوں میں شباب ہم لے کے کیا کریں گے" غزل حسب ذیل ہے :

سوال بوسے کا جائے بوسہ جواب ہم لے کے کیا کریں گے
جو چیز اچھی ہو دیجئے وہ خراب ہم لے کے کیا کریں گے

الف ہے قد عین چشم جادو دہن ہے میم اور لام گیسو
ہے عہد طفلی میں مشق الفت شباب ہم لے کے کیا کریں گے

سمند عمر اپنے زیر راہ ہے نہ زین ہے یاں نہ یاں عناں ہے
یہ جب ہے پھر حلقہ لحد سے رکاب ہم لے کیا کریں گے

جو خط اول میں روز اول پڑھا فراق صنم کا مضمون
یہ روئے یہ چلائے دیدۂ تر کہ خواب ہم لے کے کیا کرینگے

نہ روز وصلت لجاؤ صاحب ذرا تو آنکھیں ملاؤ صاحب
مذاق ہو بے تکلفی ہو، حجاب ہم لے کر کیا کریں گے

خدا سے کہتے ہیں تیرے بندے ہٹائیں قرآن کو سامنے سے
رخ کتابی ہے پاس اپنے کتاب ہم لے کے کیا کریں گے

سیاہ دیکھی جو فرد عصیاں تو نکیر و منکر لحد میں بولے
تیرے گناہ بے حساب ہیں جب حساب ہم لے کے کیا کرینگے

بہے جو مقتل میں میرے آنسو تو بول اٹھا قاتل جفا جو
زبان خنجر ہے خوں کی پیاسی یہ آب ہم لے کر کیا کریں گے
بہشت حوروں سے اپنا گھر ہے ذرا نہیں خدشہ شقر ہے
طواف حج شیخ کو مبارک ثواب ہم لے کے کیا کریں گے
کہو تو دل شیخ جی کا توڑیں مئے کہن حلق میں نچوڑیں
شکست توبہ سے اپنے سر پر عذاب ہم لے کے کیا کریں گے
گہر کی دریا دلی کے صدقے یہ جوش دریا سے کہہ رہا ہے
کریں نہ تکلیف ادھر کو موجیں کہ آب ہم لے کے کیا کرینگے
نظام نے داد دی غزل کی زبان سے تعریف برمحل کی
افق اس اعزاز کے مقابل خطاب لے کے کیا کریں گے

یہ طرحی غزل نظام دکن میر محبوب علی خاں کے حضور میں پڑھی گئی تھی۔ جسے نظام مرحوم نے مجمع عام میں سن کر قابل تعریف قرار دیا تھا دوسرے روز چوبدار کے ذریعہ یہ غزل طلب فرمائی مقطع صدور حکم کے وقت تصنیف کیا گیا تھا۔ اس نشست میں داغ دہلوی بھی موجود تھے۔

افق کی غزلوں میں سیاسی رنگ

افق کی چند یک قافیہ غزلیں :

یہ حقیقت ہے کہ افق نے اپنی شاعری کے فن کو غزلوں کے میدان تک محدود نہیں رکھا لیکن ان کی کچھ غزلیں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے اعتبار سے بطور خاص قابل غور ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک قافیہ غزل جس میں محبوب کے محاسن کو علامات حضرت علی سے تشبیہ دی گئی ہے اردو غزلیہ شاعری میں نادر چیز ہے۔ افق کی یہ غزل اور کچھ اور غزلیں شجاعت کے بیان کی ہیں جو ان کی کامیاب کوشش ہے۔ اردو غزلیہ شاعری میں ویر رس نہ ہونے کے برابر ہے۔ شعر تو مل سکتے ہیں لیکن غزلیں نہیں۔ اس لئے بھی کہ اردو غزلیہ شاعری علامتی ہوتی ہے اور ویر رس کے بیان کے لئے علامتی نہیں واضح اور صاف ستھرا بیان چاہئے۔ اردو غزل کی

جان تغزل ہے۔جس میں ہجر اور وصال کا بیان خاص طور سے ہوتا ہے ویررس کی وہاں گنجائش نہیں۔ افقؔ اس دور کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مخالفت میں چھٹپٹاہٹ زور پکڑ رہی تھی۔ حالانکہ مہاتما گاندھی ہندوستان کے سیاسی پردہ پرنہیں آئے تھے لیکن اس وقت کی سیاسی سرگرمیوں میں بحیثیت ایڈیٹر بھی افقؔ اپنا رول ادا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کھلے طور پر انگریزوں کی مخالفت کرنے کی سزا عمر قید، کالا پانی اور پھانسی ہوا کرتی تھی۔محمد حسین آزاد کے والد محترم محمد باقر دہلوی نے اپنے اخبار میں انگریزوں کی مخالفت میں لکھا تھا جس کی سزا انہیں یہ دی گئی تھی کہ دہلی کے رام لیلا میدان میں سرعام پبلک کی آنکھوں کے سامنے انہیں پھانسی دیدی گئی تھی۔ انگریزی حاکم ہندوستان میں خوف کا ماحول بنائے ہوئے تھے جس سے انکے خلاف لکھنے یا بولنے کی کوئی جرأت نہ کر سکے۔ایسے ماحول میں ادیبوں اور دانشوروں نے اور سماجی مصلحوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اپنی سماجی ذمہ داری سمجھتے ہوئے انگریزوں کی مخالفت کی مہم جاری رکھی اور عوام میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ کو پھیلانے کی کوشاں رہے۔غالباً انہیں حالات کا اثر تھا کہ افقؔ نے حب الوطنی کے جذبہ کے تحت مسدس لکھنے کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا جذبات سے سرشار کچھ غزلیں کہیں جن میں ویررس خاص طور سے نمایاں ہوتا ہے۔شجاعت کے بیان سے بھری ہوئی ان کی تین غزلیں دستیاب ہیں۔اس طرح کی پہلی غزل ایک قافیہ غزل ہے۔جس میں محبوب کو حضرت علی سے تشبیہ دیکر اونچے خیالات اور تصورات پیش کئے گئے ہیں۔غزل قارئین کی نظر کی جاتی ہے:

مدت کے بعد میان میں تیغ علی ہوئی
ٹھہری خدا کے راہ میں برسوں چلی ہوئی

سختی دل سے روک رہا ہوں نظر کا وار
تیغ علی وہ تھی تو یہ ناد علی ہوئی

صورت ہے سنگ اسود کعبہ سے امن کی
یہ سل زمیں کے واسطہ ناد علی ہوئی

کرتی ہے ایک وار میں اغیار کو ہلاک
شمشیر آہ کیا ہوئی تیغ علی ہوئی

اس غزل کے تمام اشعار میں ناد علی کی روایت کو استعمال کر کے شاعر نے اپنے حسن بیان کا ایسا ثبوت پیش کیا ہے جو اردو غزلیہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مثال کے طور پر غزل کا یہ شعر:

اغیار نے کیا مجھے راہ صنم میں قتل
یہ موت بھی شہادت ابن علی ہوئی

یہاں اغیار سے انگریز اور راہ صنم سے آزادی کی راہ مراد ہے۔ اس پوری کیفیت کو شہادت ابن علی (امام حسین) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ناد علی ہر مرض کی دوا ہے پھر بھی وہ محبوب کی راہ میں کارگر نہ ہو سکی۔ یہ انتہائی بلند تصور ہے۔ تیغ، ذوالفقار، تشنہ آب، سنگ کعبہ، اغیار یہ الفاظ شاعر کے یہاں علامت ہیں۔ انہیں علامتوں کے سہارے حضرت علی سے متعلق تقریباً ساری روایتوں کو اس غزل میں پرو دیا گیا ہے۔

افق لکھنوی نے ۲۴ اشعار کی ''ایک قافیہ غزل'' میں بھی ویررس کو بیان کیا ہے جو یقیناً ان کی کامیاب غزل ہے۔ شاعر کا حسن بیان یہ ہے کہ غزل کی علامتوں میں ویررس کو بیان کیا گیا ہے، غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

چوما ہے جو قدم فرس شہسوار کا
ہاتھوں اچھل رہا ہے کلیجہ غبار کا
پائے سوار اتر کے ملک چومیں ضرور
بام فلک سے مل گیا زینہ غبار کا
کمتر نہ خاکساروں کو اے تند خو سمجھ
گردوں پہ اڑ رہا ہے پھریرا غبار کا
کی ہے جگہ جو دیدہ محبوب یار میں
مطلب کچھ اور ہوگا ہمارے غبار کا
صحرا میں خاک اڑانا ہے بن بن کا گردبار
کچھ آج سر پھرا ہے ہمارے غبار کا

گھوڑا ذرا بچا کے چلو گردباد میں
دیکھو نہ پھوٹ جائے پھپھولہ غبار کا
بے وجہ دوڑ دھوپ نہیں گردباد کی
ہے روح کی تلاش میں قالب غبار کا

اس غزل میں استعمال ہوئے الفاظ سمند، کشتہ، شیخ، مقدر، صنم، خانہ کعبہ، مانی، مجنوں، نوشتہ، یوسف، گلال، اکسیر، روح، قالب، عنان، ابر یہ سب الفاظ اردو غزلیہ شاعری کے ہیں جو شاعر نے شجاعت کو بیان کرنے کے لئے علامتی طور پر استعمال کئے ہیں۔ مثال کے طور پر غزل کا یہ شعر:

خاک قدم بنائے جو تصویر یار میں
مانی لگائے رنگ ہمارے غبار کا

یہ شعر پوری طرح سے غزل کی علامتی زبان میں ہے لیکن غبار لفظ کا استعمال ویر رس کی علامت ہے۔ اس غزل کے کچھ اشعار میں ایمائی اور اشارتی انداز میں انگریزوں کی مخالفت کی جذبہ کی عکاسی ملتی ہے۔ خاص طور پر یہ تین اشعار:

کمتر نہ خاکساروں کو اے تند خو سمجھ
گردوں پہ اڑ رہا ہے پھریرہ غبار کا
صحرا میں خاک اڑانا ہے بن بن کے گردبار
کچھ آج سر پھرا ہے ہمارے غبار کا
بے وجہ دوڑ دھوپ نہیں گردبار کی
ہے روح کی تلاش میں قالب غبار کا

آخری شعر سے معنی مراد ہے کہ آزادی کی چاہت میں قربانی دینا بے مقصد نہیں ہے۔ جاں نثاروں کا غبار ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔

افق کی تیسری ایک قافیہ غزل بھی زبان و بیان کے اعتبار سے یقیناً بہت اچھی ہے۔ اس غزل میں بھی ۲۴ اشعار ہیں اور اس غزل کے مطلع اور بعض اشعار میں انگریزوں کی مخالفت

صاف جھلکتی ہے مثال کے طور پر غزل کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے:

آج مشکل ہے کہ پالا رہے جلاد کے ہاتھ
یاں سے پتھر کا جگر واں جو ہیں فولاد کے ہاتھ
بلبل و گل کو گلستاں سے جدا کرتے ہیں
دست گلچیں ہوں قلم خشک ہوں صیاد کو ہاتھ
میرے جلاد کی پہچان یہ ہے اے قاصد
آنکھ طوطے کی ہے، دل سنگ کا، فولاد کے ہاتھ
کوہکن کو نہ فقط خاک کا پتلا جانو
آب کے پاؤں تھے آتش کا جگر، باد کے ہاتھ

اقؔق کی کچھ اور غزلیں بھی آزادی کی جدوجہد سے متعلق ہیں جس میں سیاسی رنگ جھلکتا ہے۔ ان غزلوں سے انگریزوں کے ظلم وستم کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکنے کے اور ہمت سے مقابلہ کرنے کا پیغام صاف ظاہر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ان کی یہ غزل دیکھئے:

جب ہمیں جوش جنوں سوئے بیاباں لے چلا
شہر سے ہمراہ اپنے فوج طفلاں لے چلا
ظلم سے تیرے ہمیں غم جان جانے کا نہیں
ہم نشانہ پر کھڑے ہیں، تیر تو ہاں، لے چلا
جان لے لیکر ہتھیلی پر چلے لاکھوں شہید
سوئے مقتل جب وہ اپنی تیغ براں لے چلا
اور امیدیں بر آئیں فضل خالق سے اقؔق
پھر بھی غم ہے دل کہ میں دل میں ہی ارماں لے چلا

اس غزل سے وطن پرست نوجواں میں یہ پیغام صاف پہنچتا تھا کہ آزادی پانے کے لئے وہ خوشی خوشی اپنی جان قربان کرنے کیلئے تیار رہیں اور کسی بھی طرح کے ظلم ان پر ڈھائے

جائیں وہ اس مہم میں کبھی ہمت نہ ہاریں ہیں۔غزل کے مقطع میں شاعر نے آزادی کی امید کو دنیا کے سبھی خواہشوں سے زیادہ توجہ دی ہے انکا کہنا ہے کہ خدا کے فضل سے زندگی کی ساری امیدیں برآئی تھیں لیکن آزادی کی تمنا ابھی تک ہے اور یہ آرزو ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے۔

افقؔ نے حب الوطنی کے جذبہ کے تحت ایک اور غزل بھی کہی جو اس وقت آزادی کے دیوانے نوجوانوں کی ذہنی کیفیت کو بیان کرتی ہے۔افقؔ کی ان غزلوں میں رجائیت ملتی ہے جو اس وقت کے حالات میں عوام کے ایثار و قربانی کا ماحول بنانے اور انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے حوصلہ افزائی کے لئے نہایت ضروری تھا۔غزل کے کچھ اشعار دیکھئے:

برائے دشت گردی بخت کے چکر سے جاتے ہیں
رہو تم شاد اے اہل وطن ہم گھر سے جاتے ہیں
نوید اے خار صحرا مژدہ دشواری منزل
کہ ہم راہ وفاداری میں چشم و سر سے جاتے ہیں
کہاں گم گشتہ راہ سعادت ہیں، ادھر دیکھیں
جو چلتے ہیں نگاہوں میں وہ اس تیور سے جاتے ہیں
جلو میں فوج غم ہے، اردلی میں لشکر و عسرت
بیاباں میں افقؔ ہم ایسے کروفر سے جاتے ہیں

اپنے زیرادارت شائع ہوئے نظم اخبار میں تو افقؔ نے صاف لفظوں میں انگریزی سرکار اور اس کی پالیسیوں کی مخالفت کرنا شروع کردی تھی۔ان میں سے کچھ نظمیں طنز و مزاح کے لہجہ میں لکھی گئی ہیں جن کو پڑھنے سے قاری زیر لب مسکراتا رہتا ہے اور شاعر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔حسب ذیل غزل افقؔ کے نظم اخبار کے نمبر ۱۰ جلد نمبر تین میں ۲۰ مئی ۱۸۹۰ء کو شائع ہوئی تھی۔یہ اپنے ڈھنگ کی انوکھی غزل ہے جس سے افقؔ کے زبان اور بیان پر قدرت کاملہ بھی ثابت ہوتی ہے۔اس غزل میں انگریزی حکومت کی پالیسیوں پر طنز کیا گیا ہے۔یہ ایک انوکھی غزل ہے جس میں حروف تہجی کے حروف کو سامنے رکھ کر غزل کہی گئی ہے:

اس روایت اس ستم پر لام و عین و نون و ت
(لعنت)
ہند مفلس صاحب زر ی و واؤ ، ر و پ
(یورپ)
جیب سے بار نکالو ہند والوں ز و ر
(زر)
آتی ہے ہندوستاں میں میم، لام، کاف و ہ
(ملکہ)
ہو اگر توہین گرجا تو ہے جیم و ر و میم
(جرم)
حق بجانب ہو خود گر میم، نون و دال و ر
(مندر)
نیک ہو اس کے لئے ہے شین، گ و واؤ و نون
(شگن)
رکھ لے جو اپنے شکم میں چ و نون و دال و ہ
(چندہ)
جان لیوا جب سے ہے ہر اک کاٹ، ی، کاف، سین
(ٹیکس)
پیٹ پچکائے ہوئے رہتی ہے جیم و ی و ب
(جیب)
زندگی میں پائیں سب الفت کا پ و ہ و لام
(پھل)

ہند کا میوہ نہ گر ہو پ، ہ، واؤ، ٹ
(پھوٹ)
کیا بیاں ہو زور انگریزوں کا و ص و ف
(وصف)
پھاڑتے ہیں اہل ہندوستاں کی ت ، ی لام و ی
(تلی)
مشتہر جب سے ہوئی ہے قید میم و ڈال و لام
(مڈل)
دودب پڑکی کا ہے نون و واؤ و کاف و ر و ی
(نوکری)
کیوں نہ ہندوستاں میں ہو قہر قاف و ح و ط
(قحط)
جانب یورپ چلا جاتا ہے غین و لام و ہ
(غلہ)

اسی طرح افق نے ایک پولیٹکل نوحہ بھی لکھا جس میں برطانوی حکومت کی پالیسیوں پر سیدھے سادہ چوٹ کی گئی تھی۔ برطانوی حکومت کی فارن پالیسی پر بھی طنز کرنے سے افق نہیں چوکے۔ اس وقت کے ہندوستان کی سیاسی ماحول میں اپنے اخبار کے ذریعہ انگریزی حکومت کی مخالفت درج کرانا واقعی ہمت کا کام تھا۔ پولیٹیکل نوحہ کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

کہتا ہے ہر اک ہند میں دے دے کہ دہائی اے وائے دریغا
تقدیر کیا کرتی ہے کس درجہ برائی، اے وائے دریغا
اللہ کرے ٹیکس کی جڑ پیڑ سے ہو ناس کچھ بھی نہ رہا پاس
کمبخت نے لی گاڑے پسینہ کی کمائی اے وائے دریغا
کابل کا بھرا پیٹ ہمیں فاقوں سے مارا سوکھا ہی اتارا
دولت تھی جو کچھ پاس وہ برما میں گنوائی ، اے وائے دریغا

جو کانگریس سے ڈرے جاتے ہیں وہ بد ہیں، پابند حسد ہیں
کج فہمی سے چھونے نہیں دیتے ہمیں ڈھائی، اے وائے دریغا
اے ہندیوں پھر صرفہ جنگ آتا ہے سر پر ہوگی طلب زر
سرکار کو کرنا پڑی تبت پہ چڑھائی، اے وائے دریغا
گھر لٹ گیا لوگوں کے برے حال ہوئے ہیں کنگال ہوئے ہیں
دھیلا ہے نہ دمڑی ہے نہ ادھی ہے نہ پائی، اے وائے دریغا
اس طرح تو پلتا نہیں پیٹ اے میرے داتا دل میں ہے یہ آتا
اب سیکھ لیں ہم پیر سے نیچر کے گدائی، اے وائے دریغا
ہیں سیکڑوں ایم.اے. تو مڈل پاس ہزاروں، کچھ حد بھی ہے یاروں
سرکار میں تم سب کی کہاں تک ہو سمائی، اے وائے دریغا

اس نوحہ کے یہ چند اشعار پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افق انڈین نیشنل کانگریس جو ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی تھی، کے شروعات سے ہی پرزور حامی تھے۔ ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات پر انہوں نے اپنی غزلوں، مسدسوں، رباعیوں اور مضامین کے ذریعہ لگاتار برطانوی پالیسیوں کی مخالفت کی اور اپنے آزاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ افق نے آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں اس شروعاتی دور میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سودیشی آندولن کو بڑھاوا دینے کی آواز بھی انہوں نے انیسویں صدی میں ہی اٹھادی تھی۔ سودیشی اشیاء کے تشہیر کے ذریعہ افق نے ملک کے اقتصادی ترقی کو بڑھانے کا صحیح راستہ سب کے سامنے رکھا۔ افق کی سودیشی تحریک پر لکھی نظم کو دو اشعار دیکھئے جس میں انہوں نے برطانوی حکومت کو ملک سے چلے جانے تک کی چیتاونی دی ہے:

ترقی پر رہے یارب سدا چرچہ سودیشی کا
ہر ایک کے ہاتھ میں ہو ہند سا پرچہ سودیشی کا
یہاں سے مانچسٹر والے باندھے بوریا بستر بندھنا
کریں گے بھائیوں سے اپنے ہم سودا سودیشی کا

افق کی ہندی غزل

افق کی ہندی غزل موجودہ دور میں اپنی گنگا جمنی تہذیب کی روایت کو برقرار رکھنے کے اور بڑھانے کے لئے ہندی غزلوں کا چلن دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن افق نے آج سے تقریباً سوا سو سال پہلے ہندی زبان میں کچھ غزلیں کہی ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے کامیاب غزلیں کہی جا سکتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر افق کی ایک ہندی غزل کے کچھ اشعار پیش ہیں جن میں ہندی الفاظ اور روایات کا استعمال اور شاعر کے موڈ کا اتحاد قابل غور ہے۔ غزل میں محاوروں کا استعمال بھی دیکھنے کے قابل ہے:

بہا دے پاپ جو کالندری کے جل کی دھارا ہے
جہاں ہو جائے بیڑا پار جمنا کا کنارا ہے
کہاں اے کرشن وہ مکھڑا تمہارا پیارا پیارا ہے
جو اپنے ہاتھ ہی سے رادھیکا بن کر سنوارا ہے
دل اپنا ایسا مایا موہ سے دنیا کے ہارا ہے
ہمیں جینے سے مرنا کرشن کی چھپ پر گوارا ہے
کنہائی دیوکی بسودیو کی آنکھوں کی پتلی ہیں
اسی سے سانوی صورت کا جھانکی میں نظارہ ہے
کہیں کے جاگنے سے کرشن کا منہ یوں بھی آدھا تھا
دکھا کر عارسی رادھا نے چہرہ اور اتارا ہے
لبھایا ایسا دل بنسی بجانے کی اداؤں نے
نہ سمجھیں رُک منی کچھ، رادھیکا سے کیا اشارہ ہے
دکھائے کیوں نہ ہری کا روپ ڈاماڈول دل ٹھمکر
نظر آتا ہے منہ اس میں جس آئینہ میں پارا ہے
اسی کے ہاتھ کا احسان اچھے لوگ اٹھاتے ہیں
سری گری راج کو بھی جس کی انگلی کا سہارا ہے
کہیں اچھے ہیں بھاگ اس کے افق متھرا سے مدھوبن سے
کنہیا جی نے جس کو دوارکا کہہ کر پکارا ہے

☆☆☆

مسدس

اردو شاعری میں ایک مدت تک مسدس کا استعمال صرف مرثیہ لکھنے تک ہی محدود رہا۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے مسدس کا استعمال مرثیہ لکھنے میں کیا اور اس میں بہت شہرت حاصل کی۔ رفتہ رفتہ شاعری کی اس صنف کا حلقہ وسیع ہوا۔ انیس کے گھرانے میں انیس کے چھوٹے بھائی میر مونس، ان کے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس، انیس کے پوتے میر جلیس، میر نفیس کے نواسہ سید علی محمد عارف مشہور مرثیہ گو ہوئے۔ با کمال مرثیہ گو مرزا انس کے گھرانے میں انکے علاوہ انکے بیٹے حسین مرزا عشق، سید مرزا تعشق، احمد مرزا صابر اور صابر کے بیٹے پیارے صاحب رشید نے بھی مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کی۔ مرزا دبیر کے بیٹے مرزا محمد جعفر عوج نے بھی مرثیہ لکھنے میں بہت نام پیدا کیا۔ کئی اور با کمال شعراء نے مسدس میں اظہار خیال کے دائرہ کو وسعت دی۔ لیکن شاعری کی اس صنف کا تعلق خاص طور سے مرثیہ گوئی ہی رہا۔
مولانا حالی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنا نہایت مشہور اور معروف ''مسدس حالی'' مد جزر اسلام سے اسلامی تہذیب اور ثقافت کی ترقی اور مسلم سماج کو غفلت کی نیند سے جگانے اور اسے بیدار کرنے کا کام لیا۔ اقبال نے بھی اسی نظریہ کو اپناتے ہوئے اپنے مسدس شکوہ اور جواب شکوہ لکھے شکوہ میں اقبال نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو اللہ سے شکوہ کے انداز میں یاد دلایا ہے اور جواب شکوہ میں اللہ کی جانب سے مسلمانوں کو یہ یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جس عظمت کے حامل تھے اسکی بنیاد ان کا کردار تھا۔ حالی سے پہلے نظیر کی نظم مسدس اور انیس اور دبیر کی مرثیوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسدس کے اسلوب ملک اور زمانہ کے حالات، سماجی اور مذہبی مسائل اور رزم کا بیان کرنے کے لئے بھی نہایت موزوں ہیں۔ غالباً حالی کے مسدس سے متحرک ہو کر شنکر دیال فرحت، دوارکا پرساد افق، دتاتریہ کیفی، بنواری لال شعلہ، اقبال اور

چکبست جیسے بڑے شاعروں نے مسدس کی صنف کو ہی اپنے جذبات و احساسات کو بیان کرنے کیلئے استعمال کرنے میں وسعت بخشی۔ ان شعراء نے مسدس کی صنف میں زیادہ قومی اور مذہبی موضوعات کو ہی قلمبند کیا۔

افق کی طبیعت کو مسدس سے خاص لگاؤ تھا اس لئے ان کی شاعری کا کمال اس صنف سخن میں خاص طور سے اجاگر ہوا ہے۔ افق کو اپنے زمانہ کے مسدس لکھنے والوں میں سب سے عظیم شاعر کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ میں اقلیم مسدس کے بادشاہ کہے جاتے تھے۔ افق کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بالکل اچھوتے اور غیر روایتی موضوعات پر مسدس کی صنف میں خامہ فرسائی کی ہے جو اپنے مقام پر بہت کامیاب اور بامراد ہے۔ انہوں نے حب الوطنی کے متعلق اور اخلاقی، سماجی، مذہبی اور دوسرے بالکل نئے موضوعات پر اچھے مسدس لکھ کر اردو شاعری کے میدان میں ایک بہت اہم کام کیا جس سے اردو شاعری کا دائرہ یقیناً وسیع تر ہو گیا۔

حب الوطنی کے متعلق افق نے چار اہم مسدس آریہ ورت کی تاریخی عظمت، قومی مسدس، مسدس افق، اور، درس عمل' ملک اور قوم کی نذر کئے ہیں۔ اخلاقی مسدسوں میں 'دین و ایمان کی حفاظت' 'غریبوں کی غریبی' 'خودی' 'آہ مظلوماں' 'شجر اخلاق' 'اتفاق' 'خدمت مرشد' 'مرقع عورت' وغیرہ اہم ہیں۔ سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے مسدس 'شراب کی مذمت' 'غفلت' 'اعتبار' 'پابندی وقت' 'زر کی تعریف' 'تندرستی' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مذہبی موضوعات پر لکھے ان کے مسدس دل کو چھو لینے والے ہیں اور ان میں تفصیلی بیان کے ساتھ شاعر نے واقعی موضوعات کا حق ادا کر دیا ہے۔ مسدس کی صنف میں افق نے ایک رامائن بھی لکھی ہے جس میں ۶۳ بند ہیں۔ 'حسن و عشق' 'فرزند' 'پریم' 'استاد' 'زبان' 'مسدس بھی زبان اور بیان کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ جھجھر کا سفر اور حیدر آباد دکن کے بارے میں ان کے دو سفرنامے صنف مسدس میں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ افق نے مختلف مسدسوں میں اپنے بیانات مدلل بنانے کے لئے مختلف تاریخی اور تہذیبی اہمت کی روایات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جس سے ان کے بیان اہم اور مضبوط تر ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ روایات کی معنویت بھی اپنی تمام تر اہمیت و کیفیت کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان مسدسوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ شاعر نے اس میں ہندوستانی تہذیب و

ثقافت کے علاوہ دنیا کی دوسری عظیم تہذیبوں جیسے اسلامی اور مغربی تہذیب اور یونانی تہذیب سے بھی مختلف حوالے دئے ہیں جو شاعر کے وسیع مطالعہ انسانی ہمدردی، محبت اور رواداری کے آئینہ دار ہیں۔ موضوعات کی وسعت موضوع کے اعتبار سے لفظوں کا انتخاب اور بیان کی مکمل ہم آہنگی افق کے مسدسوں کو امتیاز بخشتی ہے۔ ان کے مسدسوں میں شاعری کی فطری کیفیت، سلاست، روانی اور ندرت کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذبات واحساسات بھی پورے طریقہ سے جلوہ گر ہوتے ہیں جس سے یہ بیحد پر اثر بن گئے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افق کو مسدسوں میں ٹیپ کا شعر لکھنے میں مہارت حاصل تھی جس سے مسدس کے بند کا پورا نقشہ نظروں کے سامنے کھینچ جاتا ہے۔ ان کے کچھ ٹیپ کے شعر الفاظ کے بہترین استعمال کی وجہ سے بیحد پر اثر ہیں اور انہیں حاصل مسدس کہا جاسکتا ہے۔

مسدس (حب الوطنی)

ایک بڑے شاعر کے کلام میں اپنے وقت کے اثرات کی عکاسی ہونا ایک عام بات ہے۔ یہ حقیقت افق کے مسدسوں میں خاص طور سے ابھر کر آئی ہے۔ افق ہندوستان کے اس دور کے اہم شاعروں میں سے ہیں جب اس ملک میں برطانوی حکومت کی مخالفت شروع ہوگئی تھی اور سیاسی کشمکش کی شروعات ہوچکی تھی۔ ملک کے صورتحال میں تبدیلی کرنے کی بے چینی تیز تر ہوتی جارہی تھی افق نے وقت کی آواز کو پہچانتے ہوئے ایک سچے شاعر کے فرض کو نبھایا اور خصوصاً اپنے مسدسوں کے ذریعہ عوام کا ذہن میں تحریک پیدا کرنے اور سماج میں بیداری لانے کی کوشش کی۔ افق کو اپنے ملک اور اس کی ثقافت پر بے انتہا فخر ہے اور اپنے ملک کے ہر فرد سے بے پناہ محبت ہے۔ انہیں عظیم ثقافتی روایت کے علمبردار ہندوستان کی قابل مذمت غلامی اور پچھڑے پن پر بیحد اضطراب تھا۔ ان حالات کے لئے وہ برطانوی سرکار کی ملک کے لئے غیر نفع بخش پالیسیوں کے ساتھ ساتھ بھارتیہ سماج میں جڑ جمائے ہوئے عیبوں اور خامیوں پر الزام رکھتے ہیں۔ افق نے اپنے مسدسوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کو سماجی، سیاسی اور اقتصادی مشکلات کے محور سے باہر نکالنے اور انہیں ترقی کے راستہ پر گامزن ہونے کے لئے ترغیب دی۔ اس عظیم مشن کی کامیابی کے لئے افق نے آریہ ورت کی ثقافت اور تمدن کے از سر نو تعمیر پر زور دیا۔

مسدس افق

اپنے ۸۳ بندوں کا 'مسدس افق' میں اس ملک کے عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کے لئے اور انہیں خواب غفلت سے جگانے کی کوشش وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سو چکے خوب بس، اب دھرم کے پیارے اٹھیں
آنکھ ملتے ہوئے بھارت کے دلارے اٹھیں
نیند غالب ہو تو کہنے سے ہمارے اٹھیں
الکساہٹ ہو تو لاٹھی کے سہارے اٹھیں
نیند اچٹائیں کہ سونے کا نہیں وقت رہا
قیمتی وقت کو کھونے کا نہیں وقت رہا

☆

عہد سے راجا پتھورا کے جو غفلت چھائی
گوند سے چپکا لیا پلکوں کو وہ نیند آئی
ہوش تن کا نہ خبر جام کی دل میں پائی
ننگ و ناموس کی پرواہ نہ غم رسوائی
سوئے یوں وقت کسی شخص کا جیسے سوئے
جس طرح مست کوئی نشہ مے سے سوئے

افق مانتے ہیں کہ بھارت پرانے علوم کی دولت سنسکرت زبان کی کتابوں میں محفوظ ہے جسے بھول کر ہم نے اپنے کو دنیا کے سامنے جاہل قوم ثابت کر دیا ہے۔

حیف ہم اپنے طریقوں کو کہاں تک بھولے
انتہا یہ ہے بزرگوں کی زباں تک بھولے

نام عالموں کے کتابوں کے نشاں تک بھولے
طرز تقریر تک انداز بیاں تک بھولے
ہوگا کون اور جو اس قسم کا غافل ہوگا
سن کے پگھلے وہ پتھر کا بھی جو دل ہوگا

ان کا کہنا ہے کہ سنسکرت زبان کا علم حاصل کر کے ہی ہندوستان اپنی پرانی عظمت تک پہونچ کر کے ہی دنیا میں اپنا مخصوص مقام بنا سکتا ہے جس کا وہ واقعی حقدار ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے عوام کو ان کے سنہرے ماضی کی یاد آوری اس طرح کرائی ہے:

یاد کر لیجئے جب سنسکرت کا تھا رواج
آریہ ورت تھا کل روئے زمیں کا سرتاج
تھے بھرت کھنڈ کے کل غیر ممالک محتاج
خواب میں بھی نہ کبھی تھی جو فلاکت ہے آج
لکشمی گھر میں تھی، ایسے نہ تھے زر کا بھوکے
سونا کر دیتے تھے ہم ہاتھ سے مٹی چھوکے

اپنی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہوئے افق کہتے ہیں:

یہاں کے وہ لوگ تھے جن پہ ہے کمالات کو ناز
فکر تھی جن کی فسوں خیز، خیال افسوں ساز
بھر دیئے پوتھیوں میں کھول کے ہر علم کے راز
خرق عادات، کرامات، کرشمہ اعجاز
نقص و اقسام سے تصنیف نہ چھوڑی کوئی
بات سہواً بھی کتابیں میں نہ چھوڑی کوئی

☆

منتر نہیں یاد تھے وہ جن سے کمال ان کا تھا
غیب داں کاشف اسرار خیال ان کا تھا

کال ڈرتا تھا نظر سے وہ جلال ان کا تھا
دیکھ کر مردے جلاتے تھے وہ حال ان کا تھا
دیوتاؤں کو رجھا لیتے تھے جپ کر کر کے
بھسم ہر پاپ کو کر دیتے تھے تپ کر کر کے

ہندوستان کے اسلحوں ، انجینئرنگ اور جیوتش کے علم کا اور ہندوستانیوں کے تمام کمالات کا شاعر نے تاریخی حوالے دیتے ہوئے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے حسب ذیل بند دیکھئے:

ناز کرتے تھے یہاں کے قدر انداز پہ تیر
لاکھ اعجاز دکھاتے تھے اک اعزاز پہ تیر
گرتے تھے صورت برق اڑتے ہوئے باز پہ تیر
مارے ہیں راجہ پتھورا نے بھی آواز پہ تیر
توڑ دیتے تھے ہر ایک قلعہ کی دیواروں کو
توپ پر رکھ کے اڑا دیتے تھے کہساروں کو

☆

ہند کی بات تھی انجینئرنگ میں بالا
بندھ گیا سیتو سمندر میں جو پتھر ڈالا
سوچو سانچے میں اجودھیا کو تھا کس نے ڈھالا
کون تھے سونے کی لنکا کا بنانے والا
آنکھیں کھل جائیں جو تاریخ گھڑی بھر دیکھو
دور کیوں جاؤ جگن ناتھ کا مندر دیکھو

☆

آریہ ورت کی جیوتش کی تھی آفاق میں دھوم
سب کی نظروں میں چلا کرتے تھے دن رات نجوم

رہتے تھے پیش نظر جملہ امور مقسوم
آنکھ کے سامنے تھی بات جو تھی نامعلوم
زائچہ کے جو گرہ نظروں میں چڑھ جاتے تھے
لوگ فر فر کط تقدیر کو پڑھ جاتے تھے

علم ریاضی (ارتھ میٹک) اور جیومیٹری کے بارے میں ہندوستانی تحقیقات کے سلسلہ میں افق کہتے ہیں:

آریہ ورت کے حصہ ہی میں تھا علم حساب
مبتدی یاں کے زمانہ میں نہ رکھتے تھے جواب
گو ہزاروں ہوئے اس علم کے دفتر نایاب
باقی لیلاوتی اب بھی ہے اک ادنیٰ سی کتاب
جس کو دعویٰ ہے نظیر اس کی دکھا دے ہم کو
ضرب ہی کا کوئی گر اور سکھا دے ہم کو

ہندوستانی موسیقی کی تحقیقات کے بارے میں شاعر کا بیان ہے کہ صرف اسی ملک میں دن رات کے چوبیس گھنٹے کے ہر پہر کے مطابق راگ راگنیوں کے کھوج کی گئی ہے۔ یہاں کی راگ راگنیوں کا تعلق زمین کی گردش اور مختلف موسموں سے بھی ہے جس کی وجہ سے ان کا اثر انسان کی طبیعت اور فطرت پر بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی شاعری بھی فطرت کے نزدیک ہونے کی وجہ سے بہت پر اثر ہوتی ہے افق کہتے ہیں:

ناد ودیا تھی یہاں کی دفع کن رنج و ملال
جس کے ہر راگ کے سننے سے تھے داؤد کو حال
تان سین ایسوں کا ظاہر تھے زمانہ میں کمال
جن کا ہر سم تھے امرت، آب بقا تھی ہر تال
راگنی ان کی ہر پل کی خبر رکھتی تھی
جیب میں گویا گھڑی ان کی نظر رکھتی تھی

موم کر دیتے تھے پتھر کا جگر چھیڑ کے راگ
سر میں دیپک کے لگا دیتے تھے دریاؤں میں آگ
بس میں دل کرتے تھے جب گاتے تھے بنگال بہاگ
مست ہو جاتے تھے سن سن کے کھرج کالے ناگ
سحر فرماتے تھے کرتے تھے فسوں سرگم سے
پھونکتے روح تھے مردوں کے بدن میں سم سے

افق کہتے ہیں کہ علم اور ہنر کی جتنی چیزیں مشہور ہیں ان کا موجد ہندوستان ہی ہے۔

مسدس کے اس بند میں وہ کہتے ہیں:

مشتہر جتنے ہیں فن جتنے ہنر جتنے علوم
مثلاً منطق، ادب، فلسفہ تاریخ و نجوم
سب کے سب سنسکرت میں نظر آئے منظوم
نثر میں کوئی بھی اب تک نہیں ہم کو معلوم
سیر ہی جملہ مضامیں کی ہے اشلوکو میں
دیو تک ہو گئے اس نظم پہ غش لوکو میں

☆

یوں ہی ہیں جتنے علوم ان کے دھنی تھے ہم لوگ
دولت کسب لیاقت سے غنی تھی ہم لوگ
مجدد جوہر رنگی سخنی تھے ہم لوگ
آبرو جن سے ہے ہر ایک بنی، تھے ہم لوگ
گر ہر اک علم میں ہم اپنی مہارت دکھلائیں
لازماً اہل نظر محو تحیر ہو جائیں

افق نے آج سے ایک صدی پہلے اس بات کو بہت زور دیکر کہا ہے کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم نہ دیئے جانے سے ہی ہندوستان کی ترقی رک گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کے ترقی

یافتہ ملکوں اور سلطنتوں کی بہبودی کا راز ان کو یہاں مادری زبان میں تعلیم دیا جانا ہے۔ افق کی نگاہ میں ہندوستان کی غلامی کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ یہاں سنسکرت کی تعلیم پر بالکل زور نہیں دیا گیا اور جس کی وجہ سے یہاں کے عوام سنسکرت کی کتابوں میں بیان کیے ہوئے علم سے محروم ہو گئے۔ ہندوستان کی تنزلی پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جہاں جرمنی جیسے دوسرے ممالک سنسکرت زبان سیکھ کر ہندوستان کی کتنی ایجادوں کا سہرا اپنے نام کر کے دنیا میں آگے بڑھ گئے وہیں ہندوستان کے لوگ اپنے ہی علم سے محروم رہے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے:

جتنی ہیں سلطنتیں زیر فلک عالی شان
مثلاً بیلجیم و کابل و روم و یونان
فارس و جرمن و امریکہ و چین و جاپان
اٹلی و پیرس و روس و عرب و انگلستان

مادری علم و زباں کو جو نہیں بھولے ہیں
چشم بددور، ہیں سر سبز، پھلے پھولے ہیں

احساس کمتری کے سبب سے ہندوستان کے لوگوں کے اپنی زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے اور انگریزی زبان کی تھوڑی سی بھی واقفیت ہونے پر خوشی سے پھولے نہیں سمانے کے رویہ پر لعنت ملامت کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ یہ مقام ہندوستانی عوام کے لئے در حقیقت شرم سے ڈوب کر مر جانے کا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حیف ہند اپنی زباں بھول کے کاندھا ڈالے
نہ کتابوں کو کبھی کھولے نہ دیکھے بھالے
ہند کے لوگ رہیں جہل کا طوطا پالے
عالم و سنکرت داں بنے جرمن والے

حیف وہ سنسکرت بولنے کو منہ کھولیں
آئی نو اون لی انگلش اے لٹل یہ بولیں

☆

یہ جگہ ہے کہ نہیں ہند کے شرمانے کی
ڈوب مرنے کی گلا کاٹ کے مرجانے کی
آگ میں کود کے جل مرنے کی وِش کھانے کی
چاہ میں گرنے کی شکل اپنی نہ دکھلانے کی
ہم رہیں علم بزرگاں سے انیلے تف ہے
غیر ملکوں میں ہر اک سورہی پھیلے تف ہے

ملک کی بربادی اور تباہی کے وجوہات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے افق اہل ہندکو بتاتے ہیں کہ ملک کے ہر طبقے نے اوج قدیم کو بھلا دیا ہے اور اپنے لئے طے شدہ کاموں سے منہ موڑ لیا ہے۔ برہمن جن کا خصوصی کام علم حاصل کرنا اور علم کو پھیلانا ہوتا ہے، چھتری جن کا کام شجاعت کے جوہر دکھا کر ملک کی حفاظت کرنا بتایا گیا ہے، ویشیہ جنکا مخصوص کام دائرہ تجارت اور صنعتی ترقی کرنا ہے سب ہی اپنے اپنے کام ملک اور قوم کی بہبودی کو خیال میں رکھ کر نہیں کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے جس سے ملک کی ترقی رک گئی ہے اور وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ افق کہتے ہیں کہ بھاردواج، سوت، ویاس، وششٹ، کپل منی، یگیہ ولکہ، منو، شنکراچاریہ جیسے تپسوی اور سنت کہاں ہیں جن کے اپدیشوں سے ساری قوم فیضیاب ہوئی تھی اور جن میں اتنا جلال تھا کہ ان کو دیدار سے ہی سب کی امیدیں برآتی تھیں:

حیف اس وقت وششٹ ایسی نہ توقیر رہی
نہ کپل منی کی طرح بات میں تاثیر رہی
یاگیہ ولکہ اور منو کی سی نہ تحریر رہی
شکراچانیہ کی مانند نہ تقریر رہی
کچھ جو باقی ہے تو اعزاز سلف باقی ہے
پاؤں چھو لیتے ہیں لوگ اتنا شرف باقی ہے

افق افسوس کرتے ہیں کہ چھتریوں میں بھی رام، یدھشٹھر، ارجن اور بھیم کی طرح عظمت اور شجاعت اب دیکھنے کو بھی نہیں ملتی ہے:

من وعن چھتریوں پر بھی یہی ہے الزام
دیوبانی کو بھلا کر ہوئے غفلت کے غلام
نہ وہ توقیر یدھشٹھر ہے نہ وہ عظمت رام
زمزمے کا وہ چلن ہے نہ جنک جی کا وہ کام
بان ارجن کا نہ وہ، زور نہ وہ بھیم کا ہے
نام ہی نام فقط تخت کا دیہیم کا ہے

☆

چل کے جن راجوں کی تیغ ابر میں دم لیتی تھے
ابروئے حور سے نظرانہ میں خم لیتی تھی
چرخ سے ترک تعدی کی قسم لیتی تھی
رزمگاہوں میں ظفر جس کے قدم لیتی تھی
ان مہاراجوں کے بیٹوں کا مقدر پھر جائے
اس سے بہتر ہے کہ حلقوم پہ خنجر پھر جائے

ملک کی ایک تعلیم یافتہ اور دانشمندی کے لئے مشہور با مہذب کائستھ قوم کی گری ہوئی حالت پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ کائستھوں نے اپنی لیاقت کے بل پر کبھی بڑی بڑی سلطنتوں اور ریاستوں میں وزارت کی ذمہ داری بخوبی نبھائی تھی آج قلم کی طاقت، دولت، لیاقت سب کھوکر اپنے پرانے اقبال سے محروم ہو گئے۔ کائستھوں نے قوم کے کچھ مسائل حل کرنے کے لئے کانفرنسیں کمیٹیوں کی بنیاد ضرور ڈالی لیکن وہاں بھی ان کی آپسی رنجش اور حسد کی وجہ سے ملک اور قوم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ افق کہتے ہیں کہ کائستھوں کو اپنی اس تنزلی پر شرمسار ہونا چاہئے:

وید ودیا میں تھی مشہور مہارت جس کی
باتیں افلاک کی کرتی تھیں عمارت جس کی
باعث فخر تھی راجوں کو وزارت جس کی
اہل اسلام نے دیکھی ہے امارت جس کی

حیف چتر گپت کی اولاد وہ اس حال میں ہو
نام دولت میں لیاقت میں نہ اقبال میں ہو

☆

کانفرنسوں کی تو کائستھوں نے ڈالی بنیاد
یہ تو فرمائیں گھٹا ہے کہ بڑا بغض و عناد
وید اسمرت کی بھی آتی ہے کبھی خواب میں یاد
قید مذہب میں تجاوز ہیں یا ہیں آزاد
بزم قومی میں کوئی دھرم کی تخصیص بھی ہے؟
دیوبانی کے لئے وعظ بھی تحریص بھی ہے؟

ویشیوں کے لئے افق کہتے ہیں کہ ویشیوں میں بھی تجارت میں محنت کر کے بلندی پر پہونچنے کا مادہ نہیں رہا۔ تھوڑی سے دولت ملنے پر ہی وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں سب کچھ حاصل ہو گیا لیکن انہوں نے کوئی ایسے کام نہیں کئے جس سے وہ غیر ملکوں کے تجارتی طبقہ سے آگے بڑھ سکیں۔ افق کے مطابق برہمن چھتریہ ویشیہ بڑی قوموں کے لوگ خواب غفلت میں پڑے ہیں۔ شدر بیچارے اپنے کام محنت سے کرتے ہیں لیکن اس سے ملک کی بہتری پر تو اثر پڑتا نہیں ہے۔ قوم کے نازک حالات کو بیان کرتے ہوئے افق کہتے ہیں:

شرفا فخر سمجھنے لگے دم بازی کو
خود نمائی کو، خیانت کو، در اندازی کو
بغض و لامذہبی، تفرقہ پردازی کو
بادہ و جام کو عیاشی و غمازی کو
شک نہیں اس میں جو یہ سنسکرت داں ہوتے
دیوتا اصل میں ہاں شکل میں انساں ہوتے

مسدس کے آخری بندوں میں افقؔ ہندوستان کی قدیم مقدس ویدوں میں دی گئی نصیحتوں اور تعلیم کی طرف توجہ دلانے والے اور ویدوں کی وضاحت کرنے والے دھرم گروؤں کے اپدیشوں کے مطابق چلنے کے لئے عوام کو آواز دیتے ہیں۔

قومی مسدس

افقؔ کا ایک اور مشہور مسدس ''قومی مسدس'' ہے جو ان کے حب الوطنی کے جذبہ کو شاعرانہ عظمت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مسدس کی شروعات میں شاعر نے منظر نگاری کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ علی الصبح کی یہ منظر کشی خوبصورت الفاظ میں ہے اور بندش الفاظ ایسی ہے کہ ہر بند سے ترنم ریزی اور نغمگی گونجتی ہے۔ حسب ذیل بند دیکھئے جو اصل مدعا سے پہلے بطور تشبیب بیان کئے گئے ہیں:

مکان افقؔ نور سے سج رہا ہے
اذاں ہو رہی ہے گجر بج رہا ہے
جو پہنے ہے جنار ہر بجھ رہا ہے
نکلنے کو اب صرف سورج رہا ہے
عنادل کو خوشبو سونگھاتا ہے ہر گل
صبا کر رہی ہے چراغ سحر گل

کنول جاگے سوئے ہوئے رات بھر کے
اٹھے طائر آب جل شین کر کے
نہاتے ہیں شبنم سے پتے شجر کے
نکلتے ہیں ارماں نسیم سحر کے

ہے یوں دھوپ کی روشنی مندروں میں
چمک دھوپ کی جس طرح ہو گھروں میں

☆

عنادل چہکنے لگے آشیاں میں
مہکنے لگی بوئے گل بوستاں میں
چٹکنے لگے غنچے باغ جہاں میں
طراوت ہوئی دیدۂ باغباں میں
اٹھے فرش گل پر جو لیٹے ہوئے تھے
اڑے مرغ جو پر سمیٹے ہوئے تھے

ساری کائنات اور سب لوگ اپنے روزمرہ کے صبح کے کاموں کو انجام دے رہے ہیں لیکن پھر بھی اس ملک میں تمام لوگ ایسے ہیں جو خواب غفلت میں سوئے پڑے ہیں انہیں کو مخاطب کرتے ہوئے افق کیا کہتے ہیں دیکھئے:

تعلق جو تھے وہ کئے کام سب نے
کیا عالم نور عالم کو رب نے
کیا مست رندوں کو بنت العنب نے
کیا جانشیں مہر کو ماہ شب نے
شفق نے کیا سرخرو آسماں کو
گلوں نے معطر کیا بوستاں کو

☆

وضو آب شبنم سے گل کر رہے ہیں
حسیں ہاتھ شمع کو گل کر رہے ہیں
مسلمان یاد رسل کر رہے ہیں
بہی خواہ عالم یہ گل کر رہے ہیں

بہت سو چکے دور اندھیرے ہوا ہے
اٹھو سونے والوں سویرا ہوا ہے

شاعر نے اگلے بندوں میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ خواب غفلت میں محو رہنے سے ہی ہندوستانیوں پر ایک کے بعد ایک مصیبت نازل ہوتی چلی گئی۔ ہندوستان کے لوگ صرف تقدیر کے سہارے بیٹھے رہے اور اللہ نے بنا اپنے ہاتھ پاؤں کو تکلیف دیئے مرادیں بر آنے کی آس لگائے رہے۔ ادھر انگریزوں اور دوسرے ممالک کے لوگوں نے ہندوستان کے علم وفن کو چرا کر اپنے ملک میں پہونچا دیا۔ غیر یہاں کی ساری دولت اڑا لے گئے اور ہمارے عروج کو پہونچے ہوئے تمام فن کو بھی برباد کر دیا۔ افق نے یہ حقیقی حالات اس انداز میں بیان کئے ہیں:

مسان ایسی دزد جہالت نے ڈالی
جو تھی دولت علم گھر میں چرالی
خزانہ کئے شان و شوکت کے خالی
رہے نقب سے سب کمائی نکالی
اچکوں نے کل مال و اسباب تاکا
پھری گھر میں جھاڑو پڑا ایسا ڈاکا

☆

جو کھانے کو باقی رہا کچھ وہ غم ہے
کلیجہ کی آنکھوں کی سر کی قسم ہے
ہلاہل ہے، ہیرا ہے، زہر اور سم ہے
شکست اور دھوکا ہے تیغ دو دم ہے
جو پینے کو ہے بھی گھر تو گھونٹ اپنے خوں کا
ستم دیکھئے دست گردوں و دوں کا

افق کہتے ہیں ہم ہندوستانیوں کو نہ تو اپنا اور نہ اپنے وطن کی بہبودی کا کچھ ہوش ہے۔ ہمارا ضمیر اس قدر مر چکا ہے کہ ہمیں اپنی بدبختی پر غم کو احساس تک نہیں ہوتا۔ افق تلخ انداز میں

یہاں تک کہتے ہیں کہ ہندوستانی قومیں مردہ ہو چکی ہیں۔ حب الوطنی کا جذبہ رخصت ہو چکا ہے اور سارے ملک میں مسان کی مردنی چھائی ہے۔ مسدس کے یہ بند دیکھئے:

بہت کچھ کیا شور برگ شجر نے
جگایا بہت غل مچا کر گجر نے
بہت گدگدایا نسیم سحر نے
بہت دستکیں دیں مکانوں کے در نے
نہ شور طیور نوا گر سے جاگے
نہ آواز اللہ اکبر سے جاگے

☆

سوا بت کدہ سے ہر ایواں بنا ہے
ہر ایک شہر شہر خموشاں بنا ہے
بت در ہر اک انساں بنا ہے
کھلونے کے مانند بے جاں بنا ہے
جو چھت پھٹ پڑے سر پہ کچھ غم نہیں ہے
کوئی مردہ قبر سے کم نہیں ہے

اہل ہند کی غیرت کو للکارتے ہوئے افق کہتے ہیں:

ذرا ہوش میں آؤ اے سونے والو
فدائے رخ بے حسی ہونے والو
اٹھو قیمتی وقت کے کھونے والو
سنو قوم کے حق میں وِش بونے والو
نہیں جاگتے کیا غضب ڈھا رہے ہو
کہو قوم سے خار کیوں کھا رہے ہو

☆

گنوایا آسا سا جو پونجی تھی کھوئی
سمندر میں کشتی ہمت ڈبوئی
ترقی کا امکان رکھا نہ کوئی
ہنر، علم، فن، زور ہمت نہ کوئی
ریاست، شرف، رحم اقبال دولت
حشم دبدبہ، طنطنہ جاہ و صولت

افق کہتے ہیں کہ ہم ہندوستانی خود ہی اپنے کو مٹانے والے ہیں۔ ہم نے اپنے عقل اور ہمت سے کام نہیں لیا۔ اپنا علم، ہنر، فن اور دولت سبھی کھو دیا اسی لئے نہ ہمارا جاہ وجلال قائم رہا اور نہ بلند مرتبہ۔ ہماری ابتری کا سبب کیا ہے اس کی وضاحت افق نے اس طرح کی ہے:

ہے اس کا سبب صرف اپنی ہی غفلت
تعصب، حسد، بغض کینہ جہالت
کمی عقل کی بیوقوفی حماقت
عداوت کی لعنت، لیاقت کی قلت
یہی ہیں جنہوں نے بسا باغ اجاڑا
یہی ہیں بنا گھر جنہوں نے بگاڑا

☆

یہی ہیں جو اقبال کی بیخ کن ہیں
یہی ہیں جو سفاک ہیں دل شکن ہیں
یہی ہیں جو بدخواہ ہر مرد و زن ہیں
یہی ہیں جو بانی و رنج و محن ہیں
انہیں نے دیا سب کو غم مفلسی کا
کسی کا گیا مال، اثاثہ کسی کا

افق ملک کے عوام سے صاف صاف کہتے ہیں:

مگر عقل پر زور دیتے نہیں تم
ذرا ہوش کا نام لیتے نہیں تم
کبھی فہم کی ناؤ کھیتے نہیں تم
کسی کے جگانے سے چیتے نہیں تم
اگر خواب غفلت سے بیدار ہوتے
نہ اس طرح تم نظر ادبار ہوتے

☆

نہ افلاس خاک آنکھ میں ڈال جاتا
نہ ادبار آتا نہ اقبال جاتا
خزانہ گھروں سے نہ ہر سال جاتا
نہ ہاتھوں سے نقد و زر مال جاتا
نہ ہوتا کوئی شخص دولت کا بھوکا
نہ پیتا کوئی گھونٹ اپنے لہو کا

☆

ان حالات میں بھی افق عوام کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے اب بھی غنیمت جو غفلت کو بھولو
بھلا ہو فراست کی ڈھائی جو چھو لو
جو کچھ چاہیئے آنکھ کے روبرو لو
بڑے مال و دولت پھلو اور پھولو
شکایت نہ باقی رہے مفلسی کی
مصیبت. کی تکلیف کی زندگی کی

☆

وہی جاہ و شان و شرف ہاتھ آئے
ہوا ہے جو اب تک تلف ہاتھ آئے
زر و مال عہد سلف ہاتھ آئے
گل مدعا ہر طرف ہاتھ آئے
جو افلاس اس وقت ہے دور ہو وہ
جو ادبار ہے دم میں کافور ہو وہ

افق زور دے کر کہتے ہیں کہ ترقی کا اگر کوئی راستہ ہے تو وہ علم وفن میں مہارت حاصل کرنا، کاہلی سے گریز کرنا، آپسی نفاق بھلا کر صنعتی، زرعی، ترقی کرنا اور تکنیکی تحقیقات میں لگ جانا ہے۔ وہ پند آمیز لہجہ میں کہتے ہیں:

جلا دل کو دو صیقل علم و فن سے
سبق لو تو لو عاقلوں کے سخن سے
جو ہے خون فاسد نکالو بدن سے
محبت سے پیش آؤ ہر مرد و زن سے
نفاق و تعصب کو ہیرا کھلا دو
خیالات بے سود کو سنکھیا دو

☆

پڑھو علم و صنعت کہ ہو نیک نامی
مٹاؤ جبیں سے نشان غلامی
کرو دور جو ہو لیاقت میں خامی
بنو سعدی و عنصری و نظامی
سکندر بنو کچھ تم ایجاد کر کے
فلاطوں ہو کوئی خم ایجاد کر کے

☆

مہ نخشب ایسا کرو کام کوئی
کرو مخترع مثل جم جام کوئی
لکھو مثل زلف بتاں لام کوئی
علی کی سی چمکاؤ صمصام کوئی

درس عمل

اقبؔ کا ایک مسدس ''درس عمل'' رسالہ بھارت پرتاپ کے ماہ فروری کے نمبر میں ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی آج سے ۱۰۰ برس پہلے تھی۔ اس مسدس میں شاعر نے سوالیہ انداز میں اہل ہند سے پوچھا ہے کہ آخر تمہارے ملک پر خدا کا قہر کیوں ہے؟ تمہاری بدبختی کا راز کیا ہے؟ اس مسدس میں اقبؔ نے مذہب کا سہارا لئے بغیر ان وجوہات کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جنہوں نے ہندوستانی سماج کو کمزور کر دیا ہے اس کے لئے وہ ملک میں محیط، جہالت، ناخواندگی، نفاق، آپسی رنجش، تنگ نظری، عیش پسندی اور لوگوں کی ناکامیوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فکر معاش سے بے بہرا ہونا حد درجہ کی کاہلی گھر سے باہر نکل کر ترقی کی کوشش نہ کرنا، اولاد کی تعلیم کی فکر نہ کرنا، اپنے پرانے علم و ہنر کی بے قدری کرنا، تدبیر کی طرف توجہ نہ دینا اور بیٹھے بیٹھے اپنی تقدیر کو کوستے رہنا وغیرہ ملک کی ابتری کی اہم وجوہات ہیں۔ آج ان سبھی وجوہات پر توجہ دی جا رہی ہے مگر آج سے ۱۰۰ سال پہلے کے دئے ہوئے اس پند نامہ سے شاعر کی حب الوطنی اور دور اندیشی دونوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ اس مسدس میں ہندوستانی عوام کو ملک کی تنزلی کی وجوہات پر سوچنے کو مجبور کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اے اہل ہند سوچو تباہی ہے کس لئے
ہندوستاں پہ قہر الٰہی ہے کس لئے
دل بیقرار صورت ماہی ہے کس لئے
نظروں میں بخت بد کی سیاہی ہے کس لئے

الو گھروں میں شام و سحر بولتا ہے کیوں
لوٗ لوٗ اشک دیدئے تر رولتا ہے کیوں

☆

اگلی کمائی اگلا سا اقبال کیا ہوا
اسلاف نامور کا زر و مال کیا ہوا
سب اہل ہند ہوگئے کنگال ، کیا ہوا
ہر گھر سے چھِن گئی یہ حال کیا ہوا
دولت جو تھی زمیں میں وہ کس طرح گل گئی
ثروت کا ہار مورتی کیونکر نگل گئی

افقؔ کچھ وجوہات کی طرف خاص طور سے توجہ دلاتے ہیں جس کے سبب ہندوستانوں کا قدیمی جاہ وجلال رخصت ہوگیا اور حالات یہاں تک پہونچ گئے کہ اہل یورپ ہندوستانیوں کو نیم وحشی کہنے لگے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی لیاقت، علم اور ہنر سب کچھ بھلا دیا ہے اور ہم اپنی بھلائی کی بات سوچتے تک نہیں ہیں۔ حالات یہ ہیں کہ ملک میں بے وجہ جھگڑا فساد ہوتا رہتا ہے اخلاق، اتفاق، اتحاد کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا ہے۔ تعلیم کے نام پر ہم کچھ بھی کرنا ضروری نہیں سمجھتے حال یہ ہوگیا ہے کہ لوگوں کو اپنے بچوں کو صحیح تعلیم دینے کی بھی فکر نہیں ہے۔ مسدس کے حسب ذیل بند دیکھئے:

اوج قدیم کس لئے رخصت طلب ہوا
کیوں نیم وحشی عہد رواں میں لقب ہوا
گہنایا کیسے ماہ خرد کیا غضب ہوا
کیوں فخر اجل رسیدہ شرف جاں بلب ہوا
سوچو گے یارو ان کے جو اسباب عام کو
گن دو گو انگلیوں پہ باعث کے نام کو

سماج اور ملک کی تنزلی کی اصلی وجوہات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے افقؔ کہتے ہیں:

بے بات بغض و رشک حسد ہے عناد ہے
جھگڑا ہے خرخشا ہے بدی ہے فساد ہے
اخلاق کا سبق نہ ذرا ہم کو یاد ہے
اب اتفاق ہے نہ کہیں اتحاد ہے
الفت پہ اوس پڑ گئی آپس کی لاگ سے
گھر لاکھوں خاک ہو گئے جل کر اس آگ سے

☆

ہمت گنوائی عیش پسندی میں سر دیا
بدکاریوں سے لاکھ کا گھر لیک کر دیا
گھر میں اثاثہ جو تھا خمستاں میں گر دیا
منہ موتیوں سے حسن پرستی کا بھر دیا
دو کا جہاں تھا خرچ وہاں چار اٹھا دیئے
بے آب تاؤ دیکھے لگاتار اٹھا دیئے

افقؔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں میں حد درجہ کی سستی اور کاہلی آگئی ہے وہ اپنا مستقبل اچھا کرنے کے لئے محنت کرنے سے اور روزگار کرنے سے جی چراتے ہیں۔ لوگ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلانے کے لئے فکرمند نہیں ہیں نتیجتاً بچوں کا رجحان بھی پڑھائی کی طرف نہیں ہے۔ تدبیر نہیں کرتے ہیں اور تقدیر کے سہارے بیٹھے رہتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ اللہ کہیں سے روپیہ بھیج دے۔ اس بارے میں افقؔ کا اس مسدس کے حسب ذیل بند دیکھئے:

ہے قحط فکر قوت دل دردناک میں
پیشے جو تھے ملا دیئے غفلت سے خاک میں
بیٹھے ہیں اس فضول ہوس پوچ تاک میں
چھپن کروڑ بھیج دے اللہ ڈاک میں
اس قول پر عمل ہے کہ داتا ہے سب کا رام
اجگر کریں نہ چاکری پنچھی کریں نہ کام

اؔفق کا ماننا ہے کہ جب ہم خود چھلنی میں دودھ دوہتے ہیں تو تقدیر کا رونا بیکار ہے۔
ملک اور قوم کی اقتصادی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ہندوستانی علم اور ہنر حاصل کرنے میں مہارت دکھائے تبھی عوام کی تقدیر پلٹ سکتی ہے۔ اؔفق نے ملک کی پسماندگی کے وجوہات کی تہہ تک پہونچ کر جو کہا ہے وہ اگلے کچھ بندوں میں دیکھئے:

یاروں جو دل پہ گرد جہالت جمی نہ ہو
گر اکتساب علم و ہنر میں کمی نہ ہو
زلف نشاط عیش میں یہ برہمی نہ ہو
اشک الم کی دیدہ دل میں نمی نہ ہو
صرف اک علم دافع آزار عام ہے
اقبال زر خرید اسی کا غلام ہے

☆

یہ نوح بہر کشتی حال تباہ ہے
آئینہ جمال نمایاں رفاہ ہے
گمراہ منزلت کے لئے خضر راہ ہے
منزل رسا نے رہ گذر عز و جاہ ہے
زینہ خدا رسی کا ترقی کی کل ہے یہ
بے نیش جس سے نوش ملے وہ اصل ہے یہ

اؔفق نے ہندوستان کو ترقی یافتہ ملک بنانے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بات آج ۱۰۰ برس بعد بھی ۱۰۰ افیصدی سچ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تعلیم کی طرف توجہ دینا جس کے دائرہ میں علم حاصل کرنا، فن میں مہارت حاصل کرنا اور نئی نئی تحقیقات اور ایجاد کرنا تینوں چیزیں آتی ہیں۔ سبھی معموں کا واحد اور بے ضرر حل ہے۔ تعلیم حاصل کر کے ہی ہم آج بھی برسہا برس کے زوال سے نجات پا سکتے ہیں اس لئے انہوں نے کہا ہے:

اے حل کنندگان معمہ عہد حال
فرمایئے ترقی تعلیم کا خیال
گذرا ہے سر سے آب یم کاہش و ملال
علم و فنون و کسب کے حل کیجئے سوال
جو علم کے وظیفے ہیں سب ورد کیجئے
ہر فن کو استاد کو شاگرد کیجئے

اقبؔ نے اس مسدس میں ایک نفسیاتی مسئلہ پر بھی انگلی رکھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمپر حکومت کرنے والے انگریز ہمیں جاہل اور غیر مہذب قرار ہیں اور ہم بھی ماننے لگے ہیں کہ شاید ہم ایسے ہی ہیں کیونکہ ہم نے اپنے قدیمی اوج کو بالکل بھلا دیا ہے۔ ہمارے اندر ایک غلام قوم کی ذہنیت گھر کرگئی ہے جس کے زیر اثر ہم انگریز حاکموں کی عادتیں وغیرہ کی نقل کرکے جھوٹھی شان میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن ان کے عروج کی وجوہات جان کر اپنا مستقبل سنوارنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ اقبؔ ملک والوں کو اپنے بہبودی کے عقدہ حل کرنے کے لئے یہی نصیحت کرتے ہیں کہ جس طرح ہو ہمیں علم وفن کی ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لینا چاہیئے۔ غلامی، پچھڑے پن اور غریبی کے عذاب سے نجات پانے کا یہی اور صرف یہی ایک راستہ ہے:

آریہ ورت کی تاریخی عظمت

اقبؔ نے اپنے مشہور مسدس ''آریہ ورت کی تاریخی عظمت'' میں اہل ہند کو ان کے وطنکی سبھی خوبیوں سے واقف کرایا ہے اور ہر طرح کی دلیلیں دیکر سمجھایا ہے کہ کیوں ان کا ملک سارے جہاں سے اچھا ہے۔ مسدس کے پہلے دو بندوں میں شاعر نے بلند، بیکنٹھ اور جوالہ جی کی تلمیح کے ساتھ آریہ ورت کی عظمت بیان کی ہے:

آریہ ورت سا ملک اور زمانہ میں نہیں
کسی قصہ میں روایت میں فسانہ میں نہیں
خلد کے جامہ میں بیکنٹھ کا بانے میں نہیں
دست قدرت کے کمالات دکھانے میں نہیں
جاگتی جوت جو دیکھے کوئی جوالہ جی کی
دل ناقائل قدرت کی مٹے تاریکی

☆

اسے ہندو ہی نہیں فرد زماں کہتے ہیں
زبدہ دہر اسے جغرافیہ داں کہتے ہیں
ایشیا والے اسے نیم جہاں کہتے ہیں
اہل اسلام اسے خلد نشاں کہتے ہیں
ہے جو زرخیز تو ہے گرمی بازار اس کی
لعل اگلتی ہے زمیں سال میں دوبار اس کی

افق اگلے بندوں میں پہلے دو بندوں کے دعوی کی دلیل دے رہے ہیں۔ افق نے اس مسدس میں آریہ ورت کی عظمت رفتہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کروچھیتر کے میدان میں تیروں کے سیج پر سونے والے بھیشم پتاماہ کی ریاضت اور نفس کشی کا کوئی جواب نہیں ہے۔ سائنس ابھی تک یہ سمجھ نہیں پائی ہے کہ جوالہ جی کی آگ کس طرح لگاتار جلتی رہتی ہے اور کسی کے بجھائے نہیں بجھتی۔ سائنس نے تمام تحقیقات کر کے جن باتوں کو اب صحیح سمجھا ہے اس نتیجہ پر آریہ ورت کے لوگ بہت پہلے پہونچ چکے تھے۔ وہ کہتے ہیں:

ایک ہے اور ولایت کی بہار اس کی خزاں
مشہتر مادر ہر علم اسی کی ہے زباں
صرف اسی میں ہے کروچھیتر سا جنگی میداں
بان کی سیج پہ سویا ہے کوئی اور کہاں

طور پر حضرت موسیٰ نے تو ضو دیکھی ہے
سچ کہے کوئی توا توڑتے لو دیکھی ہے

اپنے اس دعوی کو کہ ہر علم ہندوستان کی تحقیقات سے ہی نکلا ہے اقق تمام دلیلیں دے کر ثابت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ علم نجوم یا نکچھتر ودیا میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے ہمارے سپت رشی یعنی مشرق میں سات ستاروں کے جھرمٹ کو یورپین ابھی تک سات ریچھ بتاتے ہیں۔ یورپ میں سمندر سے سفر کرنے والوں میں کولمبس کا بہت نام ہے لیکن کولمبس سے کہیں پہلے بھارت کا راجہ بلی پاتال گیا تھا۔ یہاں کے پتھروں میں جادوئی تاثیر دیکھی گئی ہے جن کے جسم پر چھو جانے سے ہی زخم بھر جایا کرتے تھے۔ یہاں کی زمین بیش قیمتی کانوں سے بھری ہوئی ہے۔ لوگ دھاتوں اور پتھروں کی خواص سے پوری طرح واقف تھے۔ آریہ ورت کی عبادت گاہیں اس بات کا تعارف کراتی تھی کہ آریہ ورت مال و دولت سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں کا تمام علم سائنس یہ وگیان کی تحقیقات کی وجہ سے تھا۔ دیومالا کی کہانیاں صرف کہانیاں نہیں تھی ان میں فلسفہ الٰہیات کی پوری بحث ہے اور ویدوں جیسی علم سے بھری ہوئی مقدس کتابیں اسی ملک کی ہیں۔ یہاں مانا گیا ہے کہ ایشور کے ساکار اور نراکار دونوں روپ ہیں اور اس بات پر سارے مذاہب متفق ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وید جو علم کے خزانہ ہیں ان کے بہت سے علوم پر علم سائنس نے ریسرچ کر کے بتا دیا ہے کہ ان کے فارمولے صحیح اور کامل ہیں۔ یہاں کی ندی گنگا ہندوستانیوں کے لئے صدیوں سے پاکیزگی کی علامت ہے۔ گنگا کے پانی میں کبھی کیڑے نہیں پڑتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اس کا پانی پاک ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بخش اور روح پرور ہے۔ اگلے دو بندوں میں ہندوستان کی عظمت بیان کرتے ہوئے اقق کہتے ہیں:

کون ملک ایسے ہیں ایسے ہوئے اوتار جہاں
بن کے ساکار نظر آئے نراکار جہاں
ہوں صحائف یدی قدرت کے لکھے چار جہاں
تر گئے فیض سے گنگا کے گناہگار جہاں

جہاں نرگ اور بلی ایسا کوئی دانی نکلے
جہاں گنگا سا کسی بحر میں پانی نکلے

☆

ہوگی کس طور ولایت میں بہار کشمیر
مثل اودھ کے ہوئی کس ملک کی بار آور کھیر
ہے کہاں شام اودھ صبح بنارس کی نظیر
سنو طوطی لب کلک حزیں کی یہ صفیر

از بنارس نمی روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسر لچھمن و رام است ایں جا

(میں بنارس سے نہیں جاؤں گا یہ عام لوگوں کی عبادت کی جگہ ہے یہاں ہر برہمن رام اور لچھمن کا بیٹا ہے۔ (فارس کے عظیم شاعر علی حزین)

ہندوستان کو فطرت نے مختلف قسم کے موسم عطا کئے ہیں۔ ملک کا جغرافیہ یکساں نہیں ہے کشمیر، اودھ اور بنارس میں مختلف مگر خوشگوار فضا ملتی ہے یہاں بڑے بڑے ریاضت کش رشی منی اور عالم ہوئے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے علم کاشت میں بہت پہلے ہی ترقی کر لی تھی۔ دنیا میں زیادہ تر ملکوں میں قدرتی وبائیں نازل ہوتی ہیں جبکہ ہندوستان میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں ہر طرح کے موسموں کا مزہ ہے نہ بہت جاڑا پڑتا ہے اور نہ بیحد گرمی۔ جس کی وجہ سے یہاں پانچ پانچ فصل ایک ہی سال میں اگا کرتی ہیں۔ افق کہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں ہندوستان جیسی سرزمیں رہنے کے لئے ملی جو ہر طرح سے انسانی زندگی کے لئے سکون بخش ہے۔ یہاں مندروں میں ایسے پہونچے ہوئے فقیر مل جاتے ہیں جو علم طب کے ماہر ہیں اور جو بے راہ رو لوگوں کو اللہ تک پہونچنے کی راہ ہموار کر سکتے ہیں اور انہیں موکچھ یا مکمل نجات کا راستہ بتا سکتے ہیں:

اے بھرت ورش کی سنتان زہ بخت و نصیب
سر زمیں اس کی ہوئی تیری سکونت کو نصیب

پاس بیکنٹھ ہے کیلاش جہاں سے ہے قریب
جہاں مندر میں ہر اک روگ کے ملتے ہیں طبیب
جہاں انسان سے ایشور کی نگاہیں مل جائیں
جہاں گرو منتر سے بیکنٹھ کی راہیں مل جائیں

افق یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ملک کے رشیوں منیوں، سادھوسنتوں کی تلاش اور جستجو سے نایاب جڑی بوٹیوں کے خواص اور ان کی فطرت کی معلومات ہوگئی ہیں جو سستے داموں میں اکسیر کا اثر رکھتی ہیں۔ یہاں کی گھاس پھوس میں بھی غضب کی تاثیر ہے۔ یہاں کے لوگوں نے جڑی بوٹیوں کے بل پر بھوک پیاس تک کو جیت کر دکھا دیا ہے۔ یہاں کے تلسی کے پتے کے استعمال سے تمام بیماریاں اور تپ دق جیسا بھیانک مرض بھی قابو میں لایا گیا ہے جس سے دوسرے ممالک کے لوگوں کو حیرت ہے۔

افق کو فخر ہے کہ اس ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہاں کے طالب علم جو سنسکرت کے ماہر ہیں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ قابلیت رکھتے ہیں۔ سنسکرت زبان شاعرانہ ہونے کی وجہ سے بہت جلدی حفظ ہو جاتی ہے۔ ہندوستانی قدرتی طور پر دوسروں کی زبانیں سیکھ سکتے ہیں دوسری زبانوں کا لہجہ سیکھ سکتے ہیں اور ان زبانوں میں اچھے سے اچھا ادب لکھ سکتے ہیں مگر دوسرے ممالک کے لوگ ایسا نہیں کر پاتے ہیں۔ انگریز یہاں برسوں حکمراں رہے ہیں پر نہ ہندی نہ اردو نہ کسی زبان کا لہجہ سیکھ سکے ہیں:

رہنے والے نہیں کس ملک کے موجود یہاں
ٹوٹتی ان کی نہیں یاں کی زبانوں پہ زباں
مرحبا اے شرف قدرتی ہندوستاں
ہر زباں کے کملاء آج بھی ملتے ہیں جہاں
گو انہیں عجز سے دعوائے علی الشرک نہ ہو
کیسی تقریر کہ لہجہ میں بھی کچھ فرق نہ ہو

☆

سیکھ سکتے ہیں یہ ہر ملک و ولایت کی زباں
دل پہ رکھ لیں تو ریاض ان کا بنادیں ہمہ داں
کل ولایات میں گویا کی طرح ہے انساں
ہند والوں کی سی ہے ان میں کوئی بات کہاں
ہم جو انگریزی لکھیں لوگ قلم کو چومیں
بات کر سکتے نہیں یوروپین اردو میں

یوروپین سمجھتے ہیں کہ دنیا میں توپ سے انکی پہچان ہے مگر ہند میں بارود نہ جانے کب سے استعمال ہوئی ہے۔ ہالی ووڈ اور ایلیٹ تک اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ یہ ملک ایسا ہے کہ یہیں کم خرچ میں لوگوں کو اچھی سے اچھی غذا مل سکتی ہے۔ ایک اور بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ غیر مما لک میں لوگ اب جانوروں سے کام لینے لگے ہیں۔ دوسرے مذہبوں میں اب جانوروں کے کرتبوں کا ذکر ہے جیسے مشہور ہے کہ شاہ سلیماں کا ہدہد انہیں ہر بات کی خبر دیتا رہتا تھا عیسیٰ کا مرغا جب بولتا تھا تب اس سے وہ ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں جان لیتے تھے مگر ہندوستان میں ہزاروں سال پہلے سے ہی جانوروں اور پرندوں سے کام لینے کا اور ان کی مدد سے بڑی بڑی جنگیں تک جیتنے کا ذکر ہے۔ گدھ، گروڑ، کاغ بھشنڈ، بندروں اور ریچھوں کا تمام کارناموں کا راماین میں ذکر ہے۔ ہندوؤں کی سبھی دیویوں دیوتاؤں کی سواری کا تصور کسی جانور یا پرندہ کا ہی ہے۔ یعنی دیوتاؤں کی سواری کے لئے جانوروں کی ضرورت محسوس کی گئی اور انہیں عزت سے دیکھا گیا۔ شیر، ہاتھی اژدہے، مور، ہنس، الو، مگر مچھ یہاں تک کہ چوہا بھی کسی نہ کسی دیوی یا دیوتا کی سواری ہیں۔ یہاں کے لوگ ہاتھی جیسے بڑے جانور سے لیکر تیتر، بٹیر تک کو طرح طرح کے کرتب سکھانے میں ماہر ہیں۔

افق کہتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پرانے زمانے میں بہت تیز رفتار سواریاں موجود تھیں۔ اس کی ایک مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ یہاں بنارس سے گنگا جل گجرات کے سومنات مندر تک روز پہونچایا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ میں تھا جب ریل کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کا نظریہ وسیع رہا ہے اور انہوں نے غیر

مذہب والوں سے ان کے مذہب کی اچھی باتیں ہمیشہ سنی اور سمجھی ہیں۔ یہاں کے مندروں کی عمارتیں خوبصورتی اور تزئین کاری یا نقاشی میں بے مثال ہیں۔ ہندوستان کی بے شمار دولت کے قصہ سن کر محمود غزنوی جیسے لٹیرے ہند میں آتے رہتے تھے۔ اس خوشحال ملک کی بے شمار دولت کو دیکھ کر روم کے بادشاہ نے یہاں کے راجہ گوہا کے ساتھ اپنی بیٹی کی نسبت کر دی تھی یہاں کی خواتین کے نظریہ زندگی اور پاک دامنی کو فخر کے ساتھ بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ ہندوستان کی خواتین کی طرح نیک صفات عورتیں اور ملکوں میں کہاں ہوتی ہیں جو اپنے خاوند کے لئے جان تک دینے کو تیار رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ چتوڑ کی رانی پدمنی کی کہانی بیان کرتے ہیں جس نے آگ میں جل کر جان دینا بہتر سمجھا لیکن علاؤالدین خلجی سے رشتہ نہیں جوڑا۔ پدمنی کے ساتھ ہزاروں راجپوت عورتوں نے بھی آگ میں جل کر جان دیدی کیونکہ انکے خاوند علاؤالدین سے ہوئی جنگ میں اپنی جان کی قربانی دے چکے تھے۔ یہاں کی عورتیں اپنے خاوند کی خدمت کو اپنا مذہب سمجھتی ہیں اور اسے اللہ کا حکم مانتی ہیں۔ یہاں کی قوموں میں شادی بیاہ کے سخت قوانین ہیں جنہیں سب کو ماننا پڑتا ہے۔ افق ہندوؤں کی سخاوت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ وہ غریبوں اور مظلوموں کے ہمدرد ہیں۔ یہ تہذیب یافتہ قوم مل بانٹ کر کھانے میں یقین رکھتی ہے۔ لوگ لاکھ کہیں کہ ہندوستانیوں کے رہنے سہنے کے کوئی اصول نہیں ہیں اور یہ قوم مہذب نہیں ہے لیکن ان باتوں میں ذرا بھی سچائی نہیں ہے۔

مسدس کے ایک بند میں افق نے ہندوستان کے چکرورتی اشوک مہان جیسے راجہ کا ذکر کیا ہے جس نے کلنگ میں جنگ جیتنے کے بعد جنگ سے توبہ کر لی تھی اور اپنی سخاوت سے اور نظام انصاف سے ساری دنیا میں اپنا نام کیا۔ یونان کی کئی کتابوں میں بھی ذکر ہے کہ ہندوؤں میں وفاداری، ہمدردی، بہادری، صاف دلی اور کسی کو بھی اپنا بنا لینے جیسی خوبیاں ہیں۔ مسدس کے اگلے دو بندوں میں شاعر نے یہی بیان کیا ہے:

تھا جو یاں راجہ اشوک اک وہ لاثانی تھا
عزت تاج شہی شان جہاں بانی تھا
فوجداری کی عدالت کا وہی بانی تھا
موجد خدمت سر رشتہ دیوانی تھا

ناز ان محکموں پر آج بشر کرتے ہیں
ہم مگر اگلے زمانہ کی خبر کرتے ہیں

☆

دیکھو یونان کی تاریخ کو کیا لکھتی ہے
ہند کو مسکن ارباب وفا لکھتی ہے
ہندؤں کو جری و اہل صفا لکھتی ہے
مدحت خوبی خواصان خدا لکھتی ہے
یاں کے محتاجوں نے یونان کو حیران کیا
جیتے جی ملک سکندر میں نہ جل پان کیا

ہندوستان سے یونان کو جو تحفے بھیجے گئے تھے انکو دیکھ کر وہاں کے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ یہاں کی قدیم قانونی کتاب منوسمرتی میں بیان کئے گئے قانون کا کوئی جواب دوسرے ملکوں کے قوانین میں نہیں ہے۔ یہاں کے مذہب کے اصولوں کی علم کاشت کی، علم لباس اور کپڑا بنانے کے ہنر کی دوسرے ممالک کے لوگوں نے بےانتہا تعریف کی ہے۔ ہندوستان کو بہت لوگوں نے علم کا گھر کہا ہے۔ تجارت میں بھی یہاں کے لوگوں نے نام کیا تھا یہاں کے لوگ ایماندار، صلح پسند اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ امن پسند بھی تھے۔ سیلف ہیلپ، خود اعتمادی اور باہمی اتحاد سے کام کرنے کا طریقہ یہاں بہت پہلے سے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ انہیں خوبیوں کو افق نے مسدس کے مندرجہ ذیل بندوں میں بیان کیا ہے:

ہند والوں نے جو بھیجے تھے تحائف نایاب
اہل یوناں کو ہوئے وہ سبب استعجاب
دل سے تسلیم کئے امن و اماں کے اسباب
کل قوانین ''منو'' کا نہ ملا ان کو جواب
چیز کوئی نہیں وہ کی نہ ہو جس کی تعریف
کی رقم دھرم کی دولت کی پولیس کے تعریف

☆

قول ان کا ہے زریں ہند میں صرف آئے نظر
ہے فقط ہند زراعت کی جگہ علم کا گھر
کی زباں ہند کے ملبوس کی تعریف میں تر
دیکھ کر فلسفہ میں ان کا شرف ہیں ششدر
درفشاں ہیں صفت جوہر انسانی میں
ہے زباں لال تجارت کی ثنا خوانی میں

☆

یاں کے لوگوں کو یہ اعزاز جہاں لکھتے ہیں
صادق و صلح پسند و ہمہ داں لکھتے ہیں
اہل جرأت صفت شیر ضیا لکھتے ہیں
اہل ایماں سبب امن و اماں لکھتے ہیں
پالیسی لارڈ رپن کی سی وہ لاثانی تھی
سیلف ہیلپ دیکھ کے انکی انہیں حیرانی تھی

دنیا کے تمام حصوں پر ہندوؤں کا عمل تھا۔ حالانکہ ہزاروں صدیاں گذر گئیں لیکن ان کی فتح کے نشان پیسیفک اوشن کے جزیروں اور اٹلانٹک اوشن کے پار امریکہ میں اب بھی ملتے ہیں۔ افق نے اپنے اس دعوی کے ثبوت کے طور پر حسب ذیل بندوں میں اسطرح بیان کیا ہے:

ہیں جو کل پیسیفک اوشن کے جزائر سوئے شرق
ان کی شمشیر چمکتی رہی واں صورت برق
گو ہوئی کشتی اقبال یم شور میں غرق
آریہ ورت کی عظمت میں نہیں نام کو فرق
اب تک آتی ہے نظر فخر شرف کی صورت
پوجتے لوگ ہیں مہاراج سگر کی مورت

☆

یہ سگر کون تھے پہچان لیں اہل فرہنگ
جن کو دکھلایا کپل منی کی دعا نے نیرنگ
جن کے فرزندوں نے پاتال میں کھودی تھی سرنگ
نسل میں جنکی بھگیرتھ ہوئے جو لائے تھے گنگ
دخل گر پیسیفک اوشن میں نہ پایا ہوتا
پرتماؤں کا سگر کی نہ یوں پایا ہوتا

☆

پار اٹلانٹک اوشن کے بھی یاں کا تھا عمل
دیکھو امریکہ کے حالات تو ہو عقدہ حل
دیوتا ہیں جو گنیش ابن مہادیو اٹل
مندرج نام گرنتھوں میں ہے جن کا اول
پہلے تھی منزلت امریکا میں بیحد ان کی
ہوتی ہیں مورتیں کھدنے سے برآمد ان کی

افق نے بیان کیا ہے کہ راجا سگر ہندؤں کے دیوتا گنیش کی مورتیاں اور مندروں کے نشانات پیسیفک اور اٹلانٹک سمندروں کے جزیروں اور امریکا میں پائے گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہند کے لوگ بہت پہلے سے دوسرے ممالک میں جہاز وغیرہ سے سمندر پار کر کے جایا کرتے تھے اور ان کا مذہب اور ان کی تہذیب وہاں کے لوگوں میں پھیلی تھی۔ اس وقت کولمبس کا کہیں نام تک نہیں تھا۔

اشوک کی کیرتی استمبھ سائبیریا، مصر اور سیلون تک میں ہیں جن پر سنسکرت زبان پالی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ ہندوستان کا بودھ مذہب دنیا کے تمام ملکوں میں پھیلا اور بڑھا۔ رسالہ جات ایشیاٹک سوسائٹی و تاریخ آر.سی.دت کے حوالہ سے افق کہتے ہیں:

ملک سائبیریا سردی ہے جہاں کی مشہور
وہم پہونچے نہ جہاں ہند سے جو اتنا ہے دور
مصر میناروں کے جس کے ہے جہاں میں مذکور
اور سیلون جسے سمجھے ہے لنکا جمہور

سب میں موجود نشاں جوہر شمشیر کے ہیں
کیرتی استمبھ اشوک ایسے جہانگیر کے ہیں

کشمیر کے راجاؤں کی تواریخ لکھنے والے کلہن کی مشہور تصنیف ''راج ترنگنی'' میں لکھا ہے کہ مصر کا پہلا راجا سورج بنس کا تھا۔ راجہ رام دیو کے دربار میں روم کا راج دوت رہتا تھا۔ تاریخ مارسمین کے حوالہ سے افق نے بیان کیا ہے کہ یہاں کے راجہ بلوم نے چین کو فتح کیا، مہاراج سری گنج نے گنجی شہر بسایا اور دیوپال نے تبت کو فتح کیا تھا۔ مندرجہ ذیل بندوں میں یہی بیان کیا گیا ہے:

مصر کے ملک کا پہلا شہ خورشید کلاہ
بنس میں تھا سری سورج کے وہ راجا میناہ
اس کی تحقیق ہو منظور جسے خاطر خواہ
دیکھ لے آنکھوں سے خود راج ترنگنی ہے گواہ

رام دیو اک جو راجہ تھا ظفرمند فہیم
ایلچی روم کا دربار میں اس کے تھا مقیم

☆

تھا مہاراجہ بلوم اک شہنشاہ غیور
فاتح چین اسے کرتے ہیں مؤرخ مشہور
شہر گنجی جسے اب کہتے ہیں غزنی جمہور
اس کو مہراج سری گنج نے کیا تھا معمور

دیوپال ایک جو تھا شہرہ عام اس کا ہے
فتح تبت کے لئے دہر میں نام اس کا ہے

ہندوستان کے قدیمی اسلحہ جات کا ذکر کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ جدید دور کے جو جدید ترین اسلحے ہیں اس کے کچھ نہ کچھ نشانات آریہ ورت کی قدیم تہذیب اور تصانیف میں پائے جاتے ہیں ان میں ناگ پھانس، برون استر، اگنی بان اور پاشوپت استر کا خاص طور سے ذکر ہے۔ان اسلحہ جات کا بیان انڈو آرمس نام کی کتاب میں بھی کیا گیا ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فاسفورس کی معلومات یہاں کے لوگوں کو بہت پہلے سے تھی، افق کہتے ہیں:

آریہ ورت کے شستروں کے مٹے گو ہیں نشان
ناگ پھانس اب ہے برون استر نہ ہے اگنی بان
فاسفورس کی جو سائنس نے کی ہے پہچان
ٹھیک ناواقفوں کے ہونے لگے ہیں اوسان
ہے یہ جز اگنی کے بانوں کا ذرا جان یہ لو
شعلہ زن اس سے ہی ہوتی ہے پہچان یہ لو

☆

پانی برسانے کی جو کرتے ہیں موجد تدبیر
قائم ان سے ہے برون استر کی اک تازہ نظیر
اور وہ لوگ جو بجلی کی ہیں سمجھے تاثیر
پاشوپت استر کی اک کھینچ رہے ہیں تصویر
دست و پا سیسہ کی بجلی سے جکڑنے والے
ناگ کی پھانس کے اجزا سے بنے ہیں آلے

ہند کی ایک مشہور تصنیف شکرنتی میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ بندوق بنانے میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔شکرنتی کا حوالہ دیتے ہوئے افق کہتے ہیں:

توپ بندوق جو اس وقت ہیں مشہور انام
نالک استر کی یہ ہیں چھوٹی بڑی دو اقسام
دیکھ لو پوتھی ذرا جس کا ہے شکرنتی نام
جس میں ہتھیاروں کی ترکیب ہے رہین ارقام

ہائے اس قسم کے اب اور رسالہ بھی نہیں
پڑھنے والے بھی نہیں دیکھنے والے بھی نہیں

کریں سب حاشیہ کی اصل عبارت سے خیال
درج اس بارے میں کرتی ہیں وہ پوتھی سب حال
پانچ بالشت کی درکار ہے بندوق کی نال
نال میں چھید ہو سیدھا نئے مطرب کی مثال
مکھیاں سوئے ہدف آنکھ لڑانے کے لئے
نال کے دونوں سروں پر ہو نشانے کے لئے

ہندوستان کی قدیم کتابوں میں پشپک ومان کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں ہوائی جہاز کا بھی کوئی پرانا روپ ضرور تھا۔ بالمیکی رشی نے بھی پشپک ومان کے بارے میں لکھا ہے۔ راجہ بھوج کے زمانہ میں بنا آدمی کی مدد سے صرف مشینوں سے چلنے والے نہایت تیز رفتار گھوڑے کا ذکر ہے جو گھڑی بھر میں گیارہ کوس تک جا سکتا تھا۔

افق کا دعویٰ ہے کہ ہر قسم کے علم کا بانی ہندوستان ہی ہے۔ یہاں کے علم کا کوئی ثانی نہیں ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہماری قدیم کتابیں جن میں تحقیقات کے تمام راز پوشیدہ ہیں انکو پڑھنے والے اور سمجھنے والے اس دور میں نہیں ہیں۔ اپنے اس دعوی کی سند میں افق نے بہت سی دلیلیں دی ہیں۔ حسب ذیل بندوں میں افق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جدید سے جدید علم کا بانی ہند ہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سانکھیہ درشن کو ذرا فلسفہ والے دیکھیں
ڈاکٹر ہند کے ویدک کے رسالہ دیکھیں
لیں دھنور ودیا کی پستکیں آلے دیکھیں
انجینئر جو ہیں وہ مندر و شوالے دیکھیں

پرتِ بمب اپنے یہاں پہلے تھا آپٹکس کا نام
شلپ ودیا ہے زمانہ میں میکینکس کا نام

☆

یوکلڈ ریکھا گنِت، نیائے ہے لاجک منطق
سائیکلوجی کے ہوئے یاد وِشیشک سے سبق
دفتر الجبرا کے یاں بیج گنِت کے ہیں ورق
عقدہ آ.کرشن میں ہر شے کی کشش کے ہیں ورق
صرف کی نحو کی ہے ودیا اعلیٰ ودیا
کاویہ لکھنے کے لئے سب سے ہے بالا ودیا

☆

ہے کھگول ایسٹرونومی جو مروج ہے یہاں
پڑھیں بھوگول کل اس وقت کے جغرافیہ داں
اور بھوگربھ کی ودیا ہے جیالوجی کا بیاں
گنتیاں یاں کی جو ہیں ہندسہ مشہور جہاں
کل کیمسٹری میں رسائن کی ہے سوارتھ ودیا
علم طبعی کا ہے القاب پدارتھ ودیا

☆

ودیا ہند میں گندھرو کی ہے موسیقی
جیوتش اس ملک کی جو تھی وہ ہے ایسٹرالاجی
ہوا سامدرِک اس عہد میں فرناگومی
جو تھی ترکون کی ودیا وہ ہے ٹرگنامیٹری
میگنیٹزم ہے سم موہنی ودیا یاں کی
دھاتو ودیاجو ہے وہ آج ہے میٹرالاجی

☆

برہمہ ودیا میں ہے توحید خدائے رزاق

جوگ ودیا جو ہے مشہور وہی ہے اشراق
دیکھو اسمرتی کی تعلیم قوانیں میں ہے طاق
زولوجی جنتُ کی ودیا میں تھا بھارت مشاق
یوں ہی جو علم ہیں وہ سنسکرت میں سب ہیں
غیر ملکوں کی وہ ایجاد بتاؤ کب ہیں

برہم ودیا یعنی فلسفہ الٰہیات، یوگ ودیا یعنی علم عملیات، علم قانون، علم حیوانات، علم طبعی، علم موسیقی وغیرہ سبھی علوم کے متعلق سنسکرت میں کتابیں ہیں۔ ہندوالوں نے ان سبھی علوم میں اہم تحقیقات کر کے کمال حاصل کیا تھا۔ افقؔ کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا علوم کے علاوہ کسی نئے علم کی ایجاد ہوتو کوئی بتائے اور وہ اپنے دعویٰ کی سند ڈھونڈ کر لائے۔

افقؔ نے مصر کے عالم ٹالومی اور یونان کے پائیتھا گورس کا ذکر آر. ایل. متر ایل. ایل. ڈی. کی ایک تصنیف کے حوالہ سے کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان دونوں کے کمالات آریہ ورت میں مشہور تھے۔ مہابھارت کے زمانہ میں یدھشٹھر کی یگیہ شالہ ٹالومی نے بنائی تھی۔ پائیتھا گورس نے ہندوستان کے رشیوں سے ایسٹرانامی اور تناسخ کا علم حاصل کیا تھا:

ٹالومی جس کے کمالا ت ہیں مشہور انام
آریہ ورت میں معروف تھا اس کا نام
ہند سے اس کے تعلق میں کسے ہوگا کلام
اس کے کاموں سے بھرت کھنڈ کا ثابت ہے قیام
مہابھارت میں ہے کی جلوہ نمائی اس نے
یگیہ شالہ تھی یدھشٹھر کی بنائی اس نے

☆

پائیتھا گورس کے بھی ہیں سنسکرت میں مذکور
یونا چارج بھرتکھنڈ میں تھا وہ مشہور
رشیوں کے فیض کا ہے اس کی لیاقت سے ظہور
مسئلہ دیکھیں تناسخ کا ہر ایک اہل شعور

ایسٹرانامی کا فر فز جو سبق یاد ہوا
فیض سے ہند کے یورپ کا یہ استاد ہوا

☆

ناز یورپ کو ہے دنیا کے محقق ہیں یہیں
عقل کے پتلوں کی بوباس نہیں اور کہیں
اہل یورپ ہی نے گردش میں بیاں کی ہے زمیں
ہند والوں میں کچھ اس بات کی تحقیق نہیں

آریہ بھٹ کا جو سدھانت نظر سے گذرے
دل میں ایک تیر تعجب کا جگر سے گذرے

افق لکھتے ہیں کہ آریہ ورت کا ایک عالم منطق کلیاں تھا۔ جس کو یونان میں کلینس کہا جاتا تھا اس سے ارسطو نے فیض حاصل کیا تھا اس سے ثابت ہے کہ منطق کا اصلی وطن ہندوستان ہی ہے، وہ کہتے ہیں:

آریہ ورت کا ایک عالم منطق کلیاں
طینس جس کو رقم کرتی ہے یوناں کی زباں
بعض اصحاب تواریخ یہ کرتے ہیں بیاں
کہ ارسطو کی لیاقت سے ہے فیض اس کا عیاں

جو ارسطو کو افق موجد فن جانتا ہے
کشور ہند کو منطق کا وطن جانتا ہے

تھا جو استاد ارسطو کا حکیم افلاطوں
جس کا خم تھا صفت خم مسیح گردوں
ہند کا اس کی لیاقت سے ہے اعزاز افزوں
پئے اثبات ہے فیضی کی شہادت موزوں

تب تم ہند کا وہ نام عیاں کرتا ہے
اسے استاد افلاطوں کا بیاں کرتا ہے

☆

طبع تم ہند سے واقف نہیں یاں خواص و عوام
ہاں ابوالفضل کے بھائی سے سنا ہے یہ نام
اس سے ظاہر ہے کہ وہ شخص نہیں اس میں کلام
تھا حکیم ایسا نہ کوئی جو ہو مشہور انام
واقعی یاں کے حکیموں میں جو کم مایہ تھا
اس کا حکمت میں فلاطوں کو بہم سایہ تھا

مشہور دانشور بوعلی سینا نے ہند کے علم کی بہت تعریف کی تھی۔ ڈاکٹر ہنٹر نے لکھا ہے کہ جراحی میں چرک رشی کا کوئی ثانی نہیں تھا اور اس کی ایجاد سے آج تک لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں توران اور ایران کے شاہ ہندوستان کے گرو گورکھناتھ کے شاگرد رہے ہیں۔ افق کہتے ہیں کہ جرمن سنسکرت داں میکسمولر مانتے ہی نہیں کہ ہند والوں نے کبھی کوئی ایجاد بھی کی۔ افق کہتے ہیں کہ یہ کہنا انکی عقل اور آنکھوں کا قصور ہے۔ ہند کی نہایت اہم ہندسوں کی ایجاد، جس پر تمام میتھ میٹکس کا دارومدار ہے کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہندوستان کی تحقیق کی ہوئی صفر یا زیرو کی جانکاری لاجواب ہے۔ صفر کی بنیاد پر سائنس کی تمام ایجادیں ہوئی ہیں اور اسی سے ساکار نراکار کے عقدے بھی حل ہوئے ہیں۔ صفر کی خوبی کی کوئی حد ہی نہیں ہے، حسب ذیل بند دیکھئے:

کہتے ہیں صاحب موصوف سنے سب احباب
کہ نہیں ہند کی ایجاد کا ثانی نہ جواب
آریہ ورت کے اسلاف تھے تفضیل مآب
خلق نے حاصل انہیں سے ہے کیا علم حساب
ہندسہ ان سے جو ہیں ایک سے نو تک پائے
بڑھ کے ہر صنعت و ایجاد سے بیشک پائے

☆

کھٹکے ہیں ہند کی ایجاد سے ہر ایک ایجاد
جان سکتے ہیں ریاضی میں ہیں جو لوگ استاد
صفر کی ہند کے لوگوں نے وہ ڈالی بنیاد
کہ زمانہ پہ کھلی شاہرہ استعداد

صفر کی سی کوئی ایجاد کسی سے نہ ہوئی
صنعت اس طرح خداداد کسی سے نہ ہوئی

افق نے اپنے کلام میں ہندوستانی خواتین کو بہت اعلیٰ وارفع مقام دیا ہے۔ یہاں کی خواتین اپنی قدروں کی ہمیشہ حفاظت کرتی ہیں۔ اپنے شوہر کے لئے ایثار وقربانی کے جذبہ کی ان کے لئے کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ خاوند کے فوت ہو جانے پر بیوہ کی زندگی جینے کی جگہ وہ خوشی خوشی مرنا تک پسند کرتی ہیں۔ ایسی تمام مثالیں اور جہاں شوہر کے مرنے کے بعد بیویاں آگ میں جل کر ستی ہوگئی۔ حالانکہ قانون بننے سے عورتوں کا ستی ہونا روک دیا گیا ہے مگر اب ہندوستانی بیوائیں زندہ رہ کر آتش غم میں تا عمر جلتی رہتی ہیں۔

بیوہ عورتوں کو ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ان کے کسی کام سے شوہر کی روح کو بھی کبھی غم نہ ہو اس لئے وہ حد درجہ نفش کشی سے زندگی بتاتی ہیں اور ہمیشہ پرودگار سے لو لگائے رہتی ہیں۔ افق کی نگاہ میں ایسی زندگی جینے والی عورتیں رشیوں اور سنتوں کی طرح دنیا ترک کرنے دینے والی ہوتی ہیں۔

ہندو مذہب کے کچھ خاص طور طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ بھر تکھنڈ کے مذہب کے طور طریقہ باقی مذہبوں میں بھی ملتے ہیں۔ کعبہ میں زائرین سر سنگ کی عبادت ویسے ہی کرتے ہیں جیسے ہندو پتھر پوجتے ہیں، ہندو گنگا کے پانی کو پاک مانتے ہیں اسلام مذہب کو ماننے والے آب زمزم کو۔ افق کہتے ہیں کہ معابد میں پوجا کرنے والے ہندو ہی پہلے ہیں کیونکہ مسجدوں اور گرجا گھروں سے کہیں پہلے سے ہندوستان میں مندر اور شوالہ موجود ہیں۔ مذہب کی مقدس کتابوں کے بارے میں بھی افق کہتے ہیں کہ قرآن، توریت، زبور سبھی اپنے مذہب کی علم معرفت کی بہترین کتابیں ہیں لیکن بھارت کی مقدس کتابیں وید اور پران سب

سے زیادہ قدیم ہیں اور وہ ساری دنیا کے لوگوں کے لئے مشعلہ راہ ہیں۔ افق کہتے ہیں:

کل مذاہب میں بھرت کھنڈ کے مذاہب کے ہیں ڈھنگ
زائریں پوجتے ہیں کعبہ میں نقش سر سنگ
چاہے زمزم ہے مسلمانوں میں ہم لوگوں میں گنگ
لوٹ ہیں جامہ عیسیٰ کی پرستش پہ فرنگ

معابد کے ہیں ہمیں پوجنے والے پہلے
تھے یہاں مسجدوں گرجوں سے شوالہ پہلے

بائیبل ہو کہ قرآن کی توریت زبور
واقعی ہیں قطب قادر و خلاق و غفور
غور فرمائیں قدامت پہ اگر اہل شعور
نمبر اول ہی رہے ویدوں کا چشم بدور

وید تو وید قدیم ان سے پران اپنے ہیں
قائم امریکا میں بھی آج نشان اپنے ہیں

ہندوستان کے لوگوں کی شجاعت کی یاد کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ اب ویسے بہادر لوگ کہاں ہیں۔ اب ایسے لوگ بھی نہیں ہیں جو ہندوستان کے پرانے اسلحوں کے جان کار ہوں یہ افسوس کی بات ہے۔ ملک کی عظمت رفتہ کو یاد کرتے ہوئے افق بیان کرتے ہیں کہ عیسیٰ سے کہیں پہلے ہی قنوج کے شاہ نے سمندر میں جہاز اتارے تھے۔ یہ شاہ برٹین کے شاہ گشتاسپ کا ہم عصر تھا۔ قنوج راج میں بیحد خوشحالی تھی۔ ہندوستان میں تمام نامور راجہ ہوئے جس میں بہادر راجہ پرو نے سکندر اعظم کے ساتھ جنگ کی تھی۔ پرو کے پاس بڑی فوج تھی اور اس میں تقریباً ۱۰ ہزار ہاتھی تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فوج پر اس کے راج میں کتنا خرچ ہوتا ہوگا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ کے ایک شاعر کے فارسی کلام میں ذکر ہے کہ یہاں کے راجہ رام چندر کے راجیہ کی سرحدیں روم، چین اور خراسان تک پھیلی تھیں۔ انہیں مصر اور فتون وغیرہ سے خراج ملتا تھا۔ رام کے اشومیگھ یگیہ پورا کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے تمام راجاؤں پر فتح حاصل کر لی تھی۔ مہابھارت کی جنگ میں بڑے بڑے راجہ

مہاراجاؤں نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے تھے۔اس سے بھی ثابت ہے کہ بھارت کا ہی اس وقت چاروں طرف اتنا دبدبہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ کروچھیتر کی جنگ میں اپنی جان پر کھیل گئے۔

قنوج کے راجہ جے چندر کا ذکر کرتے ہوئے افق نے بیان کیا ہے کہ ان کے در پر تعینات سپاہیوں کی تعداد ۵۰ ہزار تھی لیکن بدبختی ایسی آئی کہ اسے محمد غوری سے ہارنا پڑا۔راجہ جے چندر کے وزیر راجا پرمال کے پاس شاہ ایران سے بھی زیادہ دولت ہونا بتایا جاتا ہے۔

ہندوستان پر باہر کے فاتحین کے حملے شروع ہوئے تو معلوم نہیں کتنی دولت وہ ہندوستان سے لوٹ کر لے گئے۔پھر بھی اس ملک میں بے شمار دولت تھی۔یہاں کے راجہ اپنی بات پر قائم رہتے تھے۔مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے جان دینے کو تیار رہتے تھے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان۔اس کی دو مثالیں افق نے دی ہیں۔محمد غوری کے بھائی میر حسن جس نے غوری سے بغاوت کی تھی غوری کے قہر سے بچنے کے لئے بھاگ کر ہندوستان آیا تھا اور رائے پتھورا سے پناہ مانگی تھی۔غوری نے اپنے بھائی کو اپنے قبضہ میں لینے کے لئے راجہ پتھورا سے کئی لڑائیاں لڑیں۔رائے پتھورا نے اپنا راج پاٹ کھویا اپنی جان تک دیدی مگر پناہ میں آئے میر حسن کو محمد غوری کو نہیں سونپا۔

شاہ عالم پر جب نادر شاہ کا حملہ ہوا اور افغانوں نے ان پر بہت ظلم کئے ایسے موقع پر کسی نے شاہ عالم کا ساتھ نہیں دیا۔صرف ہندوؤں نے ہی اپنی جان پر کھیل کر شاہ کو بچایا۔اتنا کرنے پر بھی ہندوؤں نے شاہ عالم کے تخت و تاج پر نظر نہیں کی۔ان دونوں واقعوں کے متعلق مسدس کے حسب ذیل بند دیکھئے:

اہل اسلام سے تھا لاکھ پتھورا کیں خواہ
چھتریہ دھرم کا لیکن ہوا منظور نباہ
دیکھا عاجز کو تو کھینچی لب خاموش سے آہ
دی شہ غور کے بھائی کو ترحم سے پناہ
راج کو چھین لیا شاہ شہاب الدیں نے
اسے لیکن نہ دیا راجہ نیک آئیں نے

افقؔ نے بیان کیا ہے کہ ہند کی سرزمین پر فطرت کے بھی کچھ عجیب وغریب کرشمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔قنوج کے ایک کچے مندر میں ایسے پتھروں کی مورتیاں ہیں جو انسانی جسم کی طرح ملائم ہیں اس اچنبھے والی بات کا سائنس کے پاس بھی جواب نہیں ہے۔افقؔ کہتے ہیں:

ہیں نراکار کے جو ڈھونڈنے والے ہیں کہاں
ادھر آئیں جو ہیں سائنس پہ اپنے نازاں
ذرا گنگا میں نہاکر یہ چھوئے مورتیاں
نرم پتھر ہمیں دیں صورت جلد انساں
ہم نہیں کہتے کہ قدرت ہے یہ ہر مورت میں
شبہ سائنس کو ہو کیوں کوئی اس صورت میں

مسدس میں افقؔ نے ہندوستان کے عام آدمیوں کے ہنر کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہاں کے تیراک، کشتی لڑنے والے پہلوان اور طرح طرح کے کرتب دکھانے والے نٹ اپنے اپنے ہنر کے ماہر ہیں۔انگریزوں کے جمناسٹک کا ہنر رکھنے والوں سے زیادہ ہی ہنر یہاں کے غریب نٹوں کے پاس ہیں۔ہندوستان کے جادوگروں کی جادوگری بھی مشہور زمانہ ہے جس کو دیکھ کر یورپ والے بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔

مسدس ''آریہ ورت کی تاریخ عظمت'' میں آریہ ورت کی عظمت کے جتنے پہلو ہوسکتے ہیں ان سب پر افقؔ لکھنوی نے روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے آریہ ورت کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت اور تمدنی بلندی پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے۔مسدس میں انہوں نے تقریباً موجودہ دور کے سبھی علوم سے قدیم آریہ ورت کے علوم کا موازنہ کیا ہے۔آریہ ورت کی تہذیب کی بلندی کو دوسری تہذیبوں سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان تہذیبوں سے پہلے آریہ ورت کی تہذیب اپنے معراج کمال کو پہونچ چکی تھی۔ اپنے مسدس میں افقؔ نے یہ بتایا ہے کہ آریہ ورت کی تہذیب کے اثرات دوسرے ملکوں اور تہذیبوں پر بھی مرتب ہوئے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ترقی یافتہ تہذیب کے اثرات ترقی پذیر ملکوں پر ضرور پڑتے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آریائی تہذیب اپنے دور میں دنیا کے دیگر ملکوں سے زیادہ ترقی یافتہ تھی جس کے آثار ونشانات آج بھی پائے جاتے ہیں۔

افق اس مسدس کے ذریعہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے مادر وطن کی عظمت کو ہمیشہ خیال میں رکھنا چاہیئے اور اس پر فخر کرنا چاہیئے ہمیں سر اٹھا کر جینا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ثابت کر دینا چاہیئے کہ ہم اتنی عظیم تہذیب اور ثقافت کے وارث ہیں۔ علم، فن اور کسب سبھی میں ہم نے دنیا کے سبھی ملکوں سے کہیں زیادہ مہارت حاصل کی تھی۔ جس کے ثبوت ہمارے پاس ہیں۔ ہمارا علم، ہماری تحقیقیں سب ہماری قدیم کتابوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ہم آج بھی تمام پرانی عظیم انسانی قدروں کے ماننے والے ہیں۔ ہمیں خود پر یقین ہونا چاہیئے اور جس طرح بھی ہو ہمیں اپنی پرانی عظمت کو پھر سے حاصل کر لینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان ہمیشہ سے دنیا کو راستہ دکھانے والا رہا ہے یہ افسوس کی بات ہے کہ اپنی ہی غلطیوں سے ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گئے۔ ہمارا مقدر غلامی، مفلسی اور پستی کی زندگی گذارنا نہیں ہے، ہم سب کو مل کر کوشش کرنا چاہیئے کہ ہم غلامی کی زنجیریں توڑ دیں اور ہندوستان کو دنیا میں سب سے اونچے مقام پر فائز کرا دیں جس کا وہ واقعی حقدار ہے۔

مسدس (اخلاقی)

افق نے اخلاقی موضوعات پر بھی بہترین مسدس کہے ہیں جو ان کی شاعری کی آفاقیت کی مثال پیش کرتے ہیں۔

افق نے اپنے مسدسوں میں ہندوستانی سماج میں نیک صفتی خوبیوں کی کھوج کی ہے اور اس کے ترقی یافتہ پہلوؤں کو ابھارنے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ ان کے تمام مسدس انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبہ سے شرابور ہیں۔ جہاں ایک طرف انہوں نے بیسویں صدی کے ہندوستان کے عوام کی کمیوں، مجبوریوں اور مفلسی کی عکاسی کی ہے وہیں دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ درس انسانیت کسے کہتے ہیں اور انسان کو ایسا کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیئے جس پر چلنے سے انسانی ہمدردی، محبت اور میل ملاپ کے جذبات نمایاں ہو سکیں۔ افق کے ایسے کچھ اہم مسدس غریبوں کی غریبی، دین و یمان کی حفاظت، خودی، پریم، آہ مظلوماں، آدمیت،

شجر اخلاق، استاد اور زبان وغیرہ ہیں جو اعلیٰ انسانی قدروں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں اور ایک خوبصورت سماج کی تعمیر کے لئے مشعل راہ کا فرض انجام دیتے ہیں۔

غریبوں کی غریبی

۲۲ بندوں کے اپنے مسدس ''غریبوں کی غریبی'' میں افق کہتے ہیں:

غریبی ضد ہے شوکت کی امارت کی تمول کی
غریبی بادباں ہے کشتی صبر جز و کل کی
غریبی ہے کسوٹی ضبط خواہش کی تحمل کی
قناعت کی شکیبائی کی تسلیم و توکل کی
غریبی کو بہت اچھا سمجھتے ہیں جو صابر ہیں
مشیت اسکو کہتے ہیں مشیت پر جو شاکر ہیں

☆

غریبی حضرت انساں کی مادر زاد ہمدم ہے
غریبی حلم آموز صفات ابن آدم ہے
غریبی جاذب رحم خدائے اہل عالم ہے
غریبی مصلحت دان رضائے رب اکرم ہے
شکیبائی دل کے کھلتے ہیں جوہر غریبی میں
چنے ہیں بہر کانے قیمتی گوہر غریبی میں

افق کہتے ہیں کہ غریبی کسی بھی نظریہ سے قابل مذمت نہیں ہے بلکہ یہ زندگی کو اونچے مقامات حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ افق نے اپنے مسدس ''غریبوں کی غریبی'' میں جن خیالات کا ظہار کیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان پر ابوالحسن الہجویری کے خیالات کا اثر ہے۔ الہجویری نے تصورف میں فارسی زبان میں سب سے پہلے اپنی مشہور تصنیف ''کشف المحجوب'' لکھی ہے۔ کشف المحجوب کے معنی ہیں چھپی ہوئی چیزوں کا اظہار کرنا۔ اس کتاب میں انہوں

نے غریبی اور فقیری میں فرق کیا ہے۔ روحانی سفر (طریقت) کو بتاتے ہوئے انہوں نے فقر کا بہت اونچا مقام بتایا ہے۔ اس مقام کو حاصل کرنے والا انسان فقیر کہلاتا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ غریب آدمی وہ ہوتا ہے کہ جس کے پاس دولت نہیں ہوتی ہے لیکن اسے دھن دولت کی خواہش رہتی ہے۔ فقیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ تو دولت ہوتی ہے اور نہ ہی اسے دولت کی خواہش ہوتی ہے۔ الہجویری کا کہنا ہے کہ روحانی ترقی کے لئے دولت اور دنیا کو ترک کرنا ضروری ہے۔ روحانی سفر میں فقیر فقر کے مقام پر اپنی روح کا پاک بناتا ہے جس سے اس کے اندر حق (خدا) کی محبت اور اس کی عبادت پیدا ہو سکے اور اس طور سے وہ آخر میں اپنی منزل مقصود کو حاصل کر سکے۔ فقیر صبر اور قناعت کے راستہ پر چلتا ہے، غریب آدمی ان باتوں سے محرورم رہتا ہے۔ اس لئے فقیر کا رتبہ عام غریب آدمی کے مقابلہ میں کہیں اونچا ہوتا ہے۔

افق کے یہاں غریبی خدا کی ایک نعمت ہے جو ان کو ہی نصیب ہوتی ہے جن سے خدا محبت کرتا ہے اور اس کی روحانی ترقی کرتا ہے۔ انہیں باتوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے افق نے محمد صاحب اور دوسرے غریب کامل فقیروں کو سچا فقیر تسلیم کرتے ہوئے ان کی عظمت بیان کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ عرب میں جو مسجد پیغمبر اسلام نے بنائی تھی اس میں روحانی نظریہ سے کیا صفات تھیں۔ ان کے اس مسدس کے چند بند اسی فرق کو واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

جو کامل آج تک گذرے ہیں سب شان غریبی تھے
مسیح نامی و عیسائی لقب شان غریبی تھے
محمد سید ملک عرب شان غریبی تھے
جناب موسیٰ والا نسب بھی شان غریبی تھے
غریبوں ہی سے شاہوں نے مدد لیکر شہی پائی
غریبوں ہی کے دم سے عالموں نے آگہی پائی

مسلم شریعت کے بانی محمد صاحب نے بھی خدا تک رسائی کے لئے اور زندگی کی اونچی مثالیت کی قدروں تک پہنچنے کے لئے فقیری کا راستہ اپنانے کی نصیحت دی۔ فقیری میں ان جیسا کوئی دوسرا نہیں تھا اور اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نہایت غریبی اور مفلسی کی زندگی گذاری تھی۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی میں غریبی اور فقیری کے راستہ کو

اپنانے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے افق سب کو اس طرح کہتے ہیں:

محمد جن کا دامن خلقت آدم پکڑتی تھی
رسول اللہ جن سے کفر کی صورت بگڑتی تھی
پیمبر جن کی ہر ایک بات ہر اک دل میں گڑتی تھی
توے پر ان کے دو دو روز تک روٹی نہ پڑتی تھی
نمونہ ہے رسالت انکے اعجاز غریبی کا
نگارستاں کمال ان کا ہے اعجاز غریبی کا

☆

عرب میں آپ نے جو مسجد اقدس بنائی تھی
ہر ایک دیوار اس کی کچی مٹی سے اٹھائی تھی
نہ اب کی سی بناوٹ تھی نہ اب کی سی صفائی تھی
نہ تھی اب کی سی صناعی نہ ایسی خوشنمائی تھی
کھجوروں کی تھیں شاخیں، چھت پہ گارا تھا نہ چونا تھا
یہ گھر اللہ کا شان غریبی کا نمونہ تھا

مسدس کے آخری بند میں افق کہتے ہیں:

غریبی کے نہیں جو قدر داں جو حق کو بھولے ہیں
بیاں ہے نادرست ان کا غلط ان کے مقولے ہیں
امیری پر، محل پر شان و شوکت پر جو پھولے ہیں
اپاہج عقل ہے ان کی، خیالات ان کے لولے ہیں
امیری آدمی کو عیش سے مجہول کرتی ہے
غریبی درگاہ اللہ میں مقبول کرتی ہے

مسدس خودی

غریبوں کی غربی مسدس کے علاوہ افقؔ کے دیگر مسدس بھی انسانیت اور انسانی ہمدردی کے جذبہ کو ابھارنے والے ہیں۔ انکی نصیحت ہے کہ انسان کو تکبر، سرکشی، خودغرضی اور انانیت سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے ۲۵ بندوں کے اپنے مسدس ''خودی'' میں وہ تکبر اور انانیت کے بارے میں اس طرح کہتے ہیں:

خودی وہ خو ہے جس سے آدمی بدنام ہوتا ہے
ہر اک مقصد میں ہر اک کام میں ناکام ہوتا ہے
شکار ناوک تشنیع خاص عام ہوتا ہے
غذائے نرم گرگ گردش ایام ہوتا ہے
خودی والے ہمیشہ پھولتے ہیں چار پیسوں پر
برابر زندگی میں انگلیاں اٹھتی ہیں ایسوں پر

☆

خودی اہل خودی کا آپ ہی سر توڑ دیتی ہے
خودی انساں کا منہ راہ ادب سے موڑ دیتی ہے
بنا دیتی ہے اندھا چشم باطن پھوڑ دیتی ہے
ڈبونے کے لئے کشتی بھنور میں چھوڑ دیتی ہے
خودی سے آدمی کیسے فرشتہ نے نہ پھل پایا
وہ کھویا دم بھر میں خودی سے تھا جو کل پایا

اس مسدس میں افقؔ نے اسلامی مذہب سے ابلیس، فرعون، ضحاک، شداد، ابرہہ بادشاہ، نمبرود، بولہب، ابومسلم، یزید اور شمر کی مثالیں دے کر اور ہندو مذہب سے راون، ہرشیہ کشیپ، راجہ نل، کیس اور ششوپال کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ طاقتور سے طاقتور سلطان اور بڑے سے بڑے راجہ بھی جب سرکش ہو گئے تو خدا نے ان کا سب کچھ کس طرح چھین لیا۔ کچھ بند دیکھئے:

خودی کے زعم سے لاکھوں نے کھویا تخت سلطانی
مٹا ہے سیکڑوں کا اس سے اعزاز جہاں بانی
ہزاروں نے بنایا حق کو اپنا دشمن جانی
ہوئے بے انتہا اس خو سے نظر قہر ربانی

خودی کو خود پسندی سے جو دل میں راہ دیتا ہے
سزائیں زندگی ہی میں اسے اللہ دیتا ہے

☆

وہ ابلیس انس و جن میں پہلے جس کی بات تھی بالا
خودی کی بیخودی سے اس نے حکم کبریا ٹالا
ہوا پہلو تہی سجدہ آدم سے منہ کالا
گلے میں طوق لعنت حق نے جس کے واسطے ڈالا

ہمیشہ اس کی بیقدری کے ساماں بڑھتے رہتے ہیں
سب اس کے نام پر لاحول اب تک پڑھتے رہتے ہیں

سزاوار اس سے فرعوں ہو گیا قہر الٰہی کا
ملا ضحاک کو داغ اس خودی سے روسیاہی کا
نشانہ بن گیا شداد اس خو سے تباہی کا
ہوا صدمہ اسی سے راجہ نل کی عزلہ شاہی کا

خودی ہی سے تنزل کنس کے اقبال نے دیکھا
خودی ہی سے تہہ تیغ اپنا سر ششوپال نے دیکھا

☆

جو تھے اصحاب فیل ان سے گریزاں تھی صدا نیکی
اٹھی انکے خودی پر انگلیاں سارے زمانہ کی
خدا کو بھول کر کیں کوششیں کعبہ کو ڈھانے کی
نتیجہ یہ ہوا تادیب کی حکمت خدا نے کی

ابابیلوں نے ماریں ایسی کنکریاں کہ جی چھوٹا
خودی سے کچھ نہ بن آئی مرے بے موت دم ٹوٹا

حال کی تاریخ سے رضیہ سلطانہ کے بھائی معز الدین، اورنگ زیب اور محمد شاہ کی مثالیں لے کر افق نے تکبر ارسرکشی اور انانیت کے بعد انجام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اورنگ زیب کی مثال دیتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ خودی کی خو کی وجہ سے ہی اورنگ زیب نے اپنے تین بھائیوں کا قتل کر دیا۔ زندگی بھر اسے تعصب میں جینا پڑا۔ اس کی خودی کے راستہ پر چلنے سے خدا کا قہر یہ برپا کہ بہت جلدی مغلیہ سلطنت ختم ہوگئی۔ مسدس کے آخری بند میں افق اس طرح سمجھاتے ہیں:

خودی کو اے افق تم دشمن دنیا و دیں سمجھو
اسے عادت بدوں کی اس کو خوئے اہل دیں سمجھو
کہو گرگے بغل یا اس کو مار آستیں سمجھو
پلنگ شر شبع صیاد مصروف کمیں سمجھو
کسی کے بھی نہیں دنیا میں ساتھی ہیں خودی والے
جو اپنی فوج کو مارے وہ ہاتھی ہیں خودی والے

دین وایمان کی حفاظت

افق نے اپنے مشہور مسدس ''دین وایمان کی حفاظت'' میں سبھی مذہب پرستوں کو اپنے اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھنے کو کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے اپنے مذہب میں بتائی گئی اچھی باتوں اور نصیحتوں کے مطابق زندگی جینے سے اور ایمان پر قائم رہنے سے ہی انسان دنیا میں رہ کر جنت کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ مذہب اور ایمان سے انسان کو کیا کیا حاصل ہوتا ہے اس کو

افقؔ نے مسدس کے پہلے دو بندوں میں بیان کیا ہے:

اہل دنیا کا مددگار و معیں ہے مذہب
عنصر قالب ارباب یقیں ہے مذہب
زینہ جنت فردوس بریں ہے مذہب
ہے بشر صورت حیواں جو نہیں ہے مذہب
کی عیاں دہر میں خاصیت پارس اس نے
اپنے پابندوں کو فرمایا خدارس اس نے

☆

رہرو دیں کے لئے راہ نما ہے ایماں
دولت قیمت و بیش بہا ہے ایماں
توشہ زاد راہ ملک بقا ہے ایماں
مایہ ہستی خاصان خدا ہے ایماں
یہ کسوٹی عمل حکم الٰہی کی ہے
دی ہوئی نعمت عظمیٰ یہ خدا ہی کی ہے

افقؔ کے دل میں ہندو، اسلام اور عیسائی مذہب سب ہی مذہبوں کے لئے برابر کی عزت ہیں۔ اپنے مذہب پر قائم رہ کر کوئی بھی شخص خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ اگر اہل زمانہ دین اور ایمان پر یقین نہ لاتے تو حق پرستی کی جگہ دنیا میں کفر پرستی ہوتی۔ وہ وید، قرآن اور بائیبل سبھی مقدس کتابوں کی عزت کرتے ہیں۔ اپنے مذہب کو ماننے کا اسرار کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

شرع جو کوئی ہے تفسیر انہیں کی پائی
کعبۃ اللہ میں توقیر انہیں کی پائی
پاک تیرتھ جو ہیں جاگیر انہیں کی پائی
کوئی گرجا ہو وہ تعمیر انہیں کی پائی

ہندوؤں نے قدم رام انہیں سے دیکھے
قبلہ رو صاحب اسلام انہیں سے دیکھے

☆

حق کے ایماں سے جو دیں اور نہ ایماں ہوتا
کوئی معبود نہ دانندہ یزداں ہوتا
بائبل ہوتی نہ وید ارو نہ قرآں ہوتا
کوئی عیسائی نہ ہندو نہ مسلماں ہوتا
حق پرستی کے عوض کفر پرستی ہوتی
پردہ خاک پہ کفار کی بستی ہوتی

ہندو، اسلام اور عیسائی سبھی مذہب کے لوگ اپنے مذہب پر عقیدہ رکھ کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا عقیدہ سچا ہو۔ عبادتگاہ کوئی بھی ہوسکتی ہے لیکن اپنے معبود کو دل سے یاد کرنے پر عقیدتمند اسے اپنے سامنے پا سکتے ہیں۔ اگلے بندوں میں افق نے یہی سمجھانے کو کوشش کی ہے:

جس کے ہیں نور نظر عیسیٰ مشہور انام
جس کے ہیں شیر علی نور نبی ؑ اسلام
طور پر جن سے کیا حضرت موسیٰ نے کلام
لاتے تھے روح امیں عرش سے جس کے احکام
حالت بعد میں نظروں سے نہ لا بعد ہوا
سامنے انکے وہ دس مرتبہ موجود ہوا

☆

کل مذاہب میں جو تسلیم ہوا عرش مقام
جس کا چشم ودل خاصان خدا میں ہے قیام
جس کا گھر خانہ گرجا ہے عبادتگاہ عام
جس کا ایوان ہے جلوہ گاہ نور اسلام

ان کی ہرجائی عبادت میں نشاں ہے اس کا
مندروں اور شوالوں میں مکاں ہے اس کا

اقبال اپنے مذہب کو چھوڑنے والے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ مومن کے دل کو مسلنے کو برا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو بھی اپنے مذہب کو موافق روش رکھتا ہے عزت کے قابل ہے۔ اپنے مذہب سے جو منہ پھیر لیتا ہے اس کی قدر اہل شرافت کی نظر میں نہیں ہوتی ہے۔ وہ بے دین اور لامذہب ہو جاتا ہے۔ اقبال نے سرودھرم سمبھاؤنا یعنی کل مذہبوں کی یکسان بینی اور مساوات کے جذبہ کے تحت کہا ہے کہ ہر انسان کو اپنے مذہب میں پختہ اعتقاد رکھنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے:

اپنے مذہب پہ جو قائم ہے مبارک ہے وہی
جنس نزدیکیٔ اللہ کا گاہک ہے وہی
سرخرور سب کی نگاہوں میں ابد تک ہے وہی
آبرو خلقت اللہ کی بیشک ہے وہی

ذکر اگر کفر کے حملوں سے نہ ایماں پائے
سورگ ہندو کو ملے خلد مسلماں پائے

ہندو اور اسلام مذہب ماننے والوں کے لئے ان کے مذہب میں کیا کیا فرائض بتائے گئے ہیں اس کو مسدس کے صرف ایک ایک بند میں اقبال نے نہایت خوبصورتی سے سمیٹ کر سامنے رکھ دیا ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی فرائض گناتے ہوئے کہتے ہیں:

فرض مذہب کے ہیں جن پہ ہے ان کا ایماں
جاترا، برت بھجن، سندھیا تیرتھ اشنان
ہوم، اگیاری، کتھا، بارتا، جپ، تپ پُن دان
پنچ دیواشٹ پتر کرم، نراکار کا دھیان

حفظ مذہب کے لئے دل کے قوی یہ سب ہیں
شیوی و شاکتی و بیشنوی یہ سب ہیں

مسلمانوں کے فرائض انہوں نے اس طرح بیان کئے ہیں:

ہر مسلماں کے لئے کام یہ ہیں وجہ نجات
سجدہ مسجد و طواف حرمین و صوم و صلوٰۃ
صبح گردانی و حج، نعت، درود و خیرات
یاد حق، طاعت پیغمبر عالی درجات
گوشہ دل میں جگہ دیتے ہیں دیداروں کو
ورد لب رکھتے ہیں قرآں کے سیپاروں کو

☆

نام اللہ پہ فرماتے ہیں یہ صرف کثیر
کھینچتے ہیں غم اولاد علی کی تصویر
کرتے ہیں منزلت مجتہد و مرشد و پیر
چار یاروں کا ادب پنجتنوں کی توقیر
بوسہ دیتے ہیں ادب سے حجر اسود پر
عجز سے گھستے ہیں ماتھا قدم احمد پر

اس مسدس میں شاعر نے مذہب اور ایمان کو نہایت بڑے نظریہ سے دیکھا ہے۔ کاش آج کے سیاستداں اسی نظریہ سے ہر مذہب کی عزت کریں اور سب کو اسی نظریہ سے سبھی مذہبوں کا ماننے والوں کی عزت کرنا سکھائیں تو سب ہی اس ملک میں خلد کے مزے لوٹ سکتے ہیں:

آہ مظلوماں

افق خدا پرست دل رکھتے تھے ان کا ماننا تھا کہ مظلوم کی آہ کبھی نہیں لینا چاہئے کیونکہ اس کا بہت برا اثر ہوتا ہے۔ محمد صاحب نے بھی کہا ہے کہ مظلوم کی آہ سے بچو۔ اللہ اور مظلوم کی آہ کی درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی ہے۔ افق کہتے ہیں:

ہے ممکن دم بہ دمہ توحیل آنکھوں میں اٹک جائے
مٹے تاثیر مہلک گر ہلاہل حلق تک جائے
قضا ہنگام قبض روح جب جائے جھجھک جائے
ہدف ناوک کا چوکے ہاتھ خنجر کا بہت جائے
ذرا بھی بے اثر ہو آہ مظلوماں نہیں ممکن
نہ ظالم کو خبر ہو آہ مظلوماں نہیں ممکن

☆

ہو ذرہ چاہے خورشید اور چاہے ماہ ماہی ہو
نہ چاہے دور زلف شاہد شب کی سیاہی ہو
نہ چاہے واجب التعلیم حکم بادشاہی ہو
دعائیں کاملیں چاہے نہ مقبول الٰہی ہو
نہیں ممکن نہ مظلوماں کی آہوں کا اثر کچھ ہو
نہیں ممکن نہ تاثیر ان کی اہل ظلم پر کچھ ہو

وہ کہتے ہیں:

بشر چاہے نہ کانپے مثل بیدللہ کے ڈر سے
نہ چاہے شمع سا تھرائے شاہنشاہ کے ڈر سے
نہ لرزیدہ ہو چاہے صدمہ جانکاہ کے ڈر سے
مگر لازم ہے سہمے دل میں تیر آہ کے ڈر سے
غضب ڈھاتی ہیں مظلوماں پریشاں حال کی آہیں
جلا دیتی ہیں جسم آہن کا مردہ کھال کی آہیں

بے گناہ اور مظلوموں کو ستانے کی سزا خدا ضرور دیتا ہے اور بہت سخت سزا دیتا ہے۔ اسی بات کو افق نے مسدس کے آخری بند میں بیان کرتے ہوئے ظلم کرنے والوں کو پرزور الفاظ میں آگاہ کیا ہے:

افقؔ مظلوم کی آہوں کو ظالم کی قضا سمجھو
سبب ترحیل کا جانو فرشتہ موت کا سمجھو
کنی ہیر کے، وِش کی گانٹھ جانو، سنکھیا سمجھو
بلائے آسمانی خواہ قہر کبریا سمجھو
وہ ظالم جو ہوئے افضل مہاراجوں سے شاہوں سے
مرے پل مارتے بے موت مظلوموں کی آہوں سے

آدمیت

افقؔ لکھنوی نے اپنے مسدس آدمیت میں انسانیت کے اس اعلیٰ تصور کو پیش کیا ہے جو انسان کی تخلیق کا مقصد ہے آدمیت سے افقؔ کی مراد درحقیقت ان اخلاقی اور سماجی عینیت سے ہے جو اچھے اور برے انسان کہلانے کے قابل انسان میں ہونا چاہئے اور جس کی بنیاد پر اچھے اور برے انسان میں امتیاز کیا جا سکے۔ مسدس کے پہلے بند میں انسان کی آدمیت کو پر سرخاب، اوصاف سنجاب، موتیوں کی آب، مہر عالم تاب اور خاتم سلیماں سے تشبیہ دیکر شاعر نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کا مرتبہ و منصب کیا ہے۔ شاعر کے ذہن میں انسان کامل کا تصور ہے۔ ایسا انسان جو کسی مذہب، ذات، علاقہ یا زبان کے حدود میں قید نہ ہو۔ شاید یہی فطرت بھی ہے کہ انسان صرف انسان ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ انسان پہلے انسان ہے بعد میں وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہے۔ مسدس کے دوسرے بند میں گہر، ہما اور معراج کے لفظ استعمال کر کے پوری انسانیت کے سفر کا تصور کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان جو کبھی بلندیوں پر تھا اور دنیا میں آنے کے بعد اس نے جو اپنا سفر شروع کیا اس کی کاملیت کی آخری حد معراج ہے۔ مسدس کے پہلے دو بندوں میں افقؔ کہتے ہیں:

آدمیت ابن آدم کو پرے سرخاب ہے
آدمیت آدمی کو موتیوں کی آب ہے
آدمیت دامن اوصاف کی سنجاب ہے
زرۂ اوصاف ہے یہ مہر عالم تاب ہے
آدمیت نگ سلیماں کا ہے خاتم جم کی ہے
مہر تصدیق آدمی یہ نطفہ آدم کی ہے

☆

گوہر انسان خوش گوہر کا ہے جوہر یہی
فخر کا تمغہ یہی ہے وقر کا زیور یہی
ہے یہی دیہیم کی کلغی ہما کا پر یہی
طرۂ دستار فضیلت کا یہی اکثر یہی
آدمیت آدمی کو زینہ معراج ہے
گر نہیں انسانیت کیا ہے جو سر پر تاج ہے

اسلام کے عقیدہ کے مطابق خدا نے انسان کو بنایا اور اس کو فرشتوں سے بھی سجدہ کرایا۔ شاعر نے انسان کے مرتبہ کو بتاتے ہوئے اس کو مسجود ملائک کہہ کر اس کے مرتبہ کو ظاہر کیا ہے۔ انسان اپنی غلطیوں کی وجہ سے خلد سے نکالا گیا۔ اب اپنا پہلا مرتبہ پانے کے لئے اسے پھر کوشاں ہونا چاہیئے انسانیت کھو دینے سے انسان میں ابلیس کی صفات آ جائے گی اور طوق لعنت اس کی گردن میں پڑ جائے گا۔ مسدس کے اگلے دو بندوں میں افق یہی کہتے ہیں:

حق نے یہ سرخاب کا انسانیت کو پر دیا
حضرت آدم کو مسجود ملائک کر دیا
باغ خلد ایسا چمن، فردوس ایسا گھر دیا
ابن آدم سے مکان دین و دنیا بھر دیا
آدمیت کھو کے جب ظاہر کیا تلبیس کو
طوق لعنت ہاتھ آیا گردن ابلیس کو

☆

فضل خالق آدمیت سے نمایاں ہو گیا
خاک کا پتلا جو تھا حیواں سے انساں ہو گیا
خسروئے انساں طیور جن و سلیماں ہو گیا
خلق میں نام محمد نور یزداں ہو گیا
تارک انسانیت دام بلا میں صید ہے
چاہے بابل میں ہی دیکھو تو فرشتہ قید ہے

شاعر کا کہنا ہے کہ خدا انسان کو صرف اس لئے وجود میں لایا تا کہ وہ انسانیت اور آدمیت کی صفات سے اس کی بنائی ہوئی دنیا ایسی بنا دے کہ لوگ وہاں جنت کا لطف اٹھا سکیں۔ خدا نے آدمیت کو اس قدر منظور کیا کہ حضرت موسی کے سامنے خود موجود ہو کر ان کو اپنا نور بخشا یوں تو خدا کی عبادت کے لئے تمام ملائک کافی تھے۔ تمام چرندوں اور پرندوں میں خلاق عالم کا ہی ظہور ہے۔ سب کو خدا نے عقل دی ہے سبھی خدا کی بنائی دنیا میں بھوک پیاس، نیند، خوشی اور درد محسوس کرتے ہیں زندگی اور موت بھی سب کے لئے ایک سی ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی سبھی جاندار چیزوں اور انسان میں فرق ہے تو صرف آدمیت کا، مسدس کے حسب ذیل بند دیکھئے:

کم نہ تھے لاکھوں ملک خالق کو طاعت کے لئے
تھے بہت چرخ و زمیں پستی رفعت کے لئے
آدمی اصلاً نہیں اظہار قدرت کے لئے
اس کی پیدائش ہوئی ہے آدمیت کے لئے
حق نے قدر آدمیت اس قدر منظور کی
طور پر موسیٰ کو بخشی آگ اپنے نور کی

جتنے ہیں ذی روح مارو ماہی مورو طیور
ہے ہر اک میں قدرت خلاق عالم کا ظہور
حسب حیثیت میسر سب کو ہے عقل و سرور
تشنگی خواب اشتہا خواہش طلب عیش و سرور
آدمی سے زندگانی کا نہ رحلت کا ہے فرق
فرق اگر کچھ ہے تو وہ صرف آدمیت کا ہے فرق

آدمیت کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے اس کا خوبصورت بیان افق کے حسب ذیل بند میں دیکھئے:

جس طرح خورشید تاباں ہے سحر کے واسطے
کاہش و بالیدگی جیسے قمر کے واسطے
جس طرح نیساں کا قطرہ ہے گہر کے واسطے
آدمیت خاص یوں ہی ہے بشر کے واسطے
حس اگر انسانیت ہوتا نہ اس انسان کا
پیشِ آدم کیوں لقب پاتا ملک شیطان کا

☆

آدمیت سے بشر کی سرفرازی ہے مدام
چرخ چارم پر دیا عیسیٰ کو رہنے کا مقام
طور سینا پر کیا موسیٰ کو حق سے ہمکلام
بن گیا پیغمبر اسلام یوسف سا غلام
آدمیت کا جو کچھ صورت نما انداز ہے
بہر مردم چشم انساں دیکھو پا انداز ہے

انسان کامل کا تصور ہندو مذہب میں ویدوں کے زمانہ سے ہی بہت اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔ رام کا تصور بھی مریادا پرشوتم یعنی انسان کامل کا ہے اب سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یعنی چار سینچری بی.سی. میں یونان کے مشہور فلاسفر پلیٹو کے درشن میں بھی آئیڈیل مین

یا انسان کامل کا تصور بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے آدمی کو ہر طرح سے ایک مکمل آدمی بننے پر زور دیا ہے جو تمام اخلاقی قدروں سے مزین ہو۔ اسلام مذہب میں بھی انسان کو انسانیت کی تمام اعلیٰ قدروں کا حافظ ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن انسان ہے کہ تمام نصیحتیں ملنے کے بعد بھی ہر بار بہک جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے معروف جرمن فلاسفر نتشے (۱۸۴۴ء سے ۱۹۰۰ء) نے بھی اپنے درشن میں مہا مانو یا سپر مین کا تصور پیش کیا ہے جس میں اعلیٰ انسانی قدروں کے ساتھ ساتھ 'ول تو پاور' یعنی طاقتور بننے کا جذبہ بھی ہو، اقبال نے بھی مسلمانوں کو ان فاتحین کو اپنے ہیرو یا آئیڈیل ماننے کو کہا جنہوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ نذیر نے آدمی نامہ لکھا ہے مگر اقبال اور نذیر کا انسانی زندگی کو دیکھنے کا زاویہ دوسرا ہی ہے۔ اس موضوع پر اردو کے دوسرے شعراء کے یہاں اس طرح کا بیان نہیں ملتا ہے جیسا افق کے مسدس میں ملتا ہے۔ اس طرح افق کا مسدس 'آدمیت' اردو شاعری میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے جس میں شاعر نے انسان اور انسانیت کے بارے میں فطرت، مذہب اور تاریخ سے تشبیہات لے کر اور تمام دلیلیں دے کر سمجھایا ہے کہ انسانیت کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ مسدس کے ایک اور بند میں افق کہتے ہیں:

آدمیت کے بغیر انساں کو انساں کیا کہیں
بولہب عم محمد کو مسلماں کیا کہیں
صورت مہتاب جگنو کو درخشاں کیا کہیں
گلشن نظر خزاں کو باغ رضواں کیا کہیں

آدمیت کھو کے بنتا ہے جو انساں آدمی
آب حیواں پی کے بھی ہوگا نہ انساں آدمی

اس مسدس کے ذریعہ افق یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر کے لئے انسانیت کے تمام خوبیوں سے مزین انسان کی ضرورت ہے اور ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ انسان کامل بن کر خدا کی بخشی ہوئی ان تمام نعمتوں اور صلاحیتوں کا حق ادا کرے جس کے لئے اسے دنیا میں لایا گیا ہے۔ اسی صورت میں وہ خدا کے نزدیک ہو سکے گا۔

سید رفیق مارہوی صاحب نے 'ہندوؤں میں اردو نامی' اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۳۔

۲۳۲ میں 'تعریف بشر' کے عنوان سے حضرت افق کے ایک مسدس کے دو بند نقل کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

کام ماتھے کا ہے چومے در معبد کی زمیں
کبھی ہونے نہ دے ہنگام غضب جلوہ چیں
سجدہ حق کرے دے بوسہ قرآن مبیں
قشقۂ عضو کو چہرے کو بنائے تزئین
خط قسمت میں جو تحریر ہے پائے اس کو
کرے وہ کام جو سونپا ہے خدا نے اس کو

کام سینے کا ہے ہنگامہ مصیبت ہو سپر
کرے ماتم جو ملے رنج احبا کی خبر
بنے فانوس پئے شمع حق علم و ہنر
دے کل اوصاف صفاچی کی جگہ مثل جگر
عقل و حکمت کے لئے سینۂ سینا بن جائے
جلوہ نور خدا کے لئے سینا بن جائے

اتفاق

ملک کی اندرونی نفاق اور پھوٹ ہی اس کی پسماندگی کی خاص وجہ ہے اور آپسی خلوص، محبت، بھائی چارے اور یکجہتی سے ہی ملک کے تمام مسئلوں کا حل نکل سکتا ہے۔ یہی پیغام اپنے مسدس اتفاق میں افق نے دیا ہے۔ اس وقت ہندوستان کو شاید باہمی اتفاق کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جب افق لکھنوی نے یہ گلکاریاں کی ہوں، وطن عزیز میں اتفاق، اتحاد اور آپسی میل جول کی اتنی کمی نہ رہی ہو لیکن شاعر تو آنے والے وقت کی آہٹ صاف سن لیتا ہے۔ اسی لئے اتفاق کی خوبیوں کو بتاتے ہوئے شاعر نے کہا ہے:

سر چشمۂ مفاد زمانہ ہے اتفاق
زلف ترقیات کا شانہ ہے اتفاق
بہبودی جہاں کا خزانہ ہے اتفاق
جو پھانس لے ہما کو وہ دانا ہے اتفاق
جس نے اس اتفاق کے سودے سے چاہ کی
سانچے میں اس نے ڈھال لیں شکلیں رفاہ کی

☆

اوصاف نیک و خوب کی قسم اتفاق ہے
جان مفاد کے لئے جسم اتفاق ہے
جس سے ملے مراد وہ اسم اتفاق ہے
افسوں ہے، اتفاق، طلسم اتفاق ہے
یہ اتفاق شرک ہیں خورشید اوج کو
معراف فتح اس سے ہے شمشیر فوج کو

اتفاق کی اہمیت بتاتے ہوئے شاعر نے کہا ہے کہ اتفاق سے ہی کائنات قائم ہے، جسم و جاں قائم ہیں، حسن سخن ہے اور انسان دنیا کو جتنا خوبصورت بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ شاعر نے نہایت خوبصورت پیرایہ میں اس طرح بیان کیا ہے:

قائم ہے اتفاق عناصر سے ہر بدن
حرفوں کے اتحاد سے ہے ہستئی سخن
تاروں کا اتفاق ہے بانی پیرہن
نخلوں کے اتفاق سے ہے خوبیِ چمن
پیروں میں تاب آمد و رفت اتفاق سے
ہے انگلیوں میں حسن گرفت اتفاق سے

اپنے ملک اور سماج میں دن بدن گھٹتی ہوئی انسانی قدروں اور بربادی کی وجہ آپس میں نااتفاقی، رنجش اور پھوٹ ہے اور ترقی یافتہ ممالک کی خوشحالی کا راز وہاں اتفاق کا ہونا ہے۔
اس بات کو واقف نے پرزور الفاظ میں اس طرح بتایا ہے:

تکلیف میں بشر کو جو اس کی کمک ملے
آلام کو شکست ہو عسرت کو زک ملے
جس شے سے نہ امید ہو دل یک بیک ملے
جس کا کبھی گماں نہ ہو وہ چیز تک ملے
ہر دل میں اتفاق کا جوہر جو بس گیا
امریکا و فرنگ میں کنچن برس گیا

☆

اس ملک میں جو نال گڑا ہے نفاق کا
ذکر اتفاقیہ بھی نہیں اتفاق کا
ساماں ہے باپ بیٹوں میں ہجر و فراق کا
سیلاب ہے طلاق کا طوفان عاق کا
کی پائمال جھوٹ نے کھیتی رفاہ کی
بحر فنا میں کشتی ثروت تباہ کی

ملک کی خوشحالی اور شش جہتی ترقی کی صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ لوگوں میں محبت، خلوص اور ہم آہنگی برقرار رہے ورنہ نفاق کا اثر نادر شاہ کی لوٹ سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوگا۔

شجر اخلاق

اس مسدس میں شاعر نے انسانی زندگی میں شجر کی اہمیت و قیمت ہندوستانی پس منظر میں پیش کی ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے پیڑوں کی پوجا کی جاتی ہے اور ان میں

دیوتاؤں کی رہائش ہونا مانا گیا ہے۔ افق کے مسدس کا یہ بند جو ادب عالیہ کا بہترین نمونہ ہے اس طرح ہیں:

بہار دشت کی توقیر بوستاں ہیں شجر
تمام راہ نوردوں کے میزباں ہیں شجر
وحوش و طیر کے مونس ہیں مہرباں ہیں شجر
بہر حال جلوہ فگن ہیں وہیں جہاں ہیں شجر
شجر نہیں ہیں تو گلزار میں بہار نہیں
شجر نہیں ہیں اگر لطف مرغزار نہیں

کسی بہار کا تصور اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا جب تک شجر برگ بار لہلہاتا چمن زار نہ ہوا۔ جہاں درخت بوستاں کے زینت ہوتے ہیں وہیں راہ نوردوں کے میزبان ہوتے ہیں۔ پیڑوں کا وجود انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے، بہار کا آنا شجر پر منحصر ہے۔

افق نے درختوں کو انسان کو معلم کی شکل میں پیش کیا ہے اور ان کو اہل فن کے لئے خضر راہ قرار دیا ہے اور انکساری صبر اور تحمل کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ حسب ذیل بند کی روانی اور برجستگی دیکھئے:

نہیں شجر یہ فقط زینت چمن کی لئے
نہیں ہے نشونما ان کی صرف بن کے لئے
ہیں خضر راہ نصیحت یہ اہل فن کے لئے
ہیں یہ معلم اخلاق مرد و زن کے لئے
طریقہ عز کا سوئے کرم سکھاتے ہیں
نمونہ صبر کے اخلاق کے دکھاتے ہیں

افق کا کہنا ہے کہ انسان چرندوں پرندوں اور فقیروں سبھی پر درختوں کا احسان ہے۔ ان سے جو لکڑی ملتی ہے اس سے گھروں میں کھانا پکتا ہے۔ ندیوں میں ناویں چلتی ہیں ار عمارات بنتی ہیں۔ وہ طیور کو ٹھنڈی ہوا اور عمدہ غذا کھلاتے ہیں ان کا آشیاں اپنے آغوش میں بنائے رہتے ہیں۔ مسافروں کو سایہ دے کر ان کی تھکاوٹ اتارتے ہیں، پھلوں اور ٹھنڈی ہوا

سے ان کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں۔ شجر خود تمام پریشانیاں جھیل کر انسان کا ہر حال میں ساتھ دیتے ہیں۔ مسدس کے ایک بند میں شاعر نے درختوں کے صبر و تحمل کو بیان کیا ہے:

بشر ہزار انہیں سنگسار کرتے ہیں
طمع کے پھیر میں ڈھیلوں سے وار کرتے ہیں
ہر ایک شاخ کو بے برگ و بار کرتے ہیں
مگر یہ نظر ثمر بار بار کرتے ہیں
بلا سے شاخ قلم ہو کہ سر قلم ہو جائے
مجال کیا جو ذرا فیض عام کم ہوجائے

شاعر نے نہایت دلکش انداز میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ درخت کس طرح حوادث زمانہ کی سختیوں کو برداشت کرتے ہیں اور مسکراتے رہتے ہیں:

ہزار شمع سحر ہو کے خوں چکا آئیں
ہو ژالہ باری کی سیلاب جاستاں آئیں
کروڑ ابر سیاہ زیر آسماں آئیں
بپا ہو خاک کا طوفان آندھیاں آئیں
کڑی اٹھائیں نہ کچھ خواہش پناہ کریں
نہ اف زباں سے نکالیں نہ منہ سے آہ کریں

شاعر نے اس مسدس میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ شجر سبھی کی میز بانی کرتے ہیں۔ انکے یہاں اعزہ اقارب کی کوئی قید نہیں ہے مذہب کا گذر نہیں ہے، ذات پات کا نام نہیں ہے، جود و کرم ان کا مزاج ہے، پیار و محبت اور سخاوت ان کی فطرت ہے۔ مسدس کے گیارہویں بند میں افق اہل زمانہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ اگر اہل زمانہ درختوں سے سبق لیکر صبر، سخاوت و خاکساری کو اپنے لیں تو سماج اور ملک میں امن چین محبت اور خلوص کی بہاریں آجائیں گی اور دنیا میں خوشحالی چھا جائے گی۔

مسدس کے آخری بند میں افق اپنے آپ کو نصیحت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ افق ہمیشہ شجر کی طرح میز بان بنو، مسافروں کو ہمیشہ اماں دو، بردبار، ثمر دار اور خاکسار بنو:

افق ہمیشہ بنو میزباں شجر کی طرح
مسافروں کو سدا دو اماں شجر کی طرح
کرو تواضع ہر مہماں شجر کی طرح
ہو محو شکر بہار و خزاں شجر کی طرح
برنگ دوحۂ پربار بردبار بنو
مثال نخل ثمردار خاکسار بنو

اس مسدس میں افق نے لفظوں کو بہت خوبصورت انداز میں موتیوں کی طرح پروئے ہیں۔ افق لفظوں کے جادوگر ہیں اور شجر کی افادیت کے فکر فلسفہ کی اپنے تخیل سے مسدس کی شکل دیدی ہے۔

مسدس استاد

۲۶ بندوں کے اس مسدس میں شاعر نے استاد کو نہایت بلند مرتبہ دیا ہے اور اس کو ہادی، پیشوا، نبی، امام سب سے بڑا مانا ہے۔ کیونکہ استاد ہی یہ بتاتے ہیں کہ مذہب کے اعتبار سے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ کلمہ، روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج یہ پانچ چیزیں جو اسلامی مذہب میں اہم ہیں ان کے بارے میں استاد ہی واقفیت کراتا ہے۔ ہر مذہب میں جتنے بڑے لوگ ہوئے اور جتنے لوگوں نے بڑے کام کئے ہیں انہوں نے استادوں کے فیض سے ہی علم حاصل کیا ہے۔ مسدس کے کچھ بند دیکھئے:

استاد باغبان ریاض بجات ہے
کشاف رمز مخفی حسن نکات ہے
رضوان باغ جنت صوم و صلوٰۃ ہے
تفسیر خوان مصحف حج و زکوٰۃ ہے

ممتاز ہے یہ خضر علیہ السلام سے
ہادی سے پیشوا سے نبی سے امام سے

☆

ظاہر اسی سے رمز خفی و جلی ہوئے
مشہور اسی سے زور میں سارے بلی ہوئے
قاریٔ مصحف صفت حق ولی ہوئے
معنیٔ شناس سر لدنی علی ہوئے
شاگرد اس کے دہر میں سکرات ہو گئے
اقلیدؔ و ارسطو و بکرات ہو گئے
چارہ یہی پے مرض گمراہی کرے
ہر ایک بلندی کو یہی منتہی کرے
جاہل کو فیض علم سے کامل یہی کرے
شاہوں کے سر کو لائق تاج یہی کرے
فردوس کا اسی سے ہر اک راستہ ملا
عرش بریں تو کیا ہے خدا کا پتہ ملا

☆

حکمت کے عالموں نے اسی میں سبق پڑھے
سیکھے ہنر علوم بلیغ ادق پڑھے
صفحات ماہ و مہر و نجوم و شفق پڑھے
دیوان عرش و فرش کے سارے سبق پڑھے
شاگرد اس کے جو ہوئے استاد ہو گئے
معنیٔ ہوئے جواہر و بہزاد ہو گئے

دنیا کے عظیم ادبیات سے مثالیں لے کر وہ کہتے ہیں:

باعث یہی ہر ایک کی نام آوری کا ہے
شہرہ اسی سے عنصری و انوری کا ہے
نام اس سے بانی سد اسکندری کا ہے
صناع آئینہ کا جسم و سامری کا ہے
عالم میں دھوم اس سے ہے ارجن کے بان کی
آواز تان سین کی بیجو کی تان کی

سبھی درجات انسانی استاد سے علم سیکھتے ہیں۔ بادشاہ سے لیکر غریب تک استاد سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ سبھی بڑے علوم کی شناسائی استاد سے ملتی ہے۔ چاند، سورج، ستارے، عمل، ساتوں آسمانی ودیا، شستر ودیا، موسیقی، سخن سبھی میں استادوں کی اصلاح ضروری ہے۔ انجیل، زبور، قرآن، وید سبھی آسمانی کتابوں میں بیان کئے گئے علم کو استاد ہی واضح کرتا ہے۔ قرآن کے رموز واسرار بنا استاد کے نہیں جانے جاسکتے۔ شاعر کا کہنا ہے:

استاد اسی سے قاریٔ قرآن جہاں ہوا
ہے سر نور پاک اسی سے عیاں ہوا
خامہ اسی سے طوطی شکر فشاں ہوا
ناداں اسی سے واقف راز نہاں ہوا
شاگرد اسی سے کان فنون علوم ہے
سبحان کی طرح اس کی بلاغت کی دھوم ہے

جس گھر میں شمع علم کو پرنور کر دیا
شاگرد کو کلیم سر طور کر دیا
دل سے سواد جہل و حمق دور کردیا
فلفل کو اپنے فیض سے کافور کردیا

دی ایسی عقل و فہم کہ سینا لجا گیا
سینہ کا نور دیکھ کے سینا لجا گیا

اس مسدس کے الفاظ بہت ہی اچھے ہیں۔ افق کے لفظوں اوران کی زبان کا طلسم ہر بند میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سینہ اور سینا دو لفظوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے بند میں نئے معنیٰ پیدا کئے ہیں۔ تشبیہات اور تلمیحات بہت خوبصورت ہیں۔ ان کے تلمیحات کا دائرہ اتنا وسیع وعریض ہے کہ اس میں ہندوستانی ادبیات میں جو تلمیحات اور روایات استعمال ہوئی ہیں تقریباً سبھی آگئی ہیں۔ اسلامی ادبیات سے بھی ظلمت، نور، کفر، ایماں، کافر اور مسلماں، خضر، نبی، امام، نسریمان، شام ماہ نخشب (عطا ابن مقنع)، جمشید، سکرات، ارسطو، بکرات، عنصری، انوری، سامری، موسیٰ، طور سینا، عصا، سد سکندری، بوعلی سینا، قرآن، عباس، حیدر، ظل خدا، اور ہما کا استعمال کیا ہے۔ ہندوستانی ادب سے ارجن، تان سین، بیجو، ویاس، شیو، وکرم، وید کا ذکر کیا ہے۔ مسدس کے آخری دو بندوں میں استاد کا مرتبہ بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

باہر ہے اختیار سے وصف اس کا حق یہ ہے
جزو کتاب زینت جو ہے وہ ورق یہ ہے
پتوار بہر کشتی بہر سبق یہ ہے
سد سکدنری پئے رنج وقلق یہ ہے
سایہ کو اس کے سایہ کو بال ہما کہوں
سایا رسول کا کہوں ظل خدا کہوں

☆

تعریف استاد افق کیا رقم کریں
کیا جادوئے طلسم زبان قلم کریں
لازم ہے اس کے سجدہ کو سر اپنا خم کریں
اپنے لبوں کو وقف سپاس کرم کریں

یا رب ہمیشہ درس وہی ورد اس کا ہو
سبحان طعنہ زن ہو جو شاگرد اس کا ہو

اس مسدس میں شاعر نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو اجاگر کیا ہے۔ مسدس کے تمام بند محاسن شعریت کی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔ لفظوں کی بندش ایسی ہے کہ زبان پر ثقل نہیں کرتے ہیں، طریقہ استعمال سے مشکل الفاظ بھی آسان لگنے لگتے ہیں جو اچھے اور ممتاز ادب کی خصوصیت ہے۔

زبان

افق نے کچھ مختلف موضوعات پر بھی مسدس کہے ہیں جن میں ایک زبان ہے انہوں نے زبان کی ۷ اقسمیں بیان کی ہیں۔ زبان کے ذریعہ خیالات کی ادائیگی کس طرح ہوتی ہے اور وہ آدمی کی ذہنیت کو کیسے عیاں کرتی ہے اسے ۷ انظریوں سے پرکھ کر بتانا افق کا ہی کمال ہے۔ افق لفظوں کے انتخاب اور حسن بیان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ ۲۳ بندوں کے اس مسدس میں بھی شاعر نے ہر طرح کی زبان کے مطابق ہی الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ مسدس کے کچھ بند مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں:

زباں اظہار حال دل کی اک چلتی ہوئی کل ہے
کلید قفل تمیز خواص شہد و حنظل ہے
معمہ اس سے ہر مطلب کا ہر اک بات کا حل ہے
یہی عقدہ کشائے مقصد اعلیٰ و اسفل ہے
یہ آلہ وہ ہے جس سے گفتگو ڈھل کر نکلتی ہے
یہ سانچہ وہ ہے جس میں صورت تقدیر ڈھلتی ہے

☆

زباں کا مرتبہ ہر عضو سے افضل ہے اعلیٰ ہے
حواس خمسہ تن میں اسی کا بول بالا ہے

انا الحق سے اسی نے موت کو ضغطہ میں ڈالا ہے
دعاؤں سے اسی نے ہر بلا کو گھر سے ٹالا ہے
یہ عیسیٰ کے دہن میں مرد قم کہکر جلاتی تھی
پیمبر کے دہن میں وحی حق سب کو سناتی تھی

زبان شہد کی طرح میٹھی اور حنظل کی طرح کڑوی ہوسکتی ہے یہ انداز بیان بہت خوبصورت ہے اور شاعر نے یہاں شعریت کا اعلیٰ ترین خیال کو پیش کیا ہے۔ خاص طور سے شہد اور حنظل، اعلیٰ ور اسفل لفظ استعمال کر کے اعلیٰ درجہ کی شعری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ شاعر کا ماننا ہے کہ تقدیر کا بننا یہ بگڑنا زبان پر ہی منحصر ہے۔ اس کی یہی اہمیت ہے کہ دل کے اندر کی چیز بغض نیک اور بدخیال، عیاں کر دیتی ہے۔ حواس خمسہ یعنی قوت شامہ (سونگھنا)، لامسہ (چھونا)، ذائقہ (چکھنا)، سننا (سماعت)، بصارت (دیکھنا) یعنی انسان کی پانچوں اندریون میں سے سب سے اہم زبان ہی ہے۔ منصور نے بھی انا الحق کہہ کر موت کو پریشانی میں ڈال دیا۔ عیسیٰ اور محمد صاحب کا الہامی کلام زبان کے ذریعہ ہی انسانوں تک پہونچا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ فطرت نے زبان میں اپنی طرف سے کچھ نہیں رکھا ہے، اسے جو سکھاؤ وہ سیکھ جاتی ہے لیکن اس میں وہ طاقت ہے جو انسان کو انسان کامل بنا سکتی ہے۔

زبان کی ۷ اقسموں کا شاعر نے ۷ ابندوں میں بیان کیا ہے۔ شاعر کے مطابق ایک طرح کی زبان وہ ہے جو اپنی تیزی سے لوگوں کے کلیجہ میں گھاؤ کر دیتی ہے، دوسری قسم کی زبان ہر وقت جھوٹ بولتی رہتی ہے اور لوگوں کو فریب دیتی رہتی ہے، تیسرے قسم کی زبان وہ ہے جو در شہوار کی طرح آبرو رکھتی ہے اور جس کی عادت ہمیشہ سچ بولنے کی ہوتی ہے، چوتھی قسم کی زبان وہ ہے جس کا کام لوگوں کے دلوں میں پھوٹ پیدا کرنا ہوتا ہے، پانچویں قسم کی زبان ایسی ہوتی ہے جو ہمیشہ سانپ کے منہ کی طرح زہر اگلتی رہتی ہے اور بے وجہ گڑے مردہ اکھاڑ کر گھروں کو اجاڑ دیتی ہے اور امن کو گلشن کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ چھٹی زبان وہ ہے جو پیٹھ پیچھے ہر ایک کی برائی کر کے خوش ہوتی ہے اور لوگوں میں اختلاف پیدا کرتی ہے۔ ساتویں قسم کی زبان ہمیشہ چاپلوسی کرتی رہتی ہے اور خوشامد کر کے ہی اپنے کام بنانا چاہتی ہے، آٹھویں قسم کی زبان وہ ہے جو بڑھ بڑھ باتیں نہیں کرتی بلکہ خاموشی سے بلندی پر چڑھتی ہے، نویں قسم کی زبان وہ ہے جو

ظاہر میں بدمزاجی دکھاتی ہے لیکن جس کے باطن میں شفقت اور الفت ہوتی ہے، دسویں قسم کی زبان وہ ہوتی ہے جس پر ہر نفس اپنے معبود کا نام رہتا ہے، گیارھویں قسم کی زبان میں شیرینی ہوتی ہے جس سے وہ سننے والوں کو اپنے بس میں کر لیتی ہے، بارھویں قسم کی زبان وہ ہے جو پیماں شکن ہوتی ہے اور لوگوں کو وہم وگماں میں مبتلا کر دیتی ہے اور مکر وفن جس کی خو ہوتی ہے۔ تیرھویں قسم کی زبان جہالت اور حجت کی تقریر کرتی رہتی ہے، چودھویں قسم کی زبان وہ ہے جو امن کا پیغام پھیلاتی ہے، غیض وغصہ کے جوش کو ٹھنڈا کرتی ہے اس کے بول سن کر جانی دشمن بھی عداوت چھوڑ دیتے ہیں۔ پندرھویں قسم کی زبان وہ ہے جو مجالس میں نام کرتی ہے اور جس میں تمام اچھے اوصاف ہوتے ہیں اسے کسی کی بھلائی برائی یا چاپلوسی سے کام نہیں رہتا، سولہویں قسم کی زبان وہ ہے جو اپنی تعریف اپنے منہ سے خود کیا کرتی ہے اور اپنی خوبیوں کو اپنے آپ بڑھا چڑھا کر بتاتی رہتی ہے، سترہویں قسم کی زبان کی صفت یہ ہے کہ وہ خدا کی یاد میں زمین و آسماں ایک کر سکتی ہے۔

شاعر نے زبان کے ہر قسم کے بیان کے لئے مختلف طرح کی تلمیحات اور الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ محاوروں کا استعمال بھی مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مسدس کے کچھ اور بند دیکھئے:

زباں ہے دوسری خو جھوٹ کی ہے جس کی نس نس میں
کیا کرتی ہے سچ کو جھوٹ کھا کر سیکڑوں قسمیں
بتاتی ہے دروغ و کذب سے دس سیکڑے دس میں
دکھاتی ہے یہی تاثیر مقناطیس پارس میں
نگیں کو جھوٹے موتی کی طرح جھوٹا بتاتی ہے
در شہوار کو اپنی طرح جھوٹا بتاتی ہے

☆

زباں ہے پانچویں جس سے گڑے مردے اکھڑتے ہیں
جگر میں لادوا ناسور دل میں زخم پڑتے ہیں

بنے گھر غیض کی غصہ کی باتوں سے بگڑتے ہیں
تسلط کے اماں کے امن کے گلشن اجڑتے ہیں
زبان چلتی ہے منہ میں جب یہ قینچی بن کے چلتی ہے
دہان مار کی صورت ہمیشہ زہر اگلتی ہے

اس بند میں تسلط کے اماں کے امن کے گلشن اجڑتے ہیں مصرعہ بہت اچھا ہے اور بیان کو اونچے درجہ کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ شاعر کے مطابق سب سے بہتر زبان وہ ہے جو یاد الٰہی میں زمزمہ سنج رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

زباں دسویں ہے جس پر کبریا کا نام رہتا ہے
کبھی ایشور کبھی مولیٰ کسی دم رام رہتا ہے
جسے ہر وقت ایشور کے بھجن سے کام رہتا ہے
وظیفہ جس پہ یاد حق کا صبح و شام رہتاہے
اسے نام اپنے معبودوں کا جپتے ہر گھڑی دیکھا
دلوں پر اس کی تقریروں کو چھپتے ہر گھڑی دیکھا

اس بند میں شاعر کے بیان کی خوبی یہ ہے کہ اس نے کبریا، ایشور، مولا اور رام سبھی کا ذکر کر کے شاعری میں آفاقی عنصر داخل کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے بھجن وظیفہ یا یاد حق جیسے الفاظ لا کر بند کو دیگر مذاہب کے لئے بھی مقبول بنا دیا۔ یاد حق اور معبود یا آرادھیہ لفظ لا کر شاعر نے اسے سبھی مذہبوں کے لئے قابل تقلید بنا دیا ہے۔

گیارہویں بند میں شاعر نے زبان کی شیرینی اور مٹھاس کا بیان کرتے ہوئے شہد اور قند سے تشبیہ دیے ہے۔ شاعر کے لفظوں کے انتخاب کا کمال حسب ذیل بند میں بھی دیکھئے۔

زباں ہے گیارہویں جس کی سدا دل بند ہوتی ہے
طلاقت جس کی شیرینی میں شہد و قند ہوتی ہے
طبیعت جس کے میٹھے بول سے خرسند ہوتی ہے
صفت میں جس کی منقار عنادل بند ہوتی ہے

شکر یہ گھولتی ہے مثل موسیقار باتوں میں
دل سامع کو کر لیتی ہے اپنا چار باتوں میں

مسدس کے اکیسویں بند میں شاعر نے ایسی زبان کو وصف بیان کئے ہیں جو تمام خوبیوں سے مزین اور آراستہ ہوتی ہے۔ وہ ہر جگہ کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوتی ہے ساتھ ہی ساتھ متانت، لیاقت اور فخر اس کے زیور خاص ہوتے ہیں۔ اسی زبان کا زمانہ غلام ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

خدا نے جس کو اچھے وصف سے مملو زباں دی ہے
اسے گویا کلید قفل گنج شائیگاں دی ہے
متانت ہے کنیز اس کی لیاقت اس کی باندی ہے
ہے نقد فخر پاس اس کے ہمیشہ اس کی چاندی ہے
کبھی اس نے زمانہ کی نظر پھرتے نہیں دیکھی
کبھی شکل اس کی چشم خلق سے گرتے نہیں دیکھی

مسدس کے آخری بند میں شاعر نے کہا ہے کہ شیرینی کے ساتھ دعا اچھی زبان کا خاص وصف ہے۔ اگر کسی کو کلام میں نصیحت اور مٹھاس دونوں ہو تو وہ نوع انسانیت کے لئے کارآمد اور مفید ہوتی ہے:

مرقع عورت

افق کے 'مرقع عورت' کے طویل مسدس کے صرف چوسٹھ بند دستیاب ہیں جس کی شعری بلندیاں اردو کے کلاسیکل معیار پر فائز ہیں۔ افق کی شاعری میں عورت کا جو تصور ابھر کر سامنے آتا ہے وہ اس دنیا کو سجانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ افق مثالیت کے قائل ہیں اور ان کا یہ خیال آفاقی ہے۔ دنیا کے جتنے بھی بانیان مذاہب ہوئے ہیں ان کے نزدیک مثالی عورت ہی دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہے۔ ہندوستان کی تہذیب اور تمدن میں عورت کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی شرم وحیا، پارسائی، جواں ہمتی اور ایثار قربانی کی صفات

کی وجہ سے اسے قابل ستائش مانا گیا ہے۔

افق لکھنوی اس تہذیب کے پروردہ ہیں جس میں عورت دھن دولت، ثروت و مال اور جاہ منصب کا آئینہ ہے جس میں عورت علم کی دیوی بھی ہے جو آج بھی ہندوستانی تہذیب میں پوجا کے قابل مانی جاتی ہے۔ ماں کی قابل حمد وستائش وقار کو اجاگر کرتے ہوئے افق کہتے ہیں:

اگر عورت نہ ہوتی آدمی پیدا نہ ہو سکتے
بنی آدم یہ آدم سے کبھی پیدا نہ ہو سکتے
فقیر باخدا، عابد، ولی پیدا نہ ہو سکتے
رسول اللہ، پیغمبر، نبی پیدا نہ ہو سکتے
یہ جب ہے کیوں نہ عورت مرتبہ میں سب سے عالی ہو
نہ کیوں ہو قدر کے قابل پھلی پھولی جو ڈالی ہو

☆

یہ عورت کچھ عجب شے ذات باری نے بنائی ہے
یہ نعمت کچھ عجب اللہ سے مردوں نے پائی ہے
ادا سے جس نے کور اہل تحکم کی دبائی ہے
زبان شہ بھی جس کے آگے کشکول گدائی ہے
یہی ہے مشتہر کی پرسائی جس کی مریم نے
یہی ہے جس کو دی فردوس پر ترجیح آدم نے

افق کے اس مسدس کے کئی بند تاریخ کی نامور خواتین کے ذکر سے بھرے ہوئے ہیں۔ افق کی شاعری میں عورت کی خوبصورتی سے مراد ظاہری حسن کے ساتھ حسن سیرت ہے جو عورت کا خاص زیور ہے۔ مسدس کے حسب ذیل بند میں اسلامی اور ہندوستانی روایات کی اہم نامچین خواتین کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح اس بند میں اسلامی اور ہندوستانی روایات کا خوبصورت سنگم ملتا ہے۔

ہندو مذہب میں پوجی جانے والی دیویوں پاروتی، لکشمی، سرسوتی، سیتا تارا دروپدی

اور چاند بی بی جیسی عورتوں کے مثال دیتے ہوئے اور اسلامی تہذیب سے فرعون کی بیوی آسیہ جنہوں حضرت موسیٰ کو پالا تھا، محمد صاحب کی چھوٹی بیٹی حضرت علی کی بیوی اور حسن حسین کی ماں حضرت فاطمہ اور عیسائی مذہب کے حضرت عیسا کی ماں مریم کا حوالہ دیکر شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہر دور میں اور ہر مذہب میں ایسی عورتیں ہوئی ہیں جو مثالیت کا نمونہ پیش کرتی ہیں جن پر انسانی سماج کو بجا طور پر ناز ہونا چاہئے۔

ان کے علاوہ عرب کی عذرا جو وامق کی محبوبہ تھی سلمیٰ جو امرأالقیس کی محبوبہ تھی بلقیس جو ملکہ سبا کے نام سے مشہور ہے اور جنہوں نے پیغمبر سلیمان سے شادی کی تھی، لیلہ جس کے عشق میں قیس مجنوں ہوگیا، شیریں جس کے لئے فرہاد نے جان دیدی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب سے راجا نل کی نیک سیرت اور وفادار بیوی دمینتی، راجا رتن سین کی بے انتہا خوبصورت اور پارسا بیوی پدمنی جس نے آگ میں جل کر اپنی جان دیدی لیکن علاؤالدین خلجی سے رشتہ نہیں جوڑا، نور جہاں جس کو ہندوستان کے شہنشاہ جہانگیر نے اپنی حکومت کی باگڈور تک سونپ دی وغیرہ ایسی خواتین کا ذکر ہے جو اپنے حسن کے ساتھ ساتھ پارسائی، وفاداری، بہادری ار ایثار و قربانی کے صفات کی وجہ سے ہی مشہور زمانہ تھیں۔ حسب ذیل بندوں میں افق کہتے ہیں:

ہزاروں خوبرو عورت ملتی ہیں جہاں دیکھو
سنو تاریخ عذرا، ذکر سلمائے جواں دیکھو
پڑھو حالات لیلا قصہ نور جہاں دیکھو
دمن کا کارنامہ، پدمنی کی داستاں دیکھو
نذیر قصہ بلقیس قصہ کب ہے مردوں کا
مثال حسن شیریں حسن حصہ کب ہے مردوں کا

عورت کے حسن کے سامنے بڑے بڑے لوگوں نے سر تسلیم خم کیا ہے۔ اسی سلسلے میں ہندو مذہب کی ایک روایت کا بیان کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ اگر شرنگی رشی کی تپسیا اپسرا امینکا کے حسن ادا سے نہ ٹوٹتی تو نہ تو وہ راجا دشرتھ کے یہاں یگیہ کرنے جاتے نہ ان کی دعا سے دشرتھ کے رام لکشمن، بھرت، شترو گھن ایسے بیٹے پیدا ہوتے۔

ماں کی دعا سے ہی دنیا میں حضرت علی کی شمشیر چمکی ہے۔ مریم کی وجہ سے ہی حضرت عیسی دنیا میں آئے اور انسانیت کو اتنا فائدہ پہونچا سکے۔ اس سلسلہ میں افق ایک تاریخی حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مردوں کی ایک بڑی ناانصافی یہ رہی ہے کہ انہوں نے عورتوں کی سہی تاریخ لکھی ہی نہیں صرف اپنی ہی ذات کی تعریف میں اپنے ہی تذکرے کئے ہیں۔ افق زور دیکر اس بات کو کہتے ہیں کہ اگر تمام تہذیبوں کی مشہور عورتوں کے پورے تذکرے ایمانداری سے لکھے گئے ہوتے تو یہ بات یقیناً سامنے آتی کہ عورتیں اپنی مخصوص صفات کی وجہ سے مردوں کے برابر ہی نہیں بلکہ ان سے زیادہ عزت کی حقدار ہیں۔ اس بارے میں افق کے حسب ذیل بند دیکھئے:

بنائی صرف اپنی ذات کی تاریخ مردوں نے
رقم فرمائی دن کی رات کی تاریخ مردوں نے
لکھی ہر کام کی ہر بات کی تاریخ مردوں نے
نہ کی شائع مگر عورات کی تاریخ مردوں نے
اگر انکے بھی پورے تذکرے زیرِ قلم ہوتے
جہاں کے نامور مردوں سے کام ان کے نہ کم ہوتے

☆

بہت ان میں جری پدماوتی کی طرح گذری ہیں
ہزاروں جامۂ عصمت ستی کی طرح گذری ہیں
حسیں ان میں کروڑوں شیمنتی کی طرح گذری ہیں
وقار خلق لاکھوں سرسوتی کی طرح گذری ہیں
مثال فاطمہ سر تا بہ پا عظمت ہزاروں تھیں
جناب مریم ایسی صاحب عفت ہزاروں تھیں

شاعر اپنے عہد کی انگلینڈ کی مہارانی وکٹوریہ اور بیگم بھوپال کی شوکت اور بلند اقبالی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسی خواتین کس بات میں مردوں سے کم ہیں اور ان

کے اعزاز کو کون نہیں قبول کریگا۔

افق کا ماننا ہے کہ عورت میں نہ صرف اپنے خاندان کے ہر فرد کو بلکہ پورے معاشرہ کو صحیح راستہ پر چلانے کی طاقت ہے۔ لیکن اس کا مکمل اوج اور اس کی صلاحیتیں اس کے صرف شرم و حیا کی پتلی بنے رہنے سے عیاں نہیں ہوسکتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورتیں دماغی قابلیت میں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں جیسا کہ ولایت کے لوگ پہچان اور مان چکے ہیں۔ صرف کم عقل لوگ ہی عورتوں کو ناقص العقل کہہ سکتے ہیں۔ افق کہتے ہیں کہ اگر خواتین کو پرانے زمانہ کی مشہور تعلیم یافتہ عورتوں گارگی، اہلیہ، لیلاوتی، میرا کی طرح اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں اور ان کو برابری سے عزت کا حقدار مانا جائے تو وہ مردوں سے کسی معنیٰ میں کم نہیں نکلیں گی۔ اور ایسی صورت میں پورے معاشرہ کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ مسدس کے ایک بند میں افق یہی کہتے ہیں:

اگر اگلے زمانہ کی طرح تعلیم ہو ان کی
لیاقت صورت لیلاوتی تسلیم ہو ان کی
مثال زوجہ یگیاولک تکریم ہو ان کی
اہلیہ اور میرا کی طرح تعظیم ہو ان کی
امور خانہ داری ہوں ادا پوری لیاقت سے
نہ کوئی ناقل العقل انکو فرمائے حماقت سے

اس مسدس کے ذریعہ افق کہنا چاہتے ہیں کہ مردوں کو عورتوں کی طرف اپنا رویہ بدلنا چاہیئے انہیں اعلیٰ تعلیم سے اپنی صلاحیتیں بڑھانے کے سبھی موقع فراہم کرنا چاہیئے، ان سے پیار و محبت سے پیش آنا چاہیئے، ان کے نیک صفتی کی قدر کرنا چاہیئے تبھی ہر گھر میں جنت کی خوشیاں ہوں گی اور پورا معاشرہ ترقی کے راستہ پر گامزن رہے گا۔ اس مسدس میں شاعر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی وسیع النظری اور روشن ضمیری کا ثبوت ملتا ہے۔

مسدس (حسن وعشق)

افق نے اپنے کچھ مسدسوں میں حسن وعشق کی واردات اور فطرت کا بیان بھی کیا ہے جس کا انداز نہایت دلکش ہے۔اس باب میں ان کے مسدس ''حسن کی بہار'' حسن وعشق'' اور ''زہر عشق'' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ان مسدسوں میں ان سارے الفاظ کا استعمال اور ان ساری روایتوں کا بیان بخوبی ملتا ہے جو وصال اور ہجر کے حوالے سے اردو غزلیہ شاعری میں فارسی شعریت سے آئی ہے۔ یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ ہم کوئی مسدس پڑھ رہے ہیں یا غزل، افق نے اپنے مسدسوں میں حسن کو آفاقی بنا دیا ہے جو کسی پری جمال یہ حور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔شاعر نے ان مسدسوں میں عشق یا پریم کو بھی بہت بلند مرتبہ دیا ہے۔شاعر کا ماننا ہے پورا مظہر کائنات عشق کا نتیجہ ہے۔تصوف میں کہا گیا ہے کہ خدا نے اپنے جلوہ دکھانے کے لئے ہی سارے عالم کو بنایا ہے۔میر تقی میر کا حسب ذیل شعر اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے:

لایا ہے میرا شوق مجھے پردہ سے باہر
میں ورنہ وہی جلوہ راز نہاں ہوں

اپنے لاجواب مسدس پریم میں شاعر نے تمام دلیلیں دیگر سمجھایا ہے کہ حقیقی عشق حاصل ہو جانے سے حیات جاوید کا حصول یقینی ہے۔آیئے اب ان مسدسوں کے چند بندوں پر نظر ڈالیں:

حسن کی بہار

افق کے قلم کا کمال ان کے مسدس ''حسن کی بہار'' میں خاص طور سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں وہ بزم عالم کے ذریعہ اپنے محسن حقیقی تک پہونچنا چاہتے ہیں۔اس مسدس میں

انہوں نے محبوب (نائیکا) کے ہاؤ بھاؤ اور ناز وادا کا اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے۔ محبوب کی چال ڈھال کا بیان کرتے ہوئے انہوں نے ہندی زبان کے الفاظ کا استعمال بھی نہایت خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس مسدس میں افق نے حسن اور اس کے لوازمات کا بیان بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ شاعر کا تعلق دبستان لکھنؤ سے ہے اور یہ مسدس ایک زوال پذیر معاشرہ کی جھلک بھی دکھاتا ہے۔ دبستان لکھنؤ کی شاعری میں کبھی کبھی ہلکا پن پایا جاتا ہے اور اس میں گہرائی و گیرائی کم ہوتی ہے۔ اس مسدس میں افق اپنی طبیعت کے رجحان کے مطابق حسن حقیقی تک پہونچنے کی کوشش میں سرگرداں تھے لیکن بیچ بیچ میں ان کا لکھنؤ کا مذاق شاعری غالب ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ چونکہ افق زبان و بیان کے عظیم فنکار ہیں اس لئے ان کے اوپر لکھنؤ کی اس شاعری کا الزام نہیں آسکا جو اپنی خارجیت کے لئے مشہور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادب اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے، اسلئے افق بھی غیر شعوری طور پر یہ احساس کرادیتے ہیں کہ انکا سماج کیا تھا۔ افق نے اس مسدس میں منصور کا ذکر کیا ہے جنہیں اپنا نام بھول کر محبوب کا نام انا الحق یاد رہا۔ شراب طہور اور صدیوں الفاظ کا استعمال کر کے افق نے اس مسدس کو پاکیزگی عطا کردی ہے۔ منصور، عیسیٰ اور حضرت علی کے کرشمہ بیان کر کے افق نے مجازی محبوب کا رتبہ اتنا بڑھا دیا ہے کہ اسے حقیقت سے ملانے میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس مسدس کے کچھ بند قاری کی نظر کئے جاتے ہیں:

جھینپی چکور دیکھ کے اٹھکیلیوں کی چال
فتنے قدم قدم پہ ہیں محشر کے پائمال
نشہ ہرن ہے بھول گئے چوکڑی غزال
طاؤس کو خرام سے حاصل ہے انفعال
چھاگل میں ہے سد اوم رفتار سور کی
مستی بھری ہوئی ہے شراب طہور کی

محوش جہاں زمیں پہ چلے آٹھ دس قدم
منصور کی دکھانے لگے دسترس قدم
انداز ناز سے جو پڑے پیش و پس قدم
مردوں کے واسطے ہوئے عیسیٰ نفس قدم
ٹھوکر سے لاکھ فتنہ حشر اٹھ کھڑے ہوئے
اٹھ بیٹھے آنکھ کھول کے مردہ گڑے ہوئے

☆

عشاق سے جو آنکھ حسینوں کی چار ہو
ہر سین تیر بن کے جگر میں دو سار ہو
برچھی کی طرح ترچھی نظر دل کے پار ہو
چتون سے چاک سینہ ہو پہلو فگار ہو
شرم و حیا نے اپنے جو نقشہ دکھا دیا
پریوں کو پتلیوں نے چھلاوہ دکھا دیا

☆

تیغ نگاہ ناز و ادا سے جدھر گئی
آنکھوں سے دل میں نقش کی صورت اتر گئی
سینہ کو چیرا کاٹ کلیجے میں کر گئی
ہم شکل ذوالفقار بنی خوں میں بھر گئی
اعجاز اشارہ مردم کشتہ پہ کر گیا
امرت کا گھونٹ حلق سے نیچے اتر گیا

یہاں شرم و حیا الفاظ کا استعمال کر کے شاعر نے بتایا ہے کہ محبوب مہذب ہے۔
''امرت کا گھونٹ'' سے مراد ہے کہ مرتے مرتے عاشق کو دوامی زندگی مل گئی۔
اگلے بند میں معشوق کے حسن واس کی نزاکت کا جس انداز میں بیان ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ شاعر کا تعلق دبستان لکھنؤ سے ضرور ہے۔ تشبیہات، تلمیحات اور استعارات کا بھرپور استعمال

کیا ہے، جیسے مسی آلودہ دانتوں کی تشبیہ نیلم کے چمک سے دی گئی ہے۔ ہونٹوں کی تشبیہ لال بدخشاں سے، حنائی دست کی تشبیہ مرجاں سے اور غازہ کی تشبیہ سلیماں کے نگینہ سے دی گئی ہے:

نیلم مسی نے گوہر دنداں بنا دیئے
لب رنگ پاں لال بدخشاں بنا دیئے
مہندی نے ہاتھ پنجۂ مرجاں بنا دیئے
غازہ نے خود نگینہ سلیماں بنا دیئے
سرمہ سے آنکھ اور بھی جادو بھری ہوئی
کاجل کی عاشقوں کے لئے کوٹھری ہوئی

☆

اللہ رے نازکی حسینان نوجواں
چشم سیاہ کو سرمہ کا دنبال ہے گراں
ابرو کو بار خم خموشی پئے دہاں
غازہ ازار سرخ کو ہونٹوں کو رنگ پاں
جب زلف جوبنوں سے بکھرکر مہک گئی
پتلی کمر سے بوجھ نہ اٹھا لچک گئی

افق نے مسدس کے حسب ذیل بند میں جو تلمیحات استعمال کی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن کا اثر ایک طرفہ نہیں ہوتا۔ یوسف کی خوبصورتی کا اثر زلیخا پر بھی پڑا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

آنکھوں سے لفظ حسن پہ سب صاد کرتے ہیں
نظارۂ جمال خداداد کرتے ہیں
عشق اس کا جن و حور و پریزاد کرتے ہیں
تقلید قیس و وامق و فرہاد کرتے ہیں

کچھ ایسا اس نے عشق کا منتر پلٹ دیا
دھوئی حیا، نقاب زلیخا الٹ دیا

افق مانتے ہیں کہ حسن انسان یا حور میں ہی نہ ہو کر کسی میں بھی ہوسکتا ہے۔ حسن تحریر ہوسکتی ہے، انداز بیاں ہوسکتا ہے، پرویز کا خزانہ اور جم کا نگیں میں حسن ہوسکتا ہے۔ قلم کا بیان خوبصورت ہوسکتا ہے۔ مسدس کے آخری بند میں افق حسن کی آفاقی علامت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حسن زبان و بیان میں بھی ہوسکتا ہے اور دنیا کی دوسری چیزوں میں بھی جلوہ نما ہوسکتا ہے، اس لئے کہ حسن ایک حقیقت ہے۔ مسدس کے آخری بند میں شاعر نے یہی حقیقت بیان کی ہے:

صرف آدمی و حور کا حصہ نہیں ہے حسن
زیور ہر ایک چیز کا ہے بالیقیں یہ حسن
تحریر میں کہیں ہے بیاں میں کہیں یہ حسن
پرویز کا خزانہ ہے جم کا نگیں یہ حسن
خامہ جو وصف حسن میں رطب اللساں ہوا
تمغہ افق کے واسطے حسن بیاں ہوا

حسن وعشق

مسدس ''حسن وعشق'' میں افق نے حسن اور عشق کا موازنہ کیا ہے اور پہلے بند میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ شاعر کی طبیعت میں نیا رنگ ہے اس لئے انداز سخن بھی نیا ہوگا، ڈھنگ بھی نیا ہوگا، طبیعت رنگیں ہے، نغمہ سحر کار ہوگا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسدس میں حسن مجازی اور حسن حقیقی کے بیچ جو کشمکش ہے اس کا بیان کیا ہے۔ یقیناً اس کے بیان میں شاعر نے بہت اچھے بند کہے ہیں جو اپنے آپ میں مکمل ہیں۔ ''حسن وعشق'' کے حسب ذیل بند پیش ہیں:

ہے افق آج طبیعت کا میری رنگ نیا
خاص انداز سخن طرز نئی ڈھنگ نیا

فکر کا سحر نیا، طبع کا نیرنگ نیا
شعبۂ نغمہ نیا، پردۂ آہنگ نیا
حسن اُدھر عشق اِدھر دونوں ہیں جکڑے دل کو
درد ہمدرد فقط ہے جو ہے پکڑے دل کو

حسن کو دیکھ کے دل جیوں ہی پکار اٹھا واہ
عشق نے مل کے مگر منہ سے نکلوا دی آہ
حسن نے پیش نظر کی جو بہارِ شب ماہ
عشق نے سامنے آنکھوں کے کیا روز سیاہ
جیسے دو مستوں کے جھگڑے میں گلابی دیکھی
ضد میں دونوں کی بس اک دل کی خرابی دیکھی

اگلے بند میں شاعر نے نفسیاتی مسئلہ اٹھایا ہے۔ حسن دیکھنے والی چیز یعنی مرئی ہے اور عشق دیکھنے والی چیز نہیں ہے۔ عشق کی ضد ہے کہ وہ حسن کو حاصل کرلے، حسن کو ناز ہے کہ اسے کوئی حاصل نہیں کرسکتا۔ حسن بے پرواہ ہے اور اپنے اندر ہی سمٹتا رہتا ہے عشق تک اپنے محدود رہتا ہے اور حسن کی تخریب پر مائل نہیں ہوتا ہے تبھی تک پسندیدہ اور قابل داد ہوتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے:

حسن کا غمزہ بجا، عشوہ بجا، ناز بجا
شیوہ و گنج کرشمہ بجا انداز بجا
شغل تیر افگنی چشمہ فسوں ساز بجا
خوں فشانی نگاہ غلط انداز بجا
عشق معلوم نہیں دیکھ رہا خواب ہے کیا
خون دل کرنے کو اس میں پرے سرخاب ہے کیا

☆

ذکر یہ مستی یہ صہبا میں جو چھیڑا ہم نے
بیٹھے بیٹھائے لیا سر پہ بکھیڑا ہم نے

قلزم حسن کا کھایا جو تھپیڑا ہم نے
پا لیا بہر اماں عشق کا بیڑا ہم نے
مگر افسوس نہ ظالم نے کہیں کا رکھا
آسماں کا ہمیں رکھا نہ زمیں کا رکھا

ان بندوں کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے مجازی حسن وعشق کا بیا نکیا ہے۔ مذکورہ بالا بندوں میں حسن وعشق کی ان کشمکش کو بیان کیا گیا ہے جو شاعر کے ماحول اور سماج کا ایک حصہ ہے۔ مسدس کے آخری دو بندوں میں شاعر نے حسن اور عشق کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ شاعر نے یہاں حسن وعشق کے لازم ور ملزوم ہونے کو بیان کیا ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر کسی کا وجود ممکن نہیں:

اس جگہ عقل کا یا ہوش کا کچھ کام نہیں
طرہ اس پر ہے خیالات اگر خام نہیں
حسن پر دوش نہیں عشق پر الزام نہیں
غرض اس سے نہیں کچھ ہم کو کوئی کام نہیں
قدرتی جو ہے اثر وہ، کہیں جانے کا نہیں
حسن یا عشق ہو مقدور چھپانے کا نہیں

☆

عشق بے حسن تو ہے حسن بھی بے عشق فضول
فطرتی قاعدہ یہ ہے یہ ہے قدرت کا اصول
عشق بلبل کو نہ ہوتا تو نہ اتراتے پھول
حسن ہوتا نہ تو پھر کیا تھی ثمن کیسی ببول
حسن گل عشق عنادل کے سبب سے چمکا
کبک کا عشق جمال مہہ شب سے چمکا

پریم

اپنے چھتیس بندوں کے مسدس ''پریم'' میں افق نے پریم کو بہت ہی بلند مرتبہ دیا ہے۔ وہ پریم کو ہی زندگی کا حاصل مانتے ہیں۔ پریم ہندوستانی ادب کا ایسا ہے لفظ ہے جیسے اردو کا۔ فارسی ادب کا لفظ عشق ہے۔ پریم کو ہندوستانی ادب میں بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے ارا سے مالک حقیقی تک پہونچانے کا ایک بیحد اہم راستہ مانا گیا ہے۔ افق نے اپنے اس مسدس میں پریم کو مختلف نظریوں سے دیکھا ہے۔ ان تمام نظریات کو بہترین شعری پیکر میں ادا کیا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوتانی ادبیات میں پریم کو بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے اور ہندی کے تمام شعراء نے پریم کو مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے جس طرح اردو ادب میں لفظ عشق کو عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی ادبیات میں پریم لفظ کا استعمال بھی دونوں معنیٰ میں کیا جاتا ہے۔ مسدس پریم میں افق نے پریم کے جذبہ کو سمجھانے کے لئے ہندو مذہب کی روایتوں کا نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ہندی الفاظ ار ہندی محاوروں کا بھی بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔ مسدس کے پہلے بند میں افق نے بتایا ہے کہ حقیقی پریم حاصل ہو جانے سے دائمی زندگی یقینی ہے۔ اسی تصور کو افق نے آب بقا سے تعبیر کیا ہے جس کی وضاحت قبلہ نما، کشش کہروبا، قوت برقی اور کبک کے دل میں مہ کامل کو بیٹھانے سے تعبیر کیا ہے۔ مسدس پریم کے پہلے دو بند دیکھئے:

پریم وہ چیز ہے جینے کا مزہ ہے جس میں
پریم وہ ہے، اثر آب بقا ہے جس میں
پریم وہ ہے روش قبلہ نما ہے جس میں
پریم وہ ہے کشش کاہ ربا ہے جس میں
جذبہ دل کے لئے دے قوت برقی دل کو
کبک کے سینہ میں بٹھلا دے مہ کامل کو

پریم کی آخری منزل پہ پہنچنے پر حصول اور زوال کا ڈر نہیں رہتا۔ تردد، تفکر، غم، رنج،

ملال، سب ختم ہو جاتے ہیں:

پریم میں مگن جو ہیں رہتے ہیں دن رات نہال
نہ تردد نہ تفکر نہ غم و رنج و ملال
لو لگی جس سے ہے دھیان اس کا اسی کا ہے خیال
نہ تو پرواہ کمال اور نہ کچھ بیمہ زوال
پریم میں ڈوبے ہوئے رنج سے بیتاب نہیں
دل کو اندیشۂ طوفاں غم گرداب نہیں

پریم کا اثر کیا کیا اور کس حد تک ہو سکتا ہے اس کے لئے افق نے فطرت اور انسانی زندگی سے تمام مثالیں لے کر انہیں خوبصورت شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے واضح کیا ہے کہ کبک یا چکور پریم کے بس میں ہو کر ہی انگارے نگل جاتا ہے۔ سمندر، نارسوزاں سے مچل جاتا ہے۔ پریم کی آگ سے پتھر پگھل جاتے ہیں، پروانے شمع پر جل کر نثار ہو جاتے ہیں۔ پریم کے بس میں ہو کر عاشق اپنی زندگی بدل دیتے ہیں۔ سنیاسی ایشور کے پریم میں زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ پریم سے دنیا چلتی ہے۔ ماں باپ اور اولاد میں محبت ہوتی ہے۔ مچھلیاں اور آب رواں میں تن و جاں کی محبت ہوتی ہے۔ چاتک سواتی کی ایک بوند کے لئے سارے برس پیاسہ رہتا ہے۔ بلبلیں پھولوں پر نثار ہوتی ہیں چاہے کانٹے ان کی سینے کے آر پار ہو جائیں، کمل کے پھول کے پریمی بھنورے رات رات بھر کمل کے پھول کے اندر بند رہتے ہیں۔ پریمی پریمیکاؤں پر اور پریمکائیں پریمی پر جان دیتی ہیں، یہاں تک کہ چرندے پرندے تک اپنے مالکوں کے پریم کے بس ہو کر زندگی قربان کر دیتے ہیں۔ دھرو، پرہلاد، شبری، بدورانی، درو پدی سبھی نے ایشور پریم کا سہارا لے کر اپنی منزل مقصود پائی۔ فطرت سے تشبیہ لیکر شاعر کہتا ہے کہ سورج کا پرتو چاند پر پڑتا ہے، زحل، زھرا، برجیس، قمر سب ایک دوسرے کے کشش سے تھمے ہیں۔ نظام کائنات کے اندر پریم ہے تبھی سارے گرہ اپنی جگہ تھمے ہیں۔
حسب ذیل بند میں افق کہتے ہیں:

پریم کا قدرت حق خود ہی دکھاتی ہے اثر
گل خورشید کی رہتی ہے سوئے مہر نظر
کیا زمیں کیا زحل و زہرا و برجیس و قمر
ایک پر ایک ستارے کی کشش کا ہے اثر
یہ نہ ہوتا تو زمیں آج تھمی کیوں ہوتی
خاک تہہ یہ کبھی پانی پہ جمی کیوں ہوتی

افق کے دیگر مسدسوں کی طرح مسدس ''پریم'' بھی ہندوستانی تہذیب، ثقافت، ادب اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں وید اور پرانوں کے حوالوں سے سجا ہوا ہے۔ مہابھارت میں دروپدی کے چیر ہرن کے واقعہ کے بارے میں وہ کرشن اور دروپدی کے درمیان مثالی عشق کے اٹوٹ بندھن کی طاقت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دروپدی پریمی تھی، اس کا سا کہاں پریم ہے آج
صرف پریم ایک طرف ایک طرف راج سماج
آبرو پر جو بنی بولی کہاں ہو مہاراج
لاج جاتی ہے چلو بانہہ گہے کی جو ہو لاج
گوش زد کشن کے جب پریم مری ٹیر ہوئی
لاج رکھنے کو خود آ پہونچے نہ کچھ دیر ہوئی

کرشن کے لئے گوپیوں کے الوکِک یا ماوَرائی پریم کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

برج میں گوپیوں نے پریم کا لوٹا آنند
کام کرتی تھی نصیحت نہ اثر کرتا تھا پند
ہوش میں ہو کہ نہ ہو آنکھ کھلی ہو یا بند
تھا وہی پیش نظر دل نے کیا اس کو پسند
پریم کرنے سے انہیں آ کے جو روکا ٹوکا
آگ کو تیل ہوا اور بھی گیان اُدّھو کا

پریم سے شرابور ادب ہی روح کو خوش کرنے والا ہوتا ہے۔ اور وہ دنیا میں امر ہو جاتا

ہے۔ کرشن کی بھکتی میں ڈوبکر سورداس نے اور شری رام کی بھکتی میں شرابور ہوکر تلسی داس نے جو ادب زمانے کی نظر کئے ہیں وہ دنیا میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

پریم رس نظم میں کچھ بھی جو بھرا ہوتا ہے
روح خوش ہوتی ہے، دل سن کے ہرا ہوتا ہے
اس کی دھن میں جو کوئی نغمہ سرا ہوتا ہے
اس میں جان آتی ہے دل جس کا مرا ہوتا ہے
سور ساگر جو پڑھے لین ہو نارائن میں
درس ایشور کے ملیں تلسی کی رامائن میں

شاعر کا عقیدہ ہے کہ پریم میں وہ طاقت ہے جو ذرہ کو خورشید اور انسان کو خدا بنا سکتا ہے۔ پریم کے بس میں ہوکر ایشور بھی انسان کی شکل میں دنیا میں جنم لے لیتے ہیں۔ اس لئے شاعر کی دعا ہے:

زندگی پریم کی دھن میں جو بسر ہو جائے
ہو جو ذرہ بھی تو خورشید سحر ہو جائے
نہ چھنے راج کہیں اندر کو ڈر ہو جائے
دیوتا کیسے کہ ایشور ہی بشر ہو جائے
پریم ایشور کا نہ چھوٹے یہ اُفق نیم رہے
جب رہے پریم رہے پریم رہے پریم رہے

زہر فراق

۲۴ بندوں کے اپنے اس مسدس میں اُفق نے ہجر کی کیفیت کو خوبصورت انداز میں مختلف تشبیہات اور تلمیحات کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ ہجر اردو شاعری کا ایک بہت اہم موضوع ہے۔ اُفق نے اردو غزلیہ شاعری کی ہجر کی ان ساری کیفیات کو جو غزلیہ شاعری کی اہم خصوصیت ہوا کرتی ہیں، اپنے اس مسدس میں بیان کر دیا ہے۔ شب فرقت، فرہاد، قیس، نل

دمن، زلیخا، مہہ نخشب، سہا، ، دنے، ناہید، کرمک، ثریا، مشتری، سرخاب، شب دیجور، شام غریباں، گلفام، کبک، نرگس بیمار، قمری آبلے کف پا، بسمل، سیماب، طیور زیر دام، وغیرہ الفاظ اردو غزلیہ شاعری کے ہجر و وصل کے بیان میں بیحد استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو غزلیہ شاعری کے بڑے شاعر میر و غالب نے ان لفظوں کے ذریعہ ہجر کی کیفیت بیان کی ہے۔
افق نے اپنے اس مسدس کا تانا بانا اس طرح بنا ہے کہ فراق کی جو کیفیات ہوتی ہیں وہ قاری کے دل میں پوری طرح سے اتر جائیں اور غزلیہ شعری کا لطف بھی مل جائے۔
افق کسی موضوع کو بیان کرنے کے لئے پہلے دعویٰ پیش کرتے ہیں ور پھر دلیلیں دیتے ہیں۔ اس مسدس میں بھی وہ دعویٰ پیش کرنے کے بعد اردو تلمیحات اور روزمرہ سے مثالیں لے کر دلیل دیتے ہیں۔ حسب ذیل بند نمونہ کے طور پر دیئے جاتے ہیں:

شب فرقت کا الم کیا بھلا اہل سخن جانے
اگر جانیں تو دل ذیشان رشک کوہکن جانے
دل فرہاد جانے قیس جانے نل دمن جانے
زلیخا جانے یا بچھڑے ہوئے دولہا دلہن جانے
یہ ہے وہ راز جو شمع شبستاں نے نہیں دیکھی
یہ ہے وہ شب جو چشم ماہتاباں نے نہیں دیکھی

☆

سراپا کفر جو ہے اس کو یہ ایمان دیتے ہیں
عدوئے جاں جو ہوتا ہے اسی پر جان دیتے ہیں
جو ہے بات ان کے دل کی صرف اسی پر کان دیتے ہیں
فلک پر دود آہے دل کی کملی تان دیتے ہیں
بناتا ہے نشیمن مرغ مجنوں ان کے بالوں میں
سکونت خار کی ہے ان کے ہر تلوے کے چھالوں میں

یہ دشت پر بلا میں چھوڑ کر گھر بار رہتے ہیں
ہمیشہ ان کے دامن کے جلو میں خار رہتے ہیں
سدا بیمار مثل نرگس بیمار رہتے ہیں
نحیف و منحنی و ناتواں و زار رہتے ہیں
کف پا میں نہ گر ہوں آبلے یہ چل نہیں سکتے
نہ کانٹے ہوں جو چھالوں میں جگہ سے ٹل نہیں سکتے

☆

افق کی ہے دعا یہ شب نہ کوئی مرد و زن دیکھے
نہ مثل چشم نل دیکھے نہ مانند دمن دیکھے
نہ دولہا کوئی یہ شب مثل قیس کوہکن دیکھے
نہ مانند زلیخا رات یہ کوئی دلہن دیکھے
نہ ہجر عاشق و معشوق ہو سرخاب کی صورت
ملیں سب شب کو باہم حال و مہتاب کی صورت

مسدس (سماجی)

انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے افق نے کچھ ایسے موضوعات پر بھی مسدس لکھے ہیں جن پر عموماً اردو شعراء نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ ان میں شراب کی مذمت، غفلت، اعتبار، تندرستی، زر کی تعریف، فضول خرچی، پابندہ وقت، دروغ گوئی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ مسدس آسان زبان میں ہیں لیکن ان سے سماج کو نصیحت ضرور ملتی ہے اس لئے کہ اس کی ترسیل عوام تک ہے۔ مثال کے طور پر ان مسدسوں کے کچھ بند قرائین کی نذر کئے جاتے ہیں۔

شراب کی مذمت

اسلام مذہب میں شراب حرام ہونے پر بھی اردو شعراء نے شراب کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے۔ شراب نوشی کی عادت پر انہیں نے فخر محسوس ہوتا ہے، عشق میں ناکام رہنے پر غم غلط کرنے کا جیسا یہی ایک طریقہ ہے۔ شراب نوشی میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور یہ انسان اور انسانی سماج کے لئے کس قدر مضر ہے اس خیال کو شاید ہی کسی اردو شاعر نے قلمبند کیا ہے۔ افقؔ نے ایک مصلح کی حیثیت سے اس موضوع پر بالکل اچھوتے ڈھنگ سے خامہ فرسائی کی ہے اور پرزور الفاظ میں شراب کی خرابیاں بتاتے ہوئے شراب کی بے انتہا مذمت کی ہے۔ اس مسدس میں ۵۴ بند ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

حق یہ ہے وجہ خواریٔ مے خوار ہے شراب
میکش کو آب خنجر خوخوار ہے شراب
تاثیر میں نظیر سم مار ہے شراب
آزار ہے شراب دل آزار ہے شراب
امرت کو بادا ایک ہے قطرے میں سم کرے
دیکھے جو آہوئے حرم اس کو رم کرے

افقؔ نے تاریخ حقائق اور مذہبی روایات کی روشنی میں شراب کی مذمت کے لئے دلیلیں پیش کی ہیں۔ دنیا کے ایک دو مذہبوں کو چھوڑ کر تقریباً سبھی مذاہب شراب کو مخالف ہیں۔ محمد صاحب نے شراب نوشی کو ام الامراض ہر مرض کی ماں کہا ہے اور شراب نوشی کو ہر عیب سے خراب بتایا ہے۔ اسی بات کو شاعر نے اس مسدس میں اجاگر کیا ہے کہ ایک اچھے گھر، خوبصورت سماج اور ترقی یافتہ ملک کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ شراب سے دور رہا جائے۔ افقؔ کہتے ہیں کہ:

آب سیاہ ہے یہ شراب اصطلاح میں
آب حرام ہے مئے ناب اصطلاح میں
کہتے ہیں اس کو خانہ خراب اصطلاح میں
ہے خون حیض اس کا خطاب اصطلاح میں
پھولے نہ بادہ کش لقب بادہ خوار پر
ڈالیں ذرا نگاہ خرد جزو خوار پر

ہندو روایات کے مطابق سمندر منتھن سے جو ۱۴ رتن نکلے تھے ان میں ایک شراب بھی تھی جسے دیوتاؤں نے خود قبول نہ کر اسروں کو دیدی تھی۔ شاعر نے کہا ہے:

کہتے ہیں لوگ کیوں نہ پیئں ہم شراب ناب
دیکھو تو سنسکرت میں ہے اس کا مدھیہ خطاب
جب وشن نے متھا تھا سمندر تو زیر آب
چودہ میں ایک رتن جو نکلا وہ تھی شراب
بنت العنب جو ایسی زمانے میں چیز ہو
کیونکر نہ دل پسند نہ کیونکر عزیز ہو

☆

کیا وجہ دیوتاؤں نے خود لی نہ وہ شراب
کس واسطے بشر کو پلائی نہ وہ شراب
کیوں شیو نے زہر کھایا مگر پی نہ وہ شراب
جب رتن تھی تو ایسی بری تھی نہ وہ شراب
کیوں وشنو نے نہ جملہ ملکچھوں کو دم دیا
کیا بات تھی جو مے انہیں دی شیو کو سم دیا

☆

کوڑی جو اس دلیل کی لاتے ہیں دور کی
یعنی خراب خو نہیں اہل سرور کی
اس میکشی میں بات نہیں کچھ قصور کی
بھٹی ہے خلد میں بھی شراب طہور کی

واں بھی ازل سے دور ہے صہبائے ناب کا
بھر کر خدا پلاتا ہے ساغر شراب کا

☆

یہ دوسری دلیل بھی ان کی ہمیں قبول
لیکن نگاہ عقل سے دیکھو تو ہے فضول
امت سے کیوں نہ کہہ گئے قرآن میں رسول
ٹھّرا پیو لنڈھاؤ قرابے اڑاؤ پھول

ڈالو ابھی سے خو نہ خمار اور سرور کی
جنت میں سیل ہوگی شراب طہور کی

ہندوؤں میں سوم رس، جسے دیوتاؤں کو ہی چڑھایا جاتا تھا، اسے بعد میں لوگوں نے شراب کا نام دیا۔ لیکن اصل میں سوم رس کیا تھا اس کے بارے میں رِگ وید میں کیا بیان ہے اسے بھی افق نے سب کو بتایا ہے۔ اس بارے میں مسدس کے اگلے دو بند دیکھئے۔ رِگ وید میں بیان ہے کہ سوم رس دراصل ایک بیل یا لتا کا عرق تھا جس کا رنگ کالا تھا اور اس میں امرت کی صفات تھیں۔

شراب وجود میں کیسے آئی اس بارے میں افق کہتے ہیں کہ روایت ہے کہ کسریٰ بادشاہ کو کسی نے ہزاروں من انگور کا خراج دیا جنہیں احتیاط سے مٹکوں میں بھر دیا گیا تھا۔ وہی انگور خوب سڑ گئے تو انکے عرق سے شراب بنی۔

شراب کی بنیاد ہی کتنی خراب ہے اس کو بتاتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ اتنی خراب چیز کا اثر انسان پر ضرور ہی بے انتہا برا ہوگا۔ شاعر کے مطابق ایسی شراب پینے سے بہتر ہے کہ انسان زہر ہی پی لے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ کیوں نہ ہو شراب کی بنیاد ہے خراب
گودام جا کے دیکھ لو کیفیت شراب
غاروں میں گندگی کی نہ حد ہے نہ ہے حساب
جانوں کا ہوتا رہتا ہے لعن کے سر عذاب
مہوے گڑھوں میں بھیگ کے بالکل بگڑتے ہیں
لاکھوں ہی کیڑے ساتھ ہی گلتے ہیں سڑتے ہیں

☆

میکش جگر جلاتے ہیں ایسی شراب سے
عقل و خرد گنواتے ہیں ایسی شراب سے
میخوار لڑکھڑاتے ہیں ایسی شراب سے
ہوش و ہوس جاتے ہیں ایسی شراب سے
مستی ذلیل کرتی ہے ایسی شراب کی
پگڑی اتار لیتی ہے شرم و حجاب کی

افق نے تمام تاریخی حوالے دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جو پہلے زمانہ کے دانشمند بادشاہ تھے انکے نظام میں میکدے کے دروازہ بند رہا کرتے تھے۔ فیروز شاہ سپہ دار اپنی حکومت کے دائرہ میں کسی میکش کو رہنے نہیں دیتا تھا۔ سکندر خلجی بھی میکشوں کا دشمن تھا۔ اکبر نے عوام وخواص کی شراب نوشی کی عادت کو اپنے رعب داب سے کم کیا۔ مرہٹوں کو اور پیشواؤں کو شراب سے سخت نفرت تھی۔ ان کے راج میں شراب کا بنانا اور بیچنا گناہ تھا۔ راون اور کنس کی شراب نوشی کی عادت کی وجہ سے ہی انکا، ان کی حکومت کا اور ان کے خاندان کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ سکندر اعظم بھی بادہ خواری کی وجہ سے ہی کم عمر میں راہی ملک عدم ہوا۔ قیقباد بادشاہ اور سلطان خلجی بھی شراب نوشی کی عادت کی وجہ سے ہی تباہ ہوئے اور خراب موت مرے۔ بابر جو پرلے سرے کا بادہ خوار تھا، شراب نوشی کو ترک کرنے کے بعد ہی ہندوستان پر فتح حاصل کر سکا۔ منوسمرتی کے گیارہویں ادھیائے کے ایک اشلوک سے بھی حوالے دیتے ہوئے افق نے بتایا ہے کہ شراب پینے والا قاتل سے بھی زیادہ قصوروار ہے اور اس کا مقام دوزخ یعنی گھور نرک میں

ہے۔اسی شلوک میں یہ بھی کہا ہے کہ شراب اگر کسی بھی اچھی چیز سے چھو جائے تو وہ چیز کھانے کے قابل نہیں رہتی ہے۔ اگر کوئی بھول سے بھی شراب چکھ لے تو ہندو مذہب کے مطابق اس کا نئے سرے سے مذہبی فریضہ یا سنسکار ہونا چاہیئے۔ پاراشر منی نے کہا کہ شراب پینے والوں کو سماج میں اچھوتوں کا درجہ دیا جانا چاہیئے۔ جم دگنی رشی نے کہا ہے کہ جو شراب کو ترک کر دیگا اسے بہشت میں جگہ ملے گی۔ اٹھارہویں پران میں وِیاس جی نے بھی کہا ہے کہ شراب گنگا جل ڈالنے سے بھی پاک نہیں ہو سکتی ہے اس کو چھوڑنا ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ ان تاریخی حوالوں کو دیکر افقؔ نے سمجھایا ہے کہ ہر مذہب میں کہا گیا ہے کہ شراب انسانی زندگی کے لئے مضر اور نقصان دہ ہے۔

مسدس کے آخری بند میں افقؔ اس طرح دعا کرتے ہیں:

کر اب دعا افقؔ کہ مؤثر یہ پند ہو
عرض ادب پہ نعرۂ تحسیں بلند ہو
اہل جہاں کو بادہ کشی نا پسند ہو
توبہ کا در کھلے، در میخانہ بند ہو
خمار دخت رز کو دکاں سے نکال دیں
دستار فرق پیر مغاں کی اچھال دیں

اپنے ایک دوسرے مسدس میں بھی افقؔ نے شراب کی مذمت کی ہے مے نوشی کی خرابیوں کو بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

شراب ایسی ہے شے جو عقل پر بجلی گراتی ہے
کلیجہ میکشوں کا زاہدوں کا دل جلاتی ہے
گھٹاتی ہے سمجھ کو بد دماغی کو بڑھاتی ہے
گھلاتی ہے بدن، صحت وروں میں گھن لگاتی ہے
خوشی تھوڑی سی دیکر رنج دیتا ہے سرور اسکا
دکھاتا ہے مزہ گردش کے ہر جام ولور اس کا

☆

مرض باطن میں ہے، ظاہر میں دارو نام ہے اس کا
ہلاہل کا پیالہ، وِش کا ساغر جام ہے اس کا
ہے نشہ ابتدا اس کی، خمار انجام ہے اس کا
ہواس و ہوش کا خاکہ اڑانا کام ہے اس کا
بشر کے کان میں جب اپنا منتر پھونک دیتی ہے
تماشہ دیکھنے کے واسطے گھر پھونک دیتی ہے

شراب نوشی کی سماجی برائی کو جڑ سے دور کرنے کے لئے افق آواز دیتے ہیں:

کہاں ہو بھائیوں سوچو برائی بادہ خواری کی
مذمت کے سبب پہچانو سمجھو وجہ خواری کی
کرو کافور شوق میکشی کی دل سے تاریکی
سمجھ لو غور سے اس شعر کے مضموں کی باریکی
جہاں صہبا برامد جام میں شیشہ سے ہوتی ہے
صراحی میکشوں کی حالت نازک پہ روتی ہے

ادب برائے زندگی کے سلسلہ میں کہے گئے افق کے کچھ اور مسدسوں کے چند بند بھی نذر قارئین کیئے جاتے ہیں۔

غفلت

مسدس ''غفلت'' میں افق بتاتے ہیں کہ غافل کی زندگی ہمیشہ خطرہ میں ہی رہتی ہے۔ غفلت سے قوموں اور ملک اپنا کیا کیا کھو دیتے ہیں اس کی احساس بہت بعد میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے حوالہ دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ہماری غفلت کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم غلامی کے شکنجہ میں پھنستے چلے گئے اور ہمارا سب کچھ دیکھتے دیکھتے لٹ گیا۔ مسدس کے حسب ذیل بند دیکھئے:

بلائیں سیکڑوں غفلت سے آ جاتی ہیں گھر بیٹھے
پھنسے پھندے میں طائر مائل غفلت اگر بیٹھے
جو کی زردار نے غفلت تو اژدہے گنج پر بیٹھے
جو پایا شیر کو غافل شکاری وار کر بیٹھے
اگر تیراک سے غفلت ہوئی منجدھار میں ڈوبا
ہوا غواص اگر غافل یم افکار میں ڈوبا

☆

مٹایا ہندوؤں نے مدتوں کا راج غفلت سے
سلاطین مسلماں نے گنوایا تاج غفلت سے
امیروں نے جو کل پایا تھا کھویا آج غفلت سے
تھا جو ہندوستاں زرخیز ہے محتاج غفلت سے
اگر غفلت نہ کرتے ہم نہ یاں چنگیز آ سکتا
نہ خوف نادر و اندیشہ انگریز آ سکتا

☆

مگر غفلت جو کی ہم نے حکومت کا اڑا خاکہ
کبھی بابر، کبھی نادر کبھی محمود نے تاکہ
نتیجہ یہ ہوا آخر پڑا، اچھی طرح ڈاکہ
بلاؤں کی شد آمد کو کھلا چاروں طرف ناکہ
چھنا غفلت سے جو کچھ جیب میں جو کچھ کمر میں تھا
لٹا اک آن میں جو کچھ اثاث البیت گھر میں تھا

تندرستی

اپنے ۱۷ بندوں کے مسدس ''تندرستی'' میں افق محمدؒ صاحب کی اس نصیحت کو کہ ''بیماری آنے سے پہلے تندرستی کی قدر کرو'' کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں:

بشر کی زندگی کا جزو اعظم تندرستی ہے
حیات افزائے خیل ابن آدم تندرستی ہے
بہار گلشن افراد عالم تندرستی ہے
مقدم تندرستی ہے، مقدم تندرستی ہے
جو اسکے قدرداں ہیں بیش قیمت اس کو کہتے ہیں
نہایت مغتنم بیحد غنیمت اس کو کہتے ہیں

☆

بشر کو چاہیئے وقت سحر جاگے ہوا کھائے
کبھی کھانا نہ اپنی بھوک سے کچھ بھی سوا کھائے
کھلے گھر میں رہے ورزش کرے اچھی غذا کھائے
کرے پرہیز اطباء جو بتائیں وہ دوا کھائے
نہ پینے کو ملے بہر رواں کا صاف اگر پانی
پئیں خوب اوٹ کر یا گرم کرکے چھان کر پانی

☆

اطباء جو ہوں اچھے ان کو سمجھیں رہبر و ہادی
کریں بنیادکو مضبوط سن پاکر کریں شادی
غذائیں مختلف کھائیں نہ ہوں ایک چیز کے عادی
وہ شے کھائیں اثر میں جو نہ ہو صفراوی و بادی
نہائے روز کپڑے صاف پہنے صاف گھر رکھے
اصول تندرستی جو ہوں ان سب پر نظر رکھے

بہت ممکن ہے افق نے جب یہ بند لکھے ہوں صحت کے اعتبار سے سماج میں اتنی پریشانیاں نہ ہوں جتنی آج ہیں جیسے اچھی غذا، صاف پانی، صاف ہوا کا نہ ملنا، کھانے کی ہر شے میں ملاوٹ وغیرہ۔ یہ چیزیں شاعر کے زمانے میں مدعے کی شکل میں ابھر کر نہیں آئی تھیں پھر بھی افق نے انہیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جو شاعر کی آفاقیت کے غماز ہیں۔ کمسنی میں

کی گئی شادیاں بھی ہندوستانی سماج کے لوگوں کی خراب تندرستی کی خاص وجہ ہے اس طرف بھی افقؔ نے توجہ دیئے جانے پر زور دیا ہے۔

زر کی تعریف

۱۱بندوں کے اس مسدس میں زر کی تعریف کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ زر ایک نعمت ہے کیونکہ عشرت، عزت، لطف اور آرام زندگی میں زر کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ زر کی وجہ سے ہی بڑی بڑی عبادتگاہیں اور عمارات بنتی ہیں، اسی سے رعب و دبدبہ قائم رہتا ہے۔ زر کے بنا سب کام رُک جاتے ہیں اور اس کے نہ ہونے سے اکثر ذلت اٹھانا پڑتی ہے اور انسان کی کرکری بھی ہوتی ہے۔ اس لئے زر کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زر گناہ کی جڑ بھی ہوتا ہے۔ زر ہمیشہ نہیں رہتا اس لئے کسی شخص کو دولتمند ہونے پر غرور نہیں کرنا چاہیئے۔ زر ایک جگہ نہیں رہتا اور یکساں نہیں رہتا۔ چاند کی طرح گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ زر کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس سے سبھی نیک کام ہوتے ہیں لیکن اسے استعمال کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ اسے خدا کی راہ میں صرف کیا جائے تبھی خدا انسان سے خوش ہوگا۔ مسدس کے کچھ بند دیکھیئے جن میں بندش الفاظ اور ترکیب بہت خوبصورت ہیں:

زر زر ہے غنچۂ چمن کائنات کا
زر ماہتاب ہے پلک شش جہات کا
زر ناخدا ہے کشتیٔ بحر حیات کا
زر رہنما ہے رہروئے راہ نجات کا
پُن دان اسی سے صدقہ و خیرات اسی سے ہو
آرام و عیش ولطف کی ہر بات اسی سے ہو

خیرات خانے، مقبرے ، پل، باغ، خانقاہ
مسجد، امام باڑہ، سرا گنج، حوض و چاہ
مندر، فصیلے قلعے، شوالے محلِ شاہ
تالاب، گھاٹ کوٹھیاں، گڑھ اور بارگاہ
یہ سب بقائے نام زر اہل مال ہیں
سب زر کی یادگار عظیم المثال ہیں

پابندی وقت

ادب برائے زندگی کے سلسلہ میں افق نے انسان کی زندگی میں وقت کی اہمیت کو نہایت پراثر ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔۲۰ بندوں کے اس مسدس میں شاعر نے وقت کو کئی نظریوں سے دیکھا ہے۔وقت کیا ہے،لوگ اسے کھوکر کیسے پچھتاتے ہیں،وقت سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے اس بات کو افق نے اپنے اس مسدس میں سمجھایا ہے۔جولوگ وقت کی اہمیت سے بے خبر اپنی زندگی کا بیش قیمتی حصہ گنوادیتے ہیں ان پر طنز کرتے ہوئے افق کہتے ہیں:

انہیں خبر نہیں دن رات کیا سحر کیا ہے
منٹ سیکنڈ ہیں کیا، پل گھڑی پہر کیا ہے
اذان صبح، نسیم سحر، گجر کیا ہے
ہے دھوپ چاندنی کیا، مہر کیا، قمر کیا ہے
بھلا کے نور کے تڑکے کو منہ اندھیرے کو
یہ جانتے ہی نہیں صبح کو سویرے کو

گذرا ہوا وقت کسی صورت واپس نہیں آسکتا اس لئے ہر ایک لمحہ کو اچھی سے اچھی طرح استعمال کرنا چاہئے اور کسی صورت میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے اس بات کو افق اس

طرح سمجھاتے ہیں:

نہیں وقوف کہ نور قمر کا نام ہے کیا
شعاع مہر افق کی ضیا کا کام ہے کیا
خسوف ماہ، مہ نو ، مہ تمام ہے کیا
چراغ صبح ہے کیا شے، چراغ شام ہے کیا
شفق سحر کی ہے کیا شام کی شفق کیا ہے
دم نماز ہے کیا یاد وقف حق کیا ہے

مذکورہ بالا بند میں شاعر نے وقت کی اہمیت اسلامی روایات میں سمجھانے کی کوشش کی ہے خصوصاً نماز کے ان اوقات کا ذکر کیا ہے جو بہت نازک ہوتے ہیں جیسے مغرب کی نماز، فجر کی نماز، نماز خسوف (چاند گرہن) عصر کی نماز وغیرہ۔

مسدس کے ایک اور بند میں افقؔ وقت کی اہمیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

عزیز دل رہے ہر ایک پل یہ حال رہے
فضول وقت نہ جائے کبھی خیال رہے
گھڑی کے گھنٹوں کی ہر وقت دیکھ بھال رہے
نظر میں چھوٹی بڑی سوئیوں کی چال رہے
گھڑی ہو آنکھ، پلک فوق لے کمانی پر
منٹ ہو موئے مژاں ہو گھڑی کی سوئی نظر

دروغ گوئی

۱۵ بندوں کے اس مسدس میں افقؔ کہتے ہیں کہ جھوٹ سبھی برائیوں کی جڑ ہے اس لئے سبھی مذہبوں میں جھوٹ کو سنگین جرم مانا گیا ہے۔ چغلی کرنا، برائی کرنا، جھوٹ بولنا سب گناہ ہے کیونکہ اس سے انسان کا اعتبار چلا جاتا ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے افقؔ کہتے ہیں:

کشتی منزلت کو جہاں میں بھنور ہے جھوٹ
تیر جگر فگار و وقار بشر ہے جھوٹ
صدق اور راستی کو خسوف قمر ہے جھوٹ
انساں کے اعتبار کو کوسے سفر ہے جھوٹ
خوئے دروغ شیشہ ایماں کو سنگ ہے
شمشیر آبرو کے لئے کذب جنگ ہے

☆

قرآن بے نقطہ نہ کلام خدا ہوا
خالص تلا کبھی نہ زر کیمیا ہوا
بیدار شخص پر نہ فسوں خواب کا ہوا
چھپتا نہیں ہے نیل میں پانی ملا ہوا
یوں ہی مجال کیا کہ جو بہروپ کھل نہ جائے
کذب بشر کرد کی ترازو میں تل نہ جائے

مسدس (متفرقات)

افق کے کچھ مسدسوں میں غمزدہ لوگوں کے جذبات اور احساسات کی پر اثر ترجمانی کی گئی ایسے دلرس مسدسوں میں محرم، ماتمی ہولی، ماتمی ٹوہنی کوئن وکٹوریہ قابل ذکر ہیں جن کے کچھ بند قارئین کی نظر کئے جاتے ہیں۔

محرم

افق نے محرم مسدس میں اپنے وقت کے لکھنؤ کے محرم کا بیان کیا ہے۔ اس وقت کے محرم کی سبھی روایتوں جیسے ضریح، سبیل، چراغاں، رنج وغم، آہ وفغاں، پنجۂ علی، ائمہ مظلوم، گھڑیال، نالہ کش، مہندی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ افق نے اس مسدس میں محرم کے دردناک منظر کو

خوبصورت تشبیہات کے ساتھ پیش کیا ہے۔شاید یہ محرم کا غم کم کرنے کے لئے کیا ہے کیونکہ کسی دردناک منظر کو اچھی تشبیہوں کے ساتھ پیش کرنے سے غم کسی قدر کم ہو جاتا ہے۔مسدس کے کچھ بند قارئین کی توجہ کے لئے پیش کئے جاتے ہیں:

ہر دل میں گھر کیا ہے محرم کی دھوم نے
نکلے ہیں اشک آنکھوں سے دامن کو چوم نے
گھیرا دلوں کو رنج و الم کے ہجوم نے
دامان چرخ تر کیا اشک نجوم نے
رم جھم برس رہی ہے گھٹا چشم زار کی
بجلی چمک رہی ہے دل بیقرار کی

ماتم کا داغ زینت ماہ تمام ہے
شبنم سبیل نظر شہ تشنہ کام ہے
منبر فلک ہے مہر زری ہے امام ہے
مرزا دبیر منشی گردوں مقام ہے
دامن ضیائے مہر کا چشم قمر پہ ہے
رونا غم حسین میں ختم ابر تر پہ ہے

محرم کے موقعہ پر غمزدہ لوگوں کے غم میں شریک ہوتے ہوئے اور کربلا کے حادثہ کی یاد دلاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

ہے شوق روح رنج کی یوں دھوم کیجئے
دل یاد اہل بیت سے مغموم کیجئے
ذکر فغاں و گریہ کلثوم کیجئے
ہر دم غم ائمہ مظلوم کیجئے
رو لیجئے نبی کے نواسوں کے واسطے
مظلوم تین روز کے پیاسوں کے واسطے

اس مسدس میں افق نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ غمزدہ لوگوں کی ہمدردی میں فطرت بھی کس طرح غم میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ حسب ذیل بند میں فطرت کے حوالہ سے ماتم کی منظر کشی کی گئی ہے۔ افق لکھنوی نے اپنے زمانے کے محرم کے ماتم کو جس انداز میں دیکھا ہے اس کو اعلیٰ شاعری میں بیان کیا ہے:

روئے حباب حوض چمن پھوٹ پھوٹ کے
دست مژہ سے اشک گرے چھوٹ چھوٹ کے
گھڑیال نالہ کش ہوئے سر کوٹ کوٹ کے
نظم فلک نے بین کئے ٹوٹ ٹوٹ کے
آنسو بہائے ابر نے بجلی تپاں ہوئی
چٹکی کلی جو کوئی وہ محو فغاں ہوئی

محرم کا اثر ہر عقیدتمند پر کس طرح پڑتا ہے یہ افق کی زبان میں دیکھئے۔ واقعہ کربلا کے افراد جو امام حسین کے ساتھ شریک سفر تھے، انکا نام بھی اسی پس منظر میں لیا گیا ہے:

زخمِ حسین دیدہ اہل نظر بنا
اصغر دل تپاں ہوا اکبر جگر بنا
دلدل ہر ایک توشۂ عمر بشر بنا
پنجہ 'علیؑ' کا پنجۂ مژگان تر بنا
عباس مردمک ہے پلک شکل مشک ہے
جائے فرات قلزم زخار اشک ہے

محرم کے دردناک واقعہ کے درد کی تڑپ کا بیان شاعر نے اس طرح کیا ہے:

دل کو ہوس ہے ماہی بے آب میں بنوں
آتش کا میں سپند ہوں، سیماب میں بنوں
ہم شکل مرغ لبسمل بیتاب میں بنوں
نبض مریض برق جہاں تاب میں بنوں

مرغ اسیر بن کے میں تڑپوں یہ حال ہو
شرمندہ مجھ سے آتش سوزاں کا بال ہو

کربلا کے دردناک حادثہ کا رو رو کر بیان کرنا بھی ثواب دارین مانا جاتا ہے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں اور اپنے عقیدہ کے لئے سب کچھ قربان کر دینے والوں کی یاد کر کے انسان نیکیوں کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اس بات کو افق نے اس طرح بیان کیا ہے:

اس غم میں بین وجہ ثواب عظیم ہے
آل رسول سے طلب مال و سیم ہے
ہر آہ سرد غنچہ دل کو نسیم ہے
جو لخت دل ہے غیرت در یتیم ہے
ہے زاد آخرت یہ ہے توشہ نجات کا
دھوکا ہے اس پہ خضر کو آب حیات کا

اشکوں کی رو میں طائر آرام جاں بہا
کار ملال بن کے خسِ بوستاں بہا
آنکھوں سے خون بن کے کلیجہ جہاں بہا
مٹی میں مل کے بن گیا لالہ گراں بہا
اہل عزا سے جملہ ملک مات ہو گئے
لوٹا ثواب، داخل حسنات ہو گئے

اس مسدس میں افق نے حالات کربلا اور علی اور ان کے بیٹوں کی شہادت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دل پر اثر ہوئے بنا نہیں رہتا۔ افق کے وقت کی لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب کا اثر بھی اس مسدس کے بیان پر ہے۔

ماتمی ہولی

ہولی ہندوستان میں مسرت وشادمانی کا تیوہار ہے لیکن افق نے مسدس کی صنف میں ایک ماتمی ہولی کہی ہے۔ شاعر کی زندگی میں ایک سال ہولی سے پہلے یقیناً ایک ایسا سانحہ پیش آیا تھا جس سے متاثر ہوکر ماتمی ہولی کہی گئی۔ یہ مسدس ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کے حکم سے کئے گئے بنگال صوبہ کی تقسیم کے واقعہ سے متاثر ہے۔ اس مسدس کے اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ شاعر کا دل یقیناً مغموم تھا کیونکہ ہولی پر جو مسدس کہا گیا اس کا ایک ایک لفظ غم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر گل کے ساتھ خار، دل کے ساتھ غم، غنچہ کے ساتھ چاک اور بلبل کے ساتھ خس وخاشاک، پچکاری کے ساتھ خون کے آنسوں، کُم کُمے کے ساتھ دل کے ٹوٹنے کی بات کا ذکر کرکے ہولی کے گانوں کو بیوقت کی راگنی کہہ کر، عیش وعشرت کے ساتھ غم انگیز طبیعت کا ذکر کرکے اور رنگ میں بھنگ جیسے محاورے کا استعمال کرکے لفظوں کے انتخاب اور تراکیب سے شاعر نے شدت سے محسوس کئے گئے غم کا اظہار کیا ہے۔ دراصل یہ افق کی شاعری کا ایک عظیم پہلو ہے جو اختیارات کے دائرہ میں آتا ہے۔ شاعر نے وقت، زمانہ اور حالات کے مطابق لفظوں کو نئے معنیٰ پہنائے ہیں۔ ان کے اس مسدس کا ایک بند جو سراپا غم کا پیکر ہے شعری لحاظ سے اور فنی اعتبار سے بہت خوبصورت ہے کہتے ہیں:

رنگ میں بھنگ ہے کیا بنگ کا ہوا استعمال
رنگ کیا مے کا جم رنگ ہے بد رنگ اس سال
باد صرصر کے طمانچوں سے ہے منہ لال و لال
پھاگ کی رت ملیں کس منہ سے رخ گل پہ گلال
کسے پرواہ ہے کہ اس فصل میں کہے ہولی
ہونا جو بات تھی وہ پچھلے برس ہی ہو لی

شاعر کا یہ کمال ہے کہ اس نے اپنے غم کا اظہار لفظوں کے طریقۂ استعمال سے کیا ہے اور اپنے غم کو بیان کرنے میں یقیناً وہ کامیاب ہے۔ حسب ذیل بند دیکھئے:

پھاگ امسال کا در اصل ہے بے فصل کا پھاگ
ہولیاں گانا حقیقت میں ہے بیوقت کا راگ
ہولی جلنے سے کلیجہ میں سلگ اٹھتی ہے آگ
عیش و عشرت سے غم انگیز طبیعت کو ہے لاگ
کوئی کیوں کر کہے ہنس ہنس کے کبیر اب کی برس
دل میں روتے ہیں صغیر اور کبیر اب کی برس

☆

پھول ٹیسو کے جو پھولے نظر آئے بن میں
لگ گئی آگ نظارہ سے جگر میں تن میں
اشک فواروں کے جاری ہیں ہر اک گلشن میں
ماتمی رنگ ہے ملبوس گل سوسن میں
شام کو گل جو کوئی زینت زیور دیکھا
لوٹتے اس کو دم صبح زمیں پر دیکھا

عیش وعشرت اور مسرت کے تہوار ہولی میں غمزدہ لوگوں کے دلوں کی کیا کیفیت ہوگی اس کو بیان کرنا افق کا ہی کمال ہے اپنی ایک دوسری مثنوی ہولی میں انہیں تشبیہات کی مدد لے کر افق نے ہولی کی بالکل دوسری تصویر کھینچی ہے۔ کیونکہ 'ماتمی ہولی' مسدس تقسیم بنگال کے درد بھرے واقعات کے بعد وجود میں آیا اور اس میں شاعر کے جذبات واحساسات شامل ہیں اس لئے یہ شاہکار دوامی ہوگیا۔

ماتمی ٹوہنی کوئن وکٹوریہ

افق لکھنوی کے دستیاب کلام میں مذہبی شخصیاتی مرثیے نہیں ملتے ہیں۔ انہوں نے ایک مرثیہ ۱۹۰۱ء میں انگلینڈ کی کوین وکٹوریہ کی وفات پر مسدس کی صنف میں لکھا ہے جو ۲۹ بندوں کا ہے۔ اس کا انداز بیاں لکھنؤ کے دیگر مرثیہ گو شعراء کی طرح کا ہے۔ اگر گہرائی و گیرائی

سے اس کا تجزیہ کیا جائے تو انیسؔ، دبیر، جیسے عظیم مرثیہ گو شعراء کے کلام کے اثرات اس میں مل جائیں گے۔ تشبیہات، تلمیحات زیادہ تر اسلامی روایات سے ہیں، لیکن ایک چیز جو اس میں نئی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں موت کو فریق بنایا گیا ہے اور اس کو بد دعا دی گئی ہے،، بالکل اسی طرح جیسے انیس اور دبیر شمر یا یزید کو دیتے ہیں۔ یہ مسدس اعلیٰ ادبی مقام پر فائز ہے جس میں لفظوں کی بندش اور موقع ومحل کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔

مثال کے طور پر اس مسدس کے کچھ بند پیش ہیں:

اے اجل ہیں ! یہ تلظم یہ تعدی یہ ستم
اللہ اللہ، یہ خونریزی تیغِ ماتم
الحفیظ، العجز ایسی بارش خنجر غم
الاماں یہ خلش نیشتر رنج و الم
تجھے اللہ کرے قہر الٰہی سمجھے
تو نے وہ ظلم کیا ہے کہ خدا ہی سمجھے

☆

کیا ازل سے ہے خدا جانے سمائی تجھکو
کوئی ماتم جو کرے ہو وہ بدھائی تجھکو
کوستی ہے تیرے ظلموں سے خدائی تجھکو
کسی دشمن کی بھی موت آہ نہ آئی تجھکو
کیا کہیں جان نہیں صدمہ جانکاہ سے کچھ
پھونک دیتی جو تجھے دور نہ تھا آہ سے کچھ

☆

ہے کوئی آ کے ذرا حال جگر کا دیکھے
پسلیاں سینہ صدچاک کی سر کا دیکھے
زخم ناسور زمانہ کی نظر کا دیکھے
نشتر صدمہ جانکاہ کا چرکہ دیکھے

اف نہ پوچھو کہ ہے کیا ٹیس دل مضطر میں
بادل امڑے ہی چلے آتے ہیں چشم تر میں

☆

کشتی نوح تھپیڑے سے ڈوبو دی تو نے
چپے چپے پہ کہاں قبر نہ کھودی تو نے
دل میں جب آیا زمیں خون سے دھو دی تو نے
رکھے تغلق نہ مغل سور نہ لودی تو نے
تجھ سے تاثیر نہ ظلمات کے معنیٰ کی ہے
نہ ذرا بھی برکت ہجر یمانی کی ہے

اس مرثیہ کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شاعر کی عقیدت شامل نہیں ہے۔

مسدس (سفرنامے)

افق نے مسدس کی صنف میں دو سفرنامے بھی کہے ہیں۔ایک مسدس ''جھجر کا سفر'' اور دوسرا مسدس حیدر آباد دکن کے سفر کے بارے میں ہے۔

جھجر کا سفر

یہ مشہور مسدس اس وقت کہا گیا ہے جب افق نے لکھنؤ سے جھجر ریاست کا سفر طے کیا تھا۔اس مسدس میں انقلاب زمانہ پر شاعر کے اظہار تاثرات ہیں۔اس مسدس میں انہوں نے پرانے زمانہ کی ثقافت خاص طور پر ہندوستانی تہذیب وثقافت کا تمام تاریخی حوالے دیکر بیان کیا ہے۔اس مسدس میں شاعر نے لکھنؤ، دلی اور جھجر شہروں کے پرانے عیش وعشرت کو بہت ہی دلرس انداز میں بیان کیا ہے۔اس مسدس کی شعریت بہترین ہے جو اچھے سفرناموں میں ہی پائی جاتی ہے۔شاعری میں مشاہدہ کو بیان کرنا با کمال شعراء کا حصہ ہوا کرتا ہے لفظوں

کے انتخاب، تلمیحات اور تشبیہات کی مرصع سازی نے اس مسدس کو لازوال بنا دیا ہے۔

اس مسدس میں افق نے دنیا کی کئی پرانی تہذیبوں اور ان کے عروج کے زمانہ کو یاد کرتے ہوئے ان کے زوال پر گہرے غم کا اظہار کیا ہے۔ مسدس میں سب سے پہلے افق نے زمانہ کا ذکر کیا ہے اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ شاید ان کے لاشعور میں یہ بات رہی ہوگی کہ زمانہ کی حقیقت میں وہ حقیقت ہے جس میں سب کچھ سما جاتا ہے۔ انہیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف تاریخی واقعات، روایات، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کے ذریعہ شاعر نے واضح کیا ہے کہ کس طرح بہار کے بعد خزاں اور شباب کے بعد پیری نمودار ہوتی ہے۔ خاص طور سے سلطنتوں کے عروج وزوال کا بیان افق کے اس مسدس میں قابل دید ہے۔ مثال کے طور پر افق کہتے ہیں کہ سکندر، سلیماں، کسریٰ، نعمان، سید مکی، شہریار، رستم، معانی، جواہر، افراسیاب وغیرہ کوئی بھی زمانہ کی گردش کے عذاب سے بچ نہیں سکا۔ حسب ذیل بند دیکھئے:

کیسا سکندر آہ وہ یوناں نہیں رہا
کیسا نگیں نشان سلیماں نہیں رہا
کسریٰ سے بادشاہ کا ایواں نہیں رہا
قصرِ سریر لٹ گیا نعماں نہیں رہا
احرام مصر کے تھے جو بانی کہاں گئے
اے خامہ و جواہر و مانی کہاں گئے

☆

رستم کی جن میں دھاک تھی وہ بستیاں نہیں
لنکا کا نام سنتے ہیں لیکن نشاں نہیں
بوپالی بوتھرا تھا میان جہاں نہیں
ہندوستاں بھی اگلا سا ہندوستاں نہیں
دہلی میں کیا مجال کلیجہ تڑپ نہ جائے
نوحہ الم کا صفحۂ خاطر پہ چھپ نہ جائے

اسلامی روایات میں نادعلی کو بہت طاقتور سمجھا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ نادعلی کا

ورد کرنے والوں پر بھی زمانہ کے اثرات مرتب ہوں گے۔ ہندو روایتوں کا سہارا لیتے ہوئے ارجن، راجہ نل اور راجہ جنک ان سبھی طاقتور حکمرانوں پر بھی وقت کی گردش کا اثر ہوکے رہا یہ افق نے حسب ذیل بندوں میں بیان کیا ہے:

ارجن کے بان کی نہ چلی اس کے سامنے
ٹھہری نہ ذوالفقار علیؑ اس کے سامنے
بھولے کمال اپنا ولی اس کے سامنے
آدم کی بھی نہ دال گلی اس کے سامنے
ناد علی کا اس پہ ذرا بھی اثر نہیں
حافظ ہو لاکھ ہر ایمانی مفر نہیں

اس مسدس میں افق نے لکھنؤ، دہلی اور جھجر کی پرانی شان وشوکت کو بھرے ہوئے دل سے یاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یوں ہی اس انقلاب نے لی جان لکھنؤ
رونق نہ پہلی سی ہے نہ وہ شان لکھنؤ
اجڑا پڑا ہوا ہے گلستان لکھنؤ
وہ اہل فن نہ ہیں نہ وہ شاہان لکھنؤ
دریا جہاں رواں تھا وہاں اب سراب ہے
جس بات کا خیال ہے دل میں وہ خواب ہے

☆

جھجر کی اگلی شان الٰہی کہاں گئی؟
وہ سلطنت وہ سطوت شاہی کہاں گئی؟
اسلاف نے جو وضع نباہی کہاں گئی؟
دولت جو تھی کدھر ہوئی؟ راہی کہاں گئی؟
جو سو رہے ہیں زیر لحد کچھ تو بول دیں
تکلیف اگر نہ ہو تو ذرا آنکھ کھول دیں

اس بند میں پیکر تراشی ہے یعنی مردہ چیز کو زندہ تصور کیا گیا ہے۔ مسدس کے حسب ذیل دو بندوں میں افق نے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اور حال سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے وقت کے تغیر پر افسوس ظاہر کیا ہے یہ بیان بھی نہایت پر درد اور دل کو چھو لینے والا ہے:

جن راستوں پہ پہلے گذرتے تھے تاجدار
اڑتا ہے ان میں چار طرف طائر غبار
اس میں خزاں ہے پہلے تھی جس باغ میں بہار
گل پیشتر جہاں تھے، وہاں آج کل ہیں خار
ہم دیکھتے ہیں باغ کو جس جس کی آنکھ سے
بہتے ہیں اشک خون کے نرگس کی آنکھ سے

☆

افسوس وہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں
پہلے سے شہریار نہیں حکمراں نہیں
وہ کیفیت وہ صورت ہندوستاں نہیں
آواز انقلاب کا بھی یہ کہاں نہیں
دارا رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

☆

پرویز کے تمام خزانہ انہیں میں تھے
جن کو دیئے تھے تاج خدا نے انہیں میں تھے
جم ایسے کون کون نہ جانے انہیں میں تھے
اقبال مندیوں کے زمانے انہیں میں تھے
دہلی نہ تھی زمانہ کی امیدگاہ تھی
رونق وہ تھی کہ خلد میں بھی واہ واہ تھی

جو جنم لیتا ہے اس کا مرنہ لازمی ہے، جو بڑھتا ہے وہ گھٹتا بھی ہے عروج وزوال کا

سلسلہ چلتا رہتا ہے۔اس فلسفہ کو افق نے مسدس کے اگلے بند میں اجاگر کیا ہے:

جلتی تھی شب کو شمع جو گل صبح دم ہوئی
جو شاخ سبز ہو کے بڑھی وہ قلم ہوئی
جتنی زیادہ عمر ہوئی اتنی کم ہوئی
کم عمر بڑھ کے سان پہ تیغ دو دم ہوئی
ہر ایک پھول جس کو ابھارا بہار نے
کوڑے میں پھینکا گردش لیل و نہار نے

مسدس کا آخری بند تشبیہ کے اعتبار سے اور فلسفہ عروج وزوال کی داستان سرائی کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہے۔اس بند میں شاعر نے جو چاند سے مثال دی ہے وہ اہم ہے اور بدیہی ہے یعنی جو سامنے نظر آتی ہے، برطانوی حکومت کو سامنے رکھ کر شاعر نے امید ظاہر کی ہے کہ جھجر کے بھی کبھی پرانے دن واپس لوٹیں گے، انگریزی حکومت کا خاتمہ بدیہی ہے۔افق کہتے ہیں:

سچ ہے کہ ہے زوال ہمیشہ کمال کو
باور نہ ہو تو دیکھ لو بدر و ہلال کو
یوں ہی کمال بھی تو ہے اک دن زوال کو
ہاں دیکھ جاؤ حال سلاطین حال کو
جھجر کے بھی نصیب کبھی جاگ جائیں گے
ہم آپ دونوں مل کے بدھائی بجائیں گے

مسدس حیدرآباد دکن کے بارے میں

نظم اخبار کے مارچ ۱۸۹۰ء کے شمارہ نمبر ۵ جلد نمبر ۳ میں افق کے حیدرآباد سفر نامہ کا آخری حصہ بیان ہے۔ افق نظام حیدرآباد، میر محبوب علی خاں کے وزیر سلطنت مہاراجہ گردھاری پرساد باقی کا دعوت نامہ پا کر ۱۸۹۰ء میں حیدرآباد گئے تھے۔اس وقت داغ دہلوی

نظام حیدرآباد کے درباری شاعر تھے۔ حیدرآباد میں مہاراجہ شیوراج اور مہاراجہ مرلی منوہر نے جو نظام کی سلطنت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، افق کی بہت مہمان نوازی کی۔ یہ دونوں عظیم شخصیت کے مالک قوم کی بہبودی کے لئے تمام اہم کام کرنے کے لئے ہمیشہ ہی کوشاں رہتے تھے۔ افق نے ان دونوں کی حد درجہ تعریف کی ہے۔ اس مسدس میں افق نے نظام کے حیدرآباد کے دربار کے تاثرات اور وہاں ہوئی قومی سبھا کے حالات قلمبند کئے ہیں جو قصیدہ نہ ہوکر احساسات کا بیان ہے۔ افق نے اس مسدس میں مہاراجہ شیوراج کے زیر اہتمام ہوئی قومی سبھا میں جو تجویزیں قوم کی بہتری کے لئے کی گئی تھیں ان کو ہی بیان کیا ہے تاکہ عوام کو ان کی جانکاری ہو جائے اور وہ ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنائے جانے پر فائدہ اٹھا سکیں۔ اس مسدس میں موضوع اور موقع و محل کے حساب سے لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ حیدرآباد شہر کی خوبصورتی، عظمت اور شان و شوکت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

جو اک حیدآباد شہر دکن ہے
فریب بدخشاں نظیر ختن ہے
خزالت میں وہ چین و روم و یمن ہے
چمن ہے، چمن ہے، چمن ہے، چمن ہے
یہی ہے ارم کہتے ہیں عام جس کو
یہی ہے ملا خلد کا نام جس کو

مہاراج شیوراج اور مہاراجہ مرلی منوہر کی قوم کے لئے کی گئی خدمات سے متاثر ہوکر افق نے اس مسدس میں کہا ہے:

مہاراجہ شیوراج کائستھ ماتھر
مہاراجہ مرلی منوہر بہادر
گل و غنچہ بوستان تفاخر
یم اوج اعزاز کے دو بہادر

انہیں قوم کا عیش، انہیں چین کہئے
انہیں عین کہئے انہیں غین کہئے

☆

وہ ہیں شمع محفل چراغ مکاں وہ
یہ مہر فلک ہیں، مہ آسماں وہ
گل و باغ یہ غنچہ بوستاں وہ
یہ ہیں نظم قوم اختر خانداں وہ
وہ بے مثل ، کل قوم میں فرد یہ ہیں
وہ گر درد رس ہیں تو ہمدرد یہ ہیں

☆

جو قومی سبھا حیدرآباد میں ہے
جو ہر وقت کل قوم کی یاد میں ہے
جو مصروف لوگوں کی امداد میں ہے
خیال سخا جس کی بنیاد میں ہے
انہیں کے سبب سے ہے فخر اس کو دونہ
انہیں کے خیالات کا ہے نمونہ

اس مسدس میں افق نے حیدرآباد کی قومی سبھا کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سبھا کا جو جلسہ ۲۳ ستمبر ۱۸۹۰ء کو ہوا تھا اسکو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دسمبر کی تیئس تاریخ جب تھی
بہار انکی دولت سرا میں عجب تھی
پئے اہل قوم انجمن وقت شب تھی
وہ محفل نہ تھی بلکہ بزم طرب تھی
مہاراجہ شیو راج توقیر مجلس
ہوئے جلسۂ قوم کے میر مجلس

ہوئے رونق آرا جب ارباب نامی
ہوئے جمع جب صاحبان گرامی
بہم جب ہوئے قوم والوں کے حامی
اٹھے سب سے پہلے شگن چند سوامی
تھا مسرور فرط مسرت سے چہرہ
تھا سر ان کے پند و نصیحت کا سہرہ

☆

پھر اٹھے مہاراجہ مرلی منوہر
دیا خوب مرغوب و دلچسپ لکچر
پنہایا جو گوش سماعت کو زیور
پھڑک اٹھے آنکھوں کی صورت سخنور
عجب طرز تقریر و حسن بیاں تھا
ہر اک لفظ سے جوش قومی عیاں تھا

☆

غرض یوں ہی جلسے نے انجام پایا
جو مطلب تھا وہ حسب خواہش بر آیا
افق کی دعا یہ ہے تجھ سے خدایا
سبھا پر رہے تیرے دامن کا سایہ
رہیں خضر الیاس کی طرح رہبر
مہاراجہ شیوراج مرلی منوہر

مسدس طنز و مزاح

افق نے کچھ مسدس طنز و مزاح کے پیرایہ میں بھی کہے ہیں طنز ایسا پیرایہ بیان ہے جس میں کسی مسئلہ پر طنز کر کے اصلاح کی جائے لیکن دل کو چوٹ نہ پہونچے۔ اگر چوٹ پہونچ جاتی ہے تو یہیں سے طنز کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں اور ہجو شروع ہو جاتی ہے۔ مزاح کے لغوی

معنیٰ مذاق ہے۔ مزاح انسانی زندگی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ انسانی زندگی میں خوشحالی، فارغ البالی اور مکمل حیات کا تصور کے لئے مزاح کو جگہ دینا ضروری ہے۔

طنز و مزاح کے پیرایہ میں کہے گئے افق کے مسدسوں میں 'ٹیکس نامہ' پولیٹیکل نوحہ، کنجوسوں کی شان میں، وغیرہ اہم ہیں۔ جن میں سے مسدس 'ٹیکس نامہ' (۵ مارچ ۱۸۹۴ء میں شائع) کے کچھ بند نمونہ کے طور پر پیش ہیں :

ٹیکس نامہ

ہے انکم ٹیکس اہل ہند کے افلاس کا بانی
یہ ہے ہندوستاں کی بہتری کا دشمنِ جانی
یہ دولت لوٹنے کے واسطے ہے نادرِ ثانی
شہ محمود غزنی ہے یہ احمد شاہ درانی
نہتا ہو کے لُوٹے قافلہ جو یہ وہ ڈاکو ہے
رعایا کو یہ جیتا جاگتا گویا ہلاکو ہے

یزید اچھا تھا شمر اچھا تھا ابلیس لعیں اچھا
بغل کا گرگ اچھا اور مارِ آستیں اچھا
عدو خنجر بکف اچھا ہے صیادِ کمیں اچھا
سمے دندانِ مار اچھا ، ٹیکس لیکن نہیں اچھا
وہ مرغ اچھا ہے کرتا ہے بلا نازل قفس جس پر
نہیں اچھا بشر قسمت نے بندھوایا ٹیکس جس پر

اقتصادی مسئلوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اور غیر ملکی سرکار کے شکنجہ میں پھنسی رعایا کی مفلسی، مجبوری اور درد کو افق نے کس طرح بیان کیا ہے دیکھئے:

ٹیکس سے جان لاکھوں بندگانِ حق کی ہے عاری
زیادہ زیر باری پر ہوئی حاصل گراں باری
ہے سب کو سانپ کے منہ کی چھچھوندر خوف سرکاری

اُدھر فکر ادائے ٹیکس اِدھر افکارِ ناداری
نہ دیں گر ٹیکس نقصان و مذلت اور بڑھ جائے
گرہستی قرق ہو نیلام پر گھر بار چڑھ جائے

ملک میں پھیلی بے روزگاری، گرانی، غربت اور ان حالات میں ٹیکس ادا کرنے کی ذمہ داری عوام کو سخت مصیبتیں جھیلنے کو مجبور کر رہی ہیں، اور اس کا حل اقبؔ صرف یہ ہی بتاتے ہیں کہ عوام خود اپنی تقدیر کو پلٹنے کی تدبیر کریں۔

برابر ٹیکس کو حاصل ہلالِ آساں فزونی ہے
رعایا کو پریشانی دل دن رات دونی ہے
عدوئے ہند بختِ نارسا کہ رہ نمونی ہے
ترقی کالعدم ہے ! ابتری ہے بد شگونی ہے
دبا ہے مفلسی سے ٹیکس کا بار اُٹھ نہیں سکتا
نہ جب تک خود اٹھائے بخت بے دار اُٹھ نہیں سکتا

مثنوی

مثنوی کے معنیٰ ہیں دو دو کے جو عربی لفظ ثنا سے ماخوذ ہے۔ اس صنف کا انتخاب عموماً وہ شعراء کرتے ہیں جو اپنے وسیع تفکرات اور خیالات کو شعری پیکر میں بیان کرنا چاہتے ہیں اور اپنے خیالات کو خوبصورت اور دلکش انداز میں اس طرح پیش کرنا چاہتے ہیں کہ قاری یا سامع کی دلچسپی لگاتار قائم رہے۔ مثنوی کی صنف میں بہت بڑے بڑے واقعات اور حالات بیان کئے گئے ہیں لیکن اس طرح کی مثنویاں زیادہ تر تصورات اور مبالغہ آرائی سے بھری پڑی ہیں۔

افقؔ لکھنوی کی مثنویوں کا تناظر بہت وسیع ہے انہوں نے مسدسوں کی طرح مختلف موضوعات پر کئی مثنویاں لکھی ہیں یہ مثنویاں رزمیہ، منظریہ، بزمیہ یا عشقیہ، مذہبی اور اخلاقی سبھی طرح کی ہیں۔ افقؔ کا ذہنی دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ ایک آزاد شاعر تھے۔ دیگر اہم مثنوی گو شعراء کی طرح کسی دربار کے لئے انہوں نے مثنویاں نہیں لکھی۔ ان کی اہم مثنویوں میں رزمیہ مثنوی سکھوں کے مہان گرو گوبند سنگھ کے بارے میں ہے جو سوانحی بھی ہے اور بہت پر اثر ہے۔ منظریہ مثنویوں میں صبح کی بہار، شام کی بہار، سورج کیبہار، چاند کی بہار، بچپن کی بہار، بہار جوانی، پیری کی بہار، بسنت اور ہولی کی بہار، برسات کی بہاریں اور ساقی نامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پدماوتی، شکار میں شکار، اور نور جہاں مثنویں میں حسن و عشق کی واردات کا خوبصورت بیان کیا گیا ہے۔ مذہبی یا دھارمک مثنویوں میں راماین یک قافیہ، اوتار، مورتی پوجن، پترشرادھ، تیرتھ یاترا و یرہ اہم ہیں۔ اخلاقی مثنویوں میں استری دھرم، گرو سیوا، قلم کی تعریف وغیرہ۔ مثنوی کے حوالہ سے اگر بات کی جائے تو شاید اردو ادب میں کوئی ایسا شاعر نہیں ملے گا جس کے یہاں اتنے موضوعات پر مثنویاں موجود ہوں۔

افقؔ کی مثنویوں کے بارمیں یہ بات یقین کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اردو کے مشہور مثنوی گو شاعر جیسے میر حسن، مرزا شوق، نسیم جیسے مشہور شاعروں کے رنگ میں مثنویاں نہیں لکھی ہیں مثنویوں کے موضوعات کے بارے میں ان کی سوچ اپنی نجی تھی اور انہوں

نے اس صنف میں اپنے ہی رجحانات طبع کے مطابق سلیس زبان میں اوراپنے ہی مخصوص انداز میں مثنویاں لکھی ہیں۔ان مثنویوں کی زبان صاف ستھری ہے، کہنے میں روانی ہے، مفہوم واضح ہےاور بیان دلکش ہے جس سے وہ بہت پر اثر ہوگئی ہیں۔ان مثنویوں میں کیفیت بھی نمایاں طور پر دیکھنے کوملتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افق نے اپنی مثنویوں میں نئ نئ تشبیہات، تلمیحات اوراستعارات کااستعمال کیا ہے جو پوری طرح ہندوستان کی تہذیب اور ماحول سے جڑی ہوئی ہین۔ اتنا ہی نہیں، افق نے اسلامی کلچراور تہذیب سے تشبیہات اوراستعارات بھی لئے ہیں جو اپنی پوری روایات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جہاں ایک طرف وہ مہابھارت کے شجاع اور بہادر، ارجن کے حیرت انگیز کارناموں کاپرزور بیان کرتے ہیں وہیں دوسری طرف حضرت علی کی شجاعت اور جانفشانی کا بھی پورے عقیدے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔افق کی مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور پنڈت دیاشنکرنسیم کی ''گلزارنسیم'' جیسی مشہور مثنویوں سے زبان وبیان اورتخیل کے اعتبار سے کسی قدر کم نہیں ہیں۔افق کی مثنویوں میں سے کسی ایک کودوسرے پرترجیح دینا بہت مشکل ہے۔ان میں شاعر کی طبیعت پوری جولانی کے ساتھ نظم گوئی پر مائل ہے۔افق لکھنوی کی مثنویوں کی موضوعات کثیرالجہات ہیں اسی لئے کہ ان کے یہاں زندگی اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔شاید ان کی یہ کوشش رہی کہ فطرت کے موضوعات کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کو بھی بیان کیا جائے تا کہ انسانی زندگی جوفطرت کاایک بہت اہم حصہ ہےاور جس نے فطرت کی کاریگری اپنے دل ودماغ کولگا کر حسن کاری کرنے کی کوشش کی ہے، انسانی زندگی کے آئینے میں دیکھی جاسکے۔

ہندوستانی تہذیب، ثقافت تلمیحات اورتشبیہات کا تنازل بہت وسیع ہے جس کوکسی نظم میں صنف شاعری میں سمیٹ پانا بہت مشکل ہے۔لیکن افق لکھنوی اس گلچیں کی طرح ہیں جوچمن کے خوبصورت اور سدابہار پھولوں کو چننا جانتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے تناسب میں بہت سے گل سرسبز افق کے شاعری میں کھلے ہوئے ہیں جو اپنے موقع ومحل اور شاعری میں استعمال ہونے کے فن کے وجہ سے بہت دلکش ہیں۔ افق کی مثنویوں میں مثنویوں کی سبھی خوبیاں مثلاً زبان کالطف، منظرنگاری، سراپانگاری، مکالمہ نگاری، جزئیات نگاری اورمحاوروں کا بہترین استعمال بھی دیکھنے کوملتا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ انبساط کے ذریعہ پڑھنے والے کو

نصیحت بھی ملتی ہے۔

تاریخی واقعات پر منحصر افق کی دو بزمیہ مثنویاں اہم ہیں ا۔ مثنوی پدماوتی اور ۲۔ مثنوی نور جہاں۔

مثنویاں (بزمیہ)

افق کی شاعری میں ہندوستانی عورت کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے وہ ہندوستانی عورتوں کی گھر، سماج اور ملک کے لئے قربانی کے جذبہ اور بہادری کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مثنویوں میں بیان کرنے کے لئے انہوں ایسی ہندوستانی خواتین کا انتخاب کیا ہے جو اس ملک کی تاریخ میں اپنی تمام خوبیوں کی وجہ سے اپنا نام کرگئی ہیں۔

مثنوی پدماوتی

مثنوی پدماوتی میں راجہ رتن سین، رانی پدماتی اور علاء الدین خلجی کے قصہ بیان کیا گیا ہے۔اس مثنوی میں ۱۱۸۱ اشعار ہیں۔

چتوڑ گڑھ کے راجہ رتن سین کی رانی پدماتی بیحد خوبصورت تھی رانی پدماتی کے حسن کا اور اس کی شرم وحیا اور پردہ نشینی کی خوبیوں کا بیان کرتے ہوئے افق نے سراپا نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے۔اس میں زبان اور بیان کی خوبی قابل غور ہے:

سواد دید کا عالم مسی تھی — قمر منہ دیکھنے کو آرسی تھی
جبیں پر تھا عجب خوبی کا ٹیکا — اسی کے سر تھا محبوبی کا ٹیکا
اگر ہو وصف چشم صاف بے پیر — بنے سرمہ کی تحریر اپنی تحریر
جو پتلی زیب چشم سرگیں تھیں — وہ بالکل لیلۂ محفل نشیں تھی
حنا ہوتی تھی ہاتھوں پر نچھاور — قدم لیتا تھا پاؤں کا محاور
عفیفہ پاک دامن پارسا تھی — سراپا شرم سر تا پا حیا تھی
کبھی دیکھے نہ دانت اس کا کسی نے — اگر دیکھے تو خود اس کی مسی نے
بندھے جوڑا تو سیر پشت دیکھے — لگے مہندی تو رنگِ مشت دیکھے

نہایت پاک دامن پتلیاں تھیں　　　کہ خود اس کی بھی نظروں سے نہاں تھیں
یہ پردہ دل سے بھاتا تھا دہن کو　　　جہاں عنقاء بناتا تھا دہن کو
ہر ایک تل تھا گواہِ پرسائی　　　خدا کی مہر ثبت آنکھوں نے پائی
وہ تیکھے وہ سلونے سانولے نین　　　فقط دنیا میں تھے بہر رتن سین

چتوڑ کے راجہ رتن سین اپنے دربار کے برہمن رادھو سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے اسے بے عزت کر کے دربار سے نکال دیا۔ رادھو چتوڑ گڑھ چھوڑ کر دہلی چلا گیا جہاں اس وقت علاء الدین خلجی حکمراں تھا۔ راجہ رتن سے بدلہ لینے کی غرض سے رادھو نے علاء الدین خلجی سے رانی پدماوتی کے حسن کا اس طرح بیان کیا کہ علاء الدین پدماوتی کو حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا اور اس نے چتوڑ پر چڑھائی کر دی۔ رتن سین نے اچانک تھوپی گئی اس جنگ کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ علاء الدین نے چتوڑ پر حملہ نہ کرنے کے شرط یہ رکھی کہ رتن سین اپنی رانی پدماوتی کی صرف ایک جھلک علاء الدین کو کسی طرح دکھا دے۔ پوری ریاست کو جنگ کی مصیبت میں ڈالنے کے بجائے رتن سین نے پدماوتی کا عکس ایک بار علاء الدین کو آئینہ میں دکھا دینا ٹھیک سمجھا۔ اس واقعہ کا بیان افق نے اس مثنوی میں ان الفاظ میں کیا ہے جو جزئیات نگاری کی ایک بہترین مثال ہے:

جو دیکھی امن کی راجہ نے صورت　　　قبول عرض کی سمجھی ضرورت
اٹھائی بام پر شیشہ کی دیوار　　　نہایت صاف شفاف آئینہ دار
طریقہ عجز کا لایا عمل میں　　　بلایا شاہ کو اپنے محل میں
جو کرسی پر ہوا وہ محو آرام　　　وہ ٹکڑا چاند کا آئی لب بام
چھپی نظروں سے جگنو سی چمک کے　　　بنی کوندھا ہوئی غائب لپک کے
نگاہ شاہ نے تصویر کھینچی　　　شبیہ حسن عالمگیر کھینچی
رُکی اف منہ سے زیر لب نکل کے　　　رہیں پلکیں کف افسوس مل کے
ہوا پر جوش شوق وصل دل میں　　　جگہ آنکھوں نے دی رانی کو تل میں

اس واقعہ کے بیان میں نئی نئی تشبیہات اور مترادف الفاظ یعنی ایک معنیٰ کے کئی الفاظ استعمال کر کے شاعر نے بیان کو نہایت پر زور بنا دیا ہے۔

پدماوتی کی جھلک دیکھ کر علاء الدین خلجی اسے پانے کے لئے اور بے صبر ہو گیا اور اپنے وعدے سے مکر گیا۔ اس نے راجا رتن سین کو دھوکے سے قید کر لیا اور اسکی جاں بخشی کی یہ شرط رکھی کہ رانی پدماوتی خود اس کے محل میں آ کر اسے قبول کریں۔ رانی نے رتن سین کو رہا کرانے کیلئے ایک چال چلی۔ اس نے خلجی سے کہا کہ اسے اسکی شرط منظور ہے مگر اسکے ساتھ اسکی سات سو سہیلیاں بھی آئیں گی، جسے علاء الدین نے خوشی خوشی مان لیا۔ رانی نے سات سو پالکیوں میں اپنے چودہ سو ہتھیار بند جانباز سپاہیوں کو بیٹھا دیا اور انکے ساتھ اور ہر پالکی کے ساتھ پالکی اٹھانے والے کہاروں کی جگہ چار چار خنجر بکف سپاہی لیلیئے۔ اس طرح بیالیس سو سپاہیوں کے ساتھ علاء الدین کے محل میں داخل ہو گئی۔ سپاہیوں نے محل میں پہونچتے ہی زبردست مار کاٹ مچادی اور اسی بیچ رانی رتن سین کو گھوڑے پر بیٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ اس واقعہ کو پر اثر انداز میں افق نے اس مثنوی میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زبان کی سلاست، روانی اور الفاظ اور محاوروں کے سہی انتخاب نے بیان کو پرزور بنا دیا ہے، حسب ذیل اشعار دیکھئے:

ہوئی راجا کو لیکر واں سے راہی	مٹایا اس نے داغ رو سیاہی
گئی ڈولے میں ہو کر چست چالاک	معہ شوہر چڑھی گھوڑوں سے بیباک
رخ جاناں کی صورت جب مڑے وہ	تو گٹکا داب کر منہ میں اڑے وہ
جو اترے اپنے ڈولوں سے سپاہی	علاء الدین پر آئی تباہی
وہ باہم گھس پڑے سلطاں کے دل میں	بہایا خوں کا دریا ایک پل میں
لڑے پدماوتی کی جیسی تقدیر	ہوئے اس طرح کشتہ جیسے اکسیر
علاء الدین خلجی کو اڑے ہوش	ہوا بہر غضب بے طرح پر جوش
بدن تھرایا غصہ کے سبب سے	چڑھا چتوڑ پر جوش غضب سے
ہوئی جنگ و جدل باہم کئی بار	مگر قسمت سے راجا کی ہوئی ہار

جنگ مین راجا رتن سین کے ہارنے کی خبر سن کر رانی پدماوتی اور محل کی ہزاروں خواتین نے حملہ آوروں کے ہاتھوں بے عزت ہونے سے بہتر یہی سمجھا کہ وہ سب ایک ساتھ آگ میں کود کر جان دیدیں اور ایسا ہی ہوا۔ یہ دردانگیز حادثہ جسے تاریخ میں ''جوہر'' کہا جاتا ہے، ۲۶/ اگست ۱۳۰۳ء کو ہوا، اس حادثہ کا خلجی پر جو اثر پڑا اسے افق نے شعری پیکر میں اس

طرح ڈھالا ہے :

ہوئی جس وقت روشن آتش غار
بنی ہندو کا مردہ وہ حیادار

پتنگے بن گئے اعضا بدن کے
جلی وہ شمع موسیقار بن کے

ادھر راجہ نے دم میداں میں توڑا
لہو دامان ہستی کا نچوڑا

علاؤالدین نے جب فتح پائی
کہا سونے کی چڑیا ہاتھ آئی

ملی وہ چیز جس کی جستجو تھی
بہم وہ شے تھی جس کی آرزو تھی

جو بے صبری سے دل مچلا بغل میں
گیا خوش خوش وہ راجا کے محل میں

مگر رانی دکھائی دی نہ اس کو
تھی حیرت صورت آئینہ اس کو

خبر جب آگ میں جلنے کی پائی
بدن میں آگ غصہ نے لگائی

ہوا افسوس زوم سرکشی کا
خیال جنگ کا لشکر کشی کا

کچھ ایسا مجمع غم میں گھرا وہ
کہ آپ اپنی نگاہوں سے گرا وہ

افق کی مثنویوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مثالیت یا مثالیت کی تمنا دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں تو ان کا بیان کہاوتوں کی شکل لے لیتا ہے۔ رتن سین کے ملازم رادھو کی دھوکے بازی پر وہ کہتے ہیں:

نمکیں ہو آدمی ہو یا گہر ہو
وہ ہے بے آبرو جھوٹھا اگر ہو

وہ بیشک زخمی اعتبار ہوگا
ذلیل و رو سیاہای خوار ہوگا

وہ راجا سے عوض لینے کی پھر فکر
علاء الدین سے رانی کا وہ ذکر

ثبوت اس بات کا بے وہم شک ہے
کہ دشمن آپ اپنا ہی نمک ہے

سوا اس کے یہ حاصل ہے نصیحت
ہوئی ادنیٰ سے اعلیٰ کی مذلت

***

ملایا خاک میں زور جوانی
اجاڑا بوستان زندگانی

کسی کو بھی کوئی یوں کم نہ سمجھے
کسی شمشیر کو بے دم نہ سمجھے

بدن میں سانپ کے جب تک رہے دم
نہ سمجھے اس کے دانتوں کو کبھی کم

افق نے اپنی شاعری میں ہندوستانی عورت کے اپنی اور اپنے شوہر کی عزت کے

لئے اپنا سب کچھ ہنستے ہنستے داؤ پر لگا دینے کے جذبہ کو اور قوم اور خاندان کے لئے جانثاری کے جذبہ کے لئے اور اس کی بہادری کے لئے اس کو مردوں سے کہیں اونچا مقام دیا ہے۔ رانی پدماوتی کے لئے وہ کہتے ہیں:

خدا بخشے تجھے اے نیک رانی — نظیر فاطمہ مریم کی ثانی
وہ کی جرأت وہ مردانہ کیا کام — زمانے میں ہے تیرا آج تک نام
پھر اس کے بعد راجا کی اسیری — عروس سوئمبر کی دستگیری
یہ کہتی ہے کہ عورت نیک جو ہے — وہ بازوئے قوی خاوند کو ہے
نہیں جرأت فقط مردوں کا حصہ — ثبوت اس کا ہے پدماوت کا قصہ
جو عورت پارسا ہے نیک خو ہے — پرایا مرد اسے مثل عدو ہے
رضا جوئی و دل جوئی شوہر — ہیں اس کے خنجر خصلت کا جوہر
وہ عصمت کو مقدم جانتی ہے — مقدس زندگی سے مانتی ہے

اقؔق اس واقعہ کو صرف ایک قصہ یا کہانی سمجھ کر بیان نہیں کرتے۔ وہ اسے اہل جہاں کے لئے پند نامہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تاریخی واقعہ سے لوگ عبرت حاصل کریں وہ کہتے ہیں:

پھر آخر شہ کا خالی ہاتھ پھرنا — محل سے خامشی کے ساتھ پھرنا
یا پند اس کی پئے اہل خرد ہے — کہ بد آغاز کا انجام بد ہے
سمجھ کر شغل بیہودہ کہ تحریک — حماقت سے کیا گھر لاکھ کا لیک
کیا نقصان جان و مال طرفین — ملایا خاک میں خون رتن سین
مگر غم کو سوا آیا نہ کچھ ہاتھ — فقط داغ حماقت رہ گیا ساتھ
سبق لے اے اقؔق اس مثنوی سے — ڈر آفات امور دنیوی سے
سمجھ لے جس نے طینت پاک رکھی — سلامت اس نے اپنی ناک رکھی

مثنوی نور جہاں

افّق کی ایک اور اہم مثنوی 'نور جہاں' ہے جس کا کردار مغلیہ تاریخ سے لیا گیا ہے۔ یہ ایک بزمیہ یا عشقیہ مثنوی ہے لیکن دوسرے مثنوی گو شعراء کی عشقیہ مثنویوں سے اس بات میں مختلف ہے کہ اس مثنوی کے کردار تصوراتی نہیں ہیں۔ وہ اسی سرزمیں کے لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں مخصوص رول ادا کیا ہے اور ہندوستانی سماج پر بھی اثر ڈالا ہے۔

ایران کے ایک سردار مرزا غیاث الدین کو اپنے والد کی وفات کے بعد گردش کے دن دیکھنا پڑا۔ وہ آب و دانہ کی تلاش میں اپنی بیوی کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں اس کی بیوی نے ایک نہایت خوبصورت بچی کو جنم دیا لیکن انتہائی غربت کے سبب خوبصورت بچی کو وہیں چھوڑ کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ پیچھے سے آنے والے ایک قافلہ میں کسی نے اس بچی کو اٹھا لیا اور بطور دھایہ اس کی پرورش کیلئے مرزا کی بیوی کو ہی رکھ لیا۔ اس وقت ہندوستاں میں شاہنشاہ اکبر حکمراں تھا۔ دہلی آ کر غیاث الدین کی تقدیر پلٹی اس کی رسائی اکبر تک ہو گئی اور اسے دربار میں اچھا عہدہ مل گیا اس کی بیوی بھی بیگم کی ہمجولی بن گئی اور اپنی بیٹی مہرالنساء کے ساتھ محل میں آنے جانے لگی۔ مہرالنساء کے حسن پر شاہزادہ سلیم دل و جان سے فدا ہو گیا۔ اکبر بادشاہ کو یہ پسند نہیں تھا اس نے مہرالنساء کو سلیم سے دور کرنے کیلئے اس کی شادی اپنے بنگال کے صوبہ دار شیر افگن سے کرادی جو نہایت بہادر تھا۔ اکبر کی وفات کے بعد جب سلیم بادشاہ، جہانگیر بنا تب بھی اس نے مہرالنساء کا خیال نہیں چھوڑا اور قاتل بھیج کر شیر افگن کو دھوکے سے مروا کر مہرالنساء کو اپنے محل میں بلوا لیا اور اسے ہندوستان کی ملکہ بنا کر نور جہاں کا خطاب دیا۔ شاہی سکہ پر نور جہاں کا نام کھدا، جہانگیر نام کا بادشاہ تھا اصلی حکومت نور جہاں ہی کرتی رہی۔

مثنوی نور جہاں میں شاعر نے حسن اور عشق کی واردات کا بیان بہت دلکش پیرایہ میں کیا ہے۔ ۱۱۶۶ اشعار کی اس مثنوی میں اصل کہانی شروع ہونے کے پہلے شاعر نے کچھ اشعار تشبیب کے لکھے ہیں جن کا تعلق عشق سے ہے۔ عشق کے ضمن میں ہی حسن کا بیان بھی

آ گیا ہے۔ تشبیب کے اشعار اس طرح ہیں:

بہار عشق انگیز آئی ساقی — عجب فصل جنوں خیز آئی ساقی
مکان عاشقی میخانہ بن جائے — ہو مینا شمع دل پروانہ بن جائے
لنڈھا کر بوتلیں بدمست کر دے — شراب عشق جام دل میں بھر دے
وہ مے دے جس پہ لوٹے منچلہ دل — جسے پھولوں کا رس جانیں عنادل
افق کو آفتاب جام ملک جائے — کنول مستی سے دل کا جس میں کھل جائے
برتِ مے کو تفوق کبک پر ہو — شراب عشق کا ساغر قمر ہو
مزاج یار کی سی تیز مے ہو — مثال زلف عنبر بیز مے ہو
ہو جس کا شوخ مثل مہوشاں رنگ — ہو جس میں مستی معشوق شنگ
جو ایسی مے کہ چھادے دل پہ مستی — تعشق خیز ہو صہبا پرستی
طلسم عشق اعجاز قلم ہو — بیان نظم میں حسن صنم ہو

اس بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہار، عشق، عاشقی، میخانہ، مینا، جام، شمع، پروانہ، کبک، قمری، قمر وغیرہ الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اردو مثنویوں میں عام طور سے ایسے بیانات نہیں ملتے ہیں جو ساز، آواز، صہبا، مہوش، معشوق شنگ، دختر رز، چوتھی کی دلہن، مدبھری چتون، رموز عقل و دانش سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعر نے ان لفظوں کے حوالہ سے عشق اور اس کے لوازمات کو اجاگر کیا ہے۔ یہ اس بات کے غماز ہیں کہ آگے جس کے قصہ بیان ہونے والا ہے وہ حسن کے تمام مناظر کو طے کر کے حسن کی مناسبت سے شہرت عالم پر فائز ہوگی۔

مثنوی نور جہاں میں منظر نگاری کی خوبصورت تصویریں پیش کی گئی ہے مثال کے طور پر آفتاب جام کے حوالہ سے مستی کا کنول کھلنے کے تمنا کی گئی ہے۔ یہ منظر خالص فطری ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کے بعد ہی کنول کھلتا ہے۔ اسی طرح مدبھری چتون وغیرہ بھی فطرت کے حسن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ تشبیب کے اشعار جزئیات نگاری کی بھی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔ شاعر نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ حسن اور عشق کے حوالہ سے جو تشبیہات یا لفظیات ہو سکتی ہیں وہ سب اس چھوٹے سے منظر میں پیش کر دی جائیں۔

تشبیب کے بعد شاعر نے اصل کہانی کو شروعات کی ہے۔ کہانی کی اہم کردار نور

جہاں کی پیدائش، پرورش اور جوانی کا بیان بہت ہی دلکش پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اس کی خوبصورت کو سلیماں کی پری اور مشتری سے ہم وزن کیا گیا ہے جو بہت دلکش تشبیہ ہے اور جو ایک تہذیب کی روایت کی بھی غماز ہے۔اس سے بچی مہرالنساء کے حسن و جمال کی کیفیت پر بھی پوری پوری روشنی پڑتی ہے:

نہ غلمانوں میں تھا ہم پایہ اس کا　　تھا بہر خلد طوبا سایا اس کا
ملک سمجھے سلیماں کی پری ہے　　فلک سمجھا زمیں پر مشتری ہے

ہندوستان کی خوبصورتی اور عظمت کو بیان کرنے کے لئے شاعر نے خلد اور فردوس کی تشبیہوں کا ذکر کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

عجب سامان شاہانہ یہاں تھا　　جلال الدین اکبر حکمراں تھا
بہار خلد ہندوستان پہ غش تھی　　ہوا فردوس کی جاروب کش تھی

جہانگیر کے عشق کی شروعات کو خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کرنے کے لئے شاعر نے اس قصہ کو بیان کیا ہے جو جہانگیر کے نور جہاں کو دو کبوتر پکڑانے اور نور جہاں کے ہاتھ سے دونوں کبوتروں کے اڑ جانے کے بارے میں ہے۔نور جہاں کے ہاتھ سے ایک کبوتر اڑ جانے اور جہانگیر کے یہ پوچھنے پر کہ کبوتر کیسے اڑ گیا نور جہاں نے دوسرا کبوتر اڑا کر کہا کہ ایسے اڑ گیا۔نور جہاں کے اس بھولے پن پر جہانگیر اپنا دل ہار گیا۔اس واقعہ کے متعلق شاعر کا انداز بیان دیکھئے:

تھا جوبن ان دنوں مہرالنساء پر　　قمر شیدا تھا چہرہ کے ضیا پر
جو دیکھی نور کی خوش رنگ تصویر　　ہوا غش اس پہ نور الدین جہانگیر
جنوں انگیز تھا عشق نہانی　　تھی امنگ جوبنوں کی قدر دانی
نگاہیں پیچھے پیچھے گھومتی تھیں　　وہ مکھڑا گورا گورا چومتی تھیں
چھپے چوری محبت کی تھی گھاتیں　　دلوں کے کھینچنے والی تھیں باتیں
کسی دن مست الفت شاہزادہ　　روش پر تھا چمن میں ایستادہ
مگس راں فرق پر بال ہما تھے　　کبوتر طائر رنگ حنا تھے
نظر جب شاہزادہ نے اٹھائی　　روش پر حور گل اندام پائی

گل اپنا باغ میں بلبل نے دیکھا | چمن نے سرو کا سلسل نے دیکھا
کبوتر دیکھے کی گوہر فشانی | لئے رہنا انہیں مضبوط جانی
ہوا خود پھول چننے کو روانہ | اٹھایا طائروں کا آب و دانہ
دکھایا نازکی نے اپنا انداز | تڑپ کر ایک نے لی راہ پرواز
کبوتر ہاتھ میں جو دوسرا تھا | بہت بیچین سا بیتاب سا تھا
کہاں یوں کر کے عشق افزا نظارہ | کبوتر کیا کیا جانی ہمارا
وہ بولی اڑ گیا، پوچھا کہ کس طرح | اڑا کر دوسرا بولی کہ اس طرح
قیامت اس ادا نے کی زیادہ | ہوا چپ مسکرا کر شاہزادہ
جو شہزادہ پھرا اسیرِ چمن سے | پھڑک اٹھا ادا سے بھولے پن سے

نورجہاں کا قصہ ایک تاریخی قصہ ہے جس کی شروعات مغلیہ محل سے ہوتی ہے اور جو مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد آخر میں مغلیہ محل میں ہی اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ قصہ کے جتنے بھی مناظر ہیں ان کو شاعر نے بہت حسن وخوبی سے نبھایا ہے۔ شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کے بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے جس سے اس تاریخی واقعہ میں کہانی پن پیدا ہو گیا ہے اور اس تاریخی واقعہ میں کہانی کے تمام اجزائے ترکیبی جلوہ گر ہو گئے ہیں۔ اس کہانی کو شاعر نے ایک زندگی تسلیم کر لیا ہے جو مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی اپنی آخری منزل تک پہونچتی ہے۔ کہانی کے جو اجزاء ہیں ان کو موقع ومحل کی مناسبت سے اس طرح بیان کیا گیا ہے دلکشی اور شاعرانہ عظمت پورے طریقے سے رونما ہو۔ شاعر کو اس میں اسلئے اور بھی کامیابی ملی ہے کہ موقع کی مناسبت سے الفاظ، تشبیہات اور تلمیحات کا انتخاب کیا گیا ہے۔

لفظوں کے جادوگر افق کی مثنویوں میں زبان موقع ومحل کے مطابق بدل جاتی ہے۔ جہانگیر کے بھیجے ہوئے قاتلوں سے شیر افگن کے مقابلہ کا بیان افق نے ان الفاظ میں کیا ہے:

کسی دن شیر افگن سو رہا تھا | وہ ضیغم شیر قالیں ہو رہا تھا
پئے قتل آدمی چالیس بھیجے | بہادر ضیغموں سے بیں بھیجے
وہ سب شمشیر زن خنجر بکف تھے | مثال ماہ گردوں سر بکف تھے
جو پہونچے یہ دلاور خوابگاہ میں | سلاسل پڑ گئی پائے نگاہ میں

کسی نے میان سے تلوار کھینچی
کسی نے سیف آتش بار کھینچی
فقط دو ہاتھ بڑ جانے کی تھی دیر
کہ آہٹ پاکے ان کی جاگ اٹھا شیر
گھسیٹی میان سے تیغ اٹھ کے جھپٹا
اکیلے دم سے چالیسوں کو ڈپٹا
دکھایا مار کے شب خوں کا سب کو
نہ چھوڑا رکھ لیا خنجر پہ سب کو
کئی شخصوں نے کھائے زخم کاری
ہوا چالیس پر صرف ایک بھاری
چڑھا جب یوں وہ تلواروں کے دم پر
ادب سے پگڑیاں رکھ دی قدم پر
نہ کی اس شیر نے فکر تلافی
عطا فرمائے خلعت دی معافی
دلوں میں اس شجاعت نے جگہ کی
ہوئی نیچی خبر سے آنکھ شہ کی

دوسری بار جہانگیر کے اشارہ پر اس کے سردار قطب الدین نے دھوکے سے شیر افگن کو اس وقت قتل کر دیا جس وقت شیر افگن خود اس سے ملنے جا رہا تھا۔ اس واقعہ کو افق نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

خبر جب شیر افگن خاں نے پائی
بڑے اعزاز سے کی پیشوائی
پیادہ تھے نہ گھوڑے تھے نہ ہاتھی
جلو میں تھی فقط دو چار ساتھی
سپاہی تھے جو قطب الدیں کے ہمراہ
بنے اس شیر دل کو ہالہ ماہ
ہوا خونریز شیر افگن اجل وار
گھسیٹا میان سے خونخوار تلوار
کچھ ایسا ہاتھ قطب الدیں نے مارا
نہ آئی سانس واپس دم نے مارا
سپاہی دیکھتے ہی اس پہ ٹوٹے
قیامت کے ہزاروں ہاتھ چھوٹے
کیا اچھا دل سلطاں کا پھوڑا
ہر اک بوٹی کو قیمہ کر کے چھوڑا
عیال اطفال سب قبضہ میں آئے
متاع و مال سب قبضہ میں آئے

شیر افگن کے قتل کے بعد مہر النساء جہانگیر کے محل میں لائی گئی۔ بادشاہ جہانگیر نے مہر النساء سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور اسے اپنی ملکہ بنانے کی پیش کش کی۔ جہانگیر کی ذہنی اور دلی کیفیت کا بیان افق کے حسب ذیل اشعار میں دیکھئے:

رہی نیت نہ الفت سے ٹھکانے
ہوس نے سیکڑوں سوچے بہانے
محبت سے ہوئی جب چار آنکھیں
بنی بہر قدم دستار آنکھیں

بلائیں لیں نگاہوں نے قدم کی ‏ دلی جذبوں نے پشت عز خم کی
گذارش دست بستہ لب پہ آئی ‏ طبیعت جوش پنہاں سے بھر آئی
سرشک چشم الفت ڈبڈبائی ‏ کلام مدعا زیر لب آئی
چلا دل چیر کر پہلو دکھایا ‏ دلی الفت کا ہر پہلو دکھایا
ادائے عز نے کی سحر سازی ‏ نگاہ شوق نے کی بوسہ بازی
ادھر تھی انکساری جہانگیر ‏ ادھر تھا جوش بیداری تقدیر
قیافہ نے کہا جوش کرم ہے ‏ نظر بولی سر تسلیم خم ہے

جہانگیر کی ملکہ بننے کے لئے نور جہاں نے جو شرط رکھی اسے شاعر نے صرف ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

کل اسباب شہی ،کل عیش و آرام ‏ میری عصمت میری عفت کے ہیں دام

جہانگیر کی حسن پرستی سے حکومت میں کیسی اہم تبدیلیاں آئیں اسے شاعر نے چند اشعار میں اس طرح سمیٹ دیا ہے:

پڑا دل کو مئے وصلت کا چسکہ ‏ رواں قطرہ سے تھا دریا ہوس کا
پرستاں کی پری آئی محل میں ‏ قران مہر و زہرہ تھا محل میں
ہوا مہر النساء کا بختیاور ‏ کئے سلطاں نے جان و دل نچھاور
بڑھایا بیگمات خوش ادا سے ‏ کیا نور جہاں مہر النساء سے
حکومت دے کے عصمت کے دیئے دام ‏ کھدایا سکہ ہائے ملک پر نام
ہوا خود بادہ الفت کا بندہ ‏ کیا مہر شہی پر نام کندہ
سر نور جہاں پر رکھ دیا تاج ‏ ملا سلطاں سے شاہ حسن کو باج

اس طرح پرزور بیان، زبان کی روانی اور سلاست، منظر نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری اور بامحاورہ زبان کے استعمال سے نور جہاں ایک ممتاز مثنوی کا درجہ رکھتی ہے۔

شکار میں شکار

افق کی مثنوی "شکار میں شکار" بھی ایک عشقیہ مثنوی ہے جو اس طرح کی دوسری مثنویوں سے اس معنی میں الگ ہے کہ اس میں ایک پارسا خاتون ہے جیسا عام طور سے اردو مثنویوں میں نہیں ہوتا ہے۔ اس مثنوی کا اہم کردار نہایت خوبصورت و نہایت نیک سیرت اور پارسا ایک شادی شدہ خاتون ہے۔ کسی شکاری نے ایک پرندہ کا شکار کیا جو اتفاق سے اس خاتون کے گھر میں جا گرا۔ شکاری اپنا شکار مانگنے اس خاتون کے گھر چلا گیا جہاں اس خاتون نے بے زبان پرندہ کو مار ڈالنے کے لئے اس کی لعنت ملامت کی۔ شکاری خاتون کے حسن اور طرز گفتگو سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ یہ محبت ایک طرفہ تھی اور خاتون اس سے بالکل انجان تھی۔ خاتون کے شوہر نے شکاری کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا اور اسے دونوں پر کچھ شک ہو گیا۔ خاتون کا شوہر اپنی بیوی کو لیکر دریا اٹک کے پار جانے کو نکلا تو شکاری بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا جس سے شوہر کا شک اور بڑھ گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے سخت پیاس لگی ہے اور جو شخص پیچھے آرہا ہے اس سے وہ پانی لانے کو کہے۔ بیوی نے جب شکاری سے پانی لانے کے التجا کی تو وہ خوشی خوشی جھک کر دریا سے پانی لینے لگا۔ اسی وقت خاتون کے شوہر نے اس کو دریا میں دھکا دیدیا جس سے اس کی موت ہو گئی۔ محض شک کی بنا پر اس کی وجہ سے ایک معصوم کی جان لے لئے جانے سے وہ پارسا خاتون اس قدر صدمہ میں آگئی کہ اسے اپنی زندگی بے معنیٰ لگنے لگی اور اپنے شکی شوہر کو سبق سکھانے کے لئے اس نے بھی دریا میں کود کر اپنی جان دیدی۔

اس مثنوی کی خصوصیت اسکا کہانی پن ہے۔ کہانی اس طرح بنی گئی ہے کہ پورا قصہ ختم ہونے تک دلچسپی بنی رہتی ہے۔ مثنوی المیہ یاد ہے اور اس کا موضوع عشق مجازی ہے۔ اس مثنوی میں ایک طرفہ محبت بیان کی گئی ہے جو اعلیٰ قدروں کی حامل ہے۔ اس لئے کہ انسانی مہذب سماج میں عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ مثالی محبت کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ اور اسی جذبہ کو اس کہانی میں اس طرح نبھایا گیا ہے کہ یقیناً یہ مثنوی بزمیہ، عشقیہ تربیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا اختتام المیہ پر ہوتا ہے جو کہ اخلاق کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہے۔ اس مثنوی

میں ہندوستانی اقدار تمدنی وتہذیبی روایات پورے طریقہ سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی شعر ایسا نہیں ہے جو تہذیب سے گرا ہوا ہو۔

اس مثنوی میں ایجاز کا فن بہت نمایاں ہے، اور شاعر نے کم سے کم لفظوں میں اپنے پوری بات کہہ دی ہے۔ اس مثنوی کے دس اشعار میں مثنوی کی اہم کردار کی خوبصورتی بیان کی گئی ہے جس کے لئے نئی نئی تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے بیان میں دلکشی پیدا کی گئی ہے:

فروکش اس جگہ اک گلبدن تھی	سراپا لیلہ شیریں دہن تھی
ہلال ابرو تھا روئے صاف تھا بدر	تھے گیسوئے معنبر لیلۃ القدر
بدن تھا قلزم خوبی میں ڈوبا	فدا تھا خوشتری پر اس کی طوبیٰ
ادا غمزہ کرشمہ ناز و انداز	تھے سب بہر دل و جاں ناوک انداز
نزاکت سے کمر معجز نماں تھی	کمر چیتے کی تھے بال ہما تھی
بل اسکا کاٹ کرتا تھا جگر میں	لگائے سیف تھی گویا کمر میں
گھر آنکھوں میں کیا جب گھر سے نکلی	بنی پتلی نہ چشم تر سے نکلی
شکار اپنا جو وہ لینے گیا واں	وہ ٹکڑا چاند کا بولی کہ ناداں
یہ کیا تفریح کا حیرت فزاں طور	یہ بدعت یہ جفا، یہ ظلم و زور
کیا بے جاں پرندے بے زباں کو	اجاڑا مرغ جاں کے آشیاں کو

افق نے حسن کی نظر جو شعر کئے ہیں انکے لفظیات اور تشبیہات اعلیٰ درجہ کے ہیں جیسے سراپا، لیلہ شیریں دہن، گیسوئے معنبر، لیلۃ القدر (ایسی رات جو ہزار مہینوں سے بہتر ہو، قرآن شریف میں اس بابت کہا گیا ہے) ادا غمزہ، کرشمہ ناز، انداز اور بدن کی تشبیہ طوبیٰ سے۔

ان لفظوں کے ساتھ جن تشبیہات، استعارات کا انتخاب کیا گیا ہے وہ موقع اور محل کے اعتبار سے شاعر کی قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک ایک شعر سے ایجاز واختصار اور طریقہ استعمال ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

ادا غمزہ، کرشمہ ناز و انداز	تھے سب بہر دل و جاں ناوک انداز

یہ انداز بیان نہایت خوبصورت ہے۔

اسی طرح مثنوی کے دوسرے مقامات پر بھی ایسے لفظوں اور تشبیہوں کا انتخاب کیا

گیا ہے جو شاعر کی حسن کاری اور گلریزی کی دلیل ہیں۔ مثنوی مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے المیہ پر جا کر اختتام پذیر ہو جاتی ہے لیکن یہ ان مثنویوں سے بالکل الگ ہے جس میں کہانی کو طول دینے کے لئے فرضی قصہ بیان کئے جاتے ہیں اور شاعر اپنا زور قلم دکھاتا ہے۔

افق کی اس چھوٹی سی مثنوی میں جو بھی مرحلے آئے ہیں ادبی اور فنی اعتبار سے پورے جمال و کمال کے ساتھ موجزن ہیں۔ مثنوی میں کہانی بھی ہے، قصہ پن بھی ہے روزمرہ محاورہ، ایجاز و اختصار سب کچھ ہے یعنی جو بھی دبستان لکھنؤ کی خصوصیت ہیں وہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثنوی کے کچھ اشعار نظر قارئین کئے جاتے ہیں:

ہوئی جب سخت ان باتوں سے ناچار — تو کی عاشق سے یوں عورت نے گفتار
میرا خاوند ہے شدت سے پیاسہ — مجھے لا دیجئے پانی ذرا سا
وہ رشک قیس معراج اس کو سمجھا — سر تسلیم کا تاج اس کو سمجھا
ہوا گویا وہ سن کر حکم محبوب — بہت بہتر، بہت اچھا، بہت خوب
زہے قسمت، زہے تقدیر، یاور — تصدق اس پہ میں اس پر نچھاور
نہ دیکھے خواب میں جو شکل مردم — صدا جس کی ہو مردہ کے لئے قم
لب خاموش جس کا مشتہر ہو — حیا جس کی نظر بند نظر ہو
وہ میٹھے بول بولے سیان اس کی — وہ لب سے قند گھولے سیان اس کی
غرض جب وہ گیا لانے کو پانی — ہوئی نازل بلائے ناگہانی
دیا اس زور سے شوہر نے دھکا — ہوا لقمہ وہ دریائے اٹک کا
نہ ابرا ڈوب کر بہر اجل میں — بنایا قوس رحلت ایک پل میں
بنا جب غرق مایوسی کا لاشہ — وہ عورت اس کا دیکھا کی تماشہ
نظر تھی نقش عاشق کی قدم بوس — پلک ملتی تھی غم سے دست افسوس
لب خاموش پر نوحہ تھا غم کا — جگر میں درد تھا زخم الم کا

محض شک کی بنا پر ایک معصوم کی جان چلی جانے پر وہ پارسا خاتون اس قدر صدمہ میں آ گئی کہ اسے زندگی بے معنیٰ لگنے لگی اور شکی شوہر کو سبق سکھانے کے لئے اس نے بھی اپنی جان دیدینا مناسب سمجھا۔ عشق کے ایسے انجام کو دیکھتے ہوئے اس مثنوی کے آخری حصہ میں

شاعر نے کہا ہے کہ:

عجب اس عشق کا ہے کارخانہ — اجل کا ایک یہ بھی ہے بہانہ
ہزاروں اس نے گھر کھودے اجاڑے — نہیں آتا کسی عاشق کے آڑے
جسے پڑھ کر سنایا منتر اپنا — ہوا اس کا بیاں گونگے کا سپنا
یہ ہے وہ گل ہیں جس میں خار لاکھوں — وہ ہے دل جس میں ہے آزار لاکھوں
مسیحا بن کے بنتا ہے اجل یہ — پئے عاشق ہے اندراین کا پھل یہ
بیابان یہ گلستاں بن کے ہو جائے — ہلاہل آب حیواں بن کے ہو جائے
نہیں اپنا یہ اپنا کر کے ہوتا — ہر اہل عشق کی یہ جان کھوتا
بلائے بد پئے عشاق ہے یہ — جا کاری کے فن میں طاق ہے یہ

مثنوی کے قصہ کے آخر میں کہانی پن کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاعر نے اس طرح کہا ہے:

محبت کا ہوا قائل زمانہ — ہوا سب قیس و لیلہ کا فسانہ
سوا اس حال کے یہ بھی سنا ہے — کہ ان کا مقبرہ اب بن رہا ہے

عام طور پر مثنوی گو شعراء حمد یا نعت لکھنے کے بعد اصل موضوع پر آتے ہیں جبکہ افق پہلے تمہید باندھتے ہیں پھر اصل موضوع پر آتے ہیں تا کہ بیان کی گئی چیز اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔

اپنی ان تینوں بزمیہ مثنویوں میں شاعر نے ایک ہی خیال یا تصور کو تین جگہ الگ الگ انداز میں بیان کیا ہے جبکہ لفظیات اور تلمیحات تقریباً ایک ہیں۔ مگر طریقہ استعمال الگ الگ ہے۔

مثنویاں (منظریہ)

افق لکھنوی نے منظریہ یا بہاریہ مثنویوں میں لفظوں کے ذریعہ جو منظر پیش کئے ہیں وہ محض خوبصورت لفظوں کی وجہ سے نہیں بلکہ طریقہ استعمال کی وجہ سے ہیں۔ اس لئے کہ اصل شاعری میں اہمیت بیان کی ہوتی ہے نہ کہ لفظیات کی۔ دنیا کی عظیم شاعری میں اچھے لفظوں کا

انتخاب اپنی جگہ پر ہے لیکن آفاقیت اور ہمہ گیری بیان پر منحصر ہے۔ شاعر کا تعلق اس دبستان لکھنو سے ہے جہاں اردو شاعری بیان کے اعتبار سے اپنے معراج کمال کو پہونچ چکی تھی۔

افق کی بہاریہ مثنویوں میں ''بسنت اور ہولی کی بہار، برسات کی بہاریں، چاند کی بہار، صبح کی بہار، شام کی بہار، پیری کی بہار، بچپن کی بہار، بہار جوانی، وغیرہ اہم ہیں۔ ان مثنویوں میں منظر نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ لفظوں کی بندش، بیان کی روانی، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے اعتبار سے بھی یہ اہم مثنویاں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ان مثنویوں میں زندگی اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ افق نے فطرت کو انسانی آئینہ میں دیکھا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ فطرت کا حسن انسانی زندگی بھی ہے جو فطرت کا اجزائے ترکیبی میں سب سے اعلیٰ، افضل اور احسن ہے۔ انسان فطرت کو سنوارتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ افق کی بہاریہ مثنویوں میں شعری حسن تشبیہات کے بیان کے ساتھ برقرار ہے۔

افق کی شاعری میں ہندی الفاظ اپنی تمام روایات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ سبھی خوبیاں افق کی مثنویوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اظہار خیال کی مناست سے الفاظ کا خود بخود چلے آنے کی صفت کسی بڑے شاعر کے کلام میں ہی ملتی ہے۔

مثنوی بسنت اور ہولی کی بہار

۵۴ اشعار کے اس مثنوی میں شروعات میں تشبیب کے شعر دیئے گئے ہیں۔ یہ عربی شاعری کی اس روایت کی طرح ہے جس میں عشقیہ مثنویوں کے پہلے تشبیب کے کے اشعار ہوتے ہیں۔ تشبیب کے کچھ اشعار قارئین کے نظر کئے جاتے ہیں:

ہر سو بہار پیش نظر ہے بسنت کی — ساقی کچھ آج تجھ کو خبر ہے بسنت کی
دکھلا دے ماہتاب میں رنگ آفتاب کا — منہ سے لگادے جام بسنتی شراب کا
سد شیو کی بھنگ ہو، مزہ سوم بھول جائے — وہ مے دے جس سے آنکھوں میں سرسوں سی پھول جائے
اچھا ہو جس کا درد شراب طہور سے — نشہ ہرن ہو رنج کا جس کے سرور سے

اپنے ملک کی بسنت کی بہار کا بیان کرتے ہوئے فطرت میں دور دور تک پھیلی ہوئی زردی کی رنگت اور حسین و مہ جبینوں کے جمال اور پہناوے سے یکسانیت دکھاتے ہوئے

شاعر نے اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے جیسے بسنت میں سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے ہوں:

سرسوں جو پھول اٹھی ہے چشم قیاس میں — پھولے پھلے شجر ہیں بسنتی لباس میں
پتے جو زرد زرد ہیں سونے کے پات ہیں — صد برگ سے طلائی کرن پھول مات ہیں
سونے کی بالیاں ہوئی گیہوں کی بالیاں — شاخیں پھلیں بسنت کے دن کی ہیں ڈالیاں
بن ٹھن کے خوب سونے سے پیلے حسیں ہوئے — رخ زرد وصل میں ہوا جب شرمگیں ہوئے
ہے رنگ گندمی صنم مہ جمال کا — فوٹو ہے رخ بسنت کی شب کے ہلال کا
کچھ اور زرد ساریوں سے رنگ روپ ہے — شمس الضحیٰ کی دھوپ حسیں اسکی دھوپ ہے
زرد اوڑھنی سے زرد ہے رنگ آفتاب کا — چھڑکاؤ پھوٹ نکلا ہے جس پر شہاب کا
مستی بھرے دلوں کی امنگیں نہ پوچھئے — کیا منطقیں ہیں کیا ہیں ترنگ نہ پوچھئے
ماتھے پہ حسن خیز ہے جلوہ گلال کا — بندی سے اوج پر ہے ستارہ جمال کا
عکس نقاب زینت رخسار ہو گیا — زیور جو سیم کا تھا طلاکار ہو گیا

اس مثنوی میں فطرت کو اس کے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جو بیحد دلکش ہے اور اس کو پڑھنے سے ایک عجیب سی مسرت دل و دماغ پر طاری ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے جیسے سارا منظر بولنے لگتا ہے۔

بھارت میں بسنت رُت میں فطرت کی جلوہ سامانیاں اور رقص کرتے ہوئے پیلی سرسوں کے کھیت کھلیان، طرح طرح کے پھولوں کی رنگت سے دل کو خوش کر دینے والے باغات، زرد رنگ کے گیندوں اور ببولوں کے پھولوں کی بہار آگ کی لپٹ کے رنگ کے ٹیسو کے پھول، موتیوں کے گچھے جیسے آم کے بور کیسا دلکش منظر پیش کرتے ہیں اس کی تصویر شاعر نے کھینچی ہے۔ اس خوشگوار فضا میں پپیہے، کوئیل اور بھنورے اپنی میٹھی بولیوں سے اور کلولوں سے کس طرح خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ان نظاروں کو دیکھ کر انسان پر کیسی کیفیت اور مستی چھا جاتی ہے اس کا بیان افق کی زبان میں پڑھ کر لطف اندوز ہوں اور دیکھیں کی مناظر قدرت کی تصویر کشی پر انہیں کتنا کمال حاصل ہے، جس کو شاعری کی زبان میں لطافت کہتے ہیں:

سرسوں کے لہلہاتے ہیں کھیت اس بہار میں — نرگس کے پھول پھول اٹھے لالہ زار میں

آواز ہے پپیہوں کی مستی بھری ہوئی — طوطی کے بول سن کے طبیعت ہری ہوئی
کوئیل کے جوڑ کرتے ہیں چہلیں سرور سے — آتے ہیں تان اڑاتے ہوئے دور دور سے
بور آم میں ہے یوں چمن کائنات میں — موتی کے جیسے گھے ہوں زرکار پات میں
بھونروں کی گونج مست ہے ہر کشت زار میں — بنسی بجاتے کرشن ہیں گویا بہار مُس
کیسر قسم کی خوب دل افزا بہار ہے — گیندوں کی ہر چمن میں دوروئے قطار ہے
اک آگ سی لگائی ہے ٹیسو نے پھول کے — کیا زرد زرد پھول کھلے ہیں ببول کے
زردی لئے ہوئے ہے ہر اک شے نگاہ میں — زردی آفتاب کا پرتو ہے ماہ میں

افق کی اس مثنوی میں انسانی جذبات اور کیفیت کا بھی پراُثر بیان ملتا ہے۔ بسنت میں بھارت کے مندروں میں سجی رادھا کرشن کی جھاکیوں کا بیان محاکات اور جزئیات نگاری کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ کرشن اور رادھا کی لیلاؤں کا جو تصور لوگوں کے دل و دماغ میں ہے، اس کا بیان شاعر نے بھکتی کے رس میں ڈوب کر کوثر تسنیم سے دھلی زبان میں اس طرح کیا ہے کہ وجد آفریں کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تصویر کشی کا عالم یہ ہے کہ موونگ کیمرے کی طرح ایک فوٹو فریم کے بعد دوسرا فوٹو فریم آتا ہے اور پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ کچھ اشعار دیکھئے:

ہیں ایشٹ دیوتاؤں کے مندر سجے ہوئے — ہے زرد زرد پھولوں سے کل در سجے ہوئے
تصویر کھینچتی ہے نظر پریم بھاو کی — سنہاسن ایک جس میں ہیں زینت جڑاؤ کی
رادھا کرشن اس پہ ادا سے کھڑے ہوئے — بل پتلے بال ایسے کمر میں پڑے ہوئے
بنسی جڑاؤ سونے کی لب سے ملی ہوئی — دل کی کلی کلی ہے نظر میں کھلی ہوئی
پیتامبر نفیس کمر میں کسا ہوا — خوشبو سے ہار پھول کی مانند بسا ہوا
شانوں پہ بل پڑے ہوئے زلف سیاہ کے — رادھا سے بار بار اشارے نگاہ کے
بانکے مکٹ سے چہرہ کی چھب اور ہو گئی — سرمہ سے مست آنکھ غضب اور ہو گئی
پوشاک چست تنگ بدن پر کسی ہوئی — گیسوئے عنبری کی مہک سے بسی ہوئی
کانوں میں کنڈلوں کی چمک ہے جڑاؤ سے — رادھا لجائی جاتی ہے چنچل سوبھاؤ سے

دل رادھیکا کا بادہ الفت سے چور ہے کہنی سے ٹھیلنے کی ادا کا ظہور ہے
چپکی کھڑی ہے کرشن کے رخ پر نگاہ ہے ہے پہلوئے جگر میں جگہ، دل میں راہ ہے
الفت بھری جو بنسی کی جانب نظر گئی گویا بسنت راگ کی دھن مست کر گئی
دل مسکرائے دیتا ہے لب دیکھ دیکھ کر تارے سے چھٹکے جاتے ہیں چھب دیکھ دیکھ کر

اس مثنوی میں افق نے کچھ نئی تشبیہات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے جو اس کے حسن بیان کو بڑھاتی ہیں اور اسے ایک اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ماہتاب میں رنگ آفتاب، آنکھوں میں سرسوں سی پھول جائے، نشہ ہرن ہو، شراب طہور، مہارانی آدیشکی کی جوٹھی شراب، سرسوں جو پھول اٹھی ہے چشم قیاس میں، کرن پھول مات ہیں، رنگ گندمی ہوا صنم مہ جمال کا، فوٹو ہے رخ بسنت کی، شمس الضحیٰ کی دھوپ، ماتھے پہ حسن خیز ہے جلوہ گلال کا، بندی سے اوج پر ہے ستارہ جمال کا گلبازی حسین ہے، زیور جو سیم کا تھا طلا کار ہو گیا، موتی کے جیسے گچھے ہیں زرکار پات میں، آگ سی لگائی ہے ٹیسو نے پھول کے، زردئ آفتاب کا پرتو ہے ماہ میں، تصویر کھینچتی ہے نظر پریم بھاؤ کی، رادھا لجائی جاتی ہیں چنچل سو بھاؤ سے، تارے سے چھٹکے جاتے ہیں چھب دیکھ دیکھ کر، جیسی تشبیہات اور تلمیحات عام طور پر اردو شاعری میں استعمال نہیں ہوئی ہیں۔

اس مثنوی میں موقع ومحال کے مطابق جزئیات نگاری اور اس میں ہندی الفاظ کی خوبصورت پرصع کاری بھی غور کرنے کے قابل ہے۔ بسنت، سرسوں، سرا آدی شکتی رتو، پات، کرن پھول، ساری، اوڑھنی، چوڑی، امنگ، ترنگ، بندی، گلال، گونج، کیسر کسم، پیتامبر، جھانکی مُکٹ، سنہاسن، آنند، پریم بھاؤ، جڑاؤ، چھبی، کنڈل، لجائی، چنچل سو بھاؤ، کہنی، بنسی، بسنت راگ، دھن، موہنی مورت، جیسے ہندی کے الفاظ اس مہارت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جیسے ان کا کوئی بدل ہی نہ ہو۔ محاروں کا خوبصورت استعمال بیان کو اور دلکش بنا دیتا ہے۔

برسات کی بہاریں

افق کی منظریہ مثنویاں جن میں فطرت کو اس کے مختلف انداز اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے بیحد دلکش ہیں۔ بیان ایسا ہے کہ ایک حیرت انگیز فرحت دل و دماغ پر دستک دینے لگتی ہے۔ ۷۵ اشعار کی مثنوی برسات کی بہاریں ایک ایسی مثنوی ہے جس میں آنکھوں کے سامنے برسات کا پورے سماں آجاتا ہے اور پڑھنے والے کے سامنے برسات کی تصویر سی کھنچ جاتی ہے۔ مثنوی کے کچھ اشعار دیکھئے:

رُت آئی حسن و عشق انگیز، فصل خوشگوار آئی
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

طرب کا دور عہد عیش فرحت کا زمانہ ہے
عجب موسم سہانا ہے عجب موسم سہانا ہے

کبھی اودی گھٹا چھائی، کبھی کالی گھٹا اٹھی
جب اٹھی دل لبھانے والی متوالی گھٹا اٹھی

گہرباری سر عالم پہ کی کالی گھٹاؤں نے
جگہ کالی گھٹا کو سر پہ دی ٹھنڈی ہواؤں نے

ہوا کی ایک ہی جنبش سے پودے لہلہا اٹھے
کلی پھول اٹھی مہکے پھول طائر چہچہا اٹھا

چمک دکھلا کے کوندھا اس طرح خاموش ہوتا ہے
کوئی جھلکی دکھا کر جس طرح روپوش ہوتا ہے

گرج بادل کی تن جان جگر کو پھوڑ دیتی ہے
کڑک بجلی کی زخم دل کو ٹانکے توڑ دیتی ہے

غبار دل زمیں کا دھو گیا بادل کے پانی سے
جڑے سینچی گئیں سبزہ کی آب زندگانی سے

اثر کرتے ہیں سبزہ پر ہوائے سرد کے جھونکے
پئے پرواز پر کھلتے ہیں گویا سبز پریوں کے

جہاں میں شدت بارش کا نو نیزہ چڑھا پانی
بڑھے نالے چڑھے دریا بپا ہر سو ہے طغیانی

ترائی آہوؤں کی ہے ہر اک ایواں کے آنگن میں
برستا ہے چھتوں سے آب رحمت چھن کے مسکن میں

ہری کھیتی ہوئی شاداب کشت زراعت سے
پڑا سوکھے ہوئے دھانوں میں پانی آب رحمت سے

چراگاہوں میں خوش خوش چارپائے چلتے پھرتے ہیں
نظارہ فرحت افزا ہے کلیلیں کرتے پھرتے ہیں

ہے چوتھی کی دلہن کی سی جوانی مرغزاروں پر
فضا گلزار کی قربان ہے ان کی بہاروں پر

ندی نالے پہاڑی بہتے ہیں ہر سمت جل تھل ہے
ہیں جتنے جانوران کیلئے جنگل میں منگل ہے

کلیلیں مچھلیاں کرتی ہیں پانی کی روانی میں
گروہ گوہک اپنے راگ سے ہیں مست پانی میں

برسات کی پھوار پڑنے پر پرندے اور چرندے اپنی خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں اس کا پر کیف بیان افق کی زبان میں دیکھئے:

پپیہے نے کہیں پی پی کہا، کوئل کہیں کوکی — کہیں دھن باندھ دی شمشاد نے قمری نے کوکوکی
کہیں جنگل میں اڑ کر ناچتی کبک دری آئی — یہ گویا قاف سے بزم سلیماں میں پری آئی
کہیں طاؤس کا غل ہے، کہیں جھنکار جھینگر کی — کہیں ہے جانفزائی کوکلا کے دلربا سر کی
چمکتے ہیں نئی سج دھج انوکھی آن سے جگنو — چمکتے ہیں گلوئے یار میں جس شان سے جگنو

***

لہریا ہے زنانے ہند کی صورت چکور اوڑھے — حسینوں کی طرح ہے چنری پچرنگ مور اوڑھے
طیور خوشنوا نخلوں پہ رس لیتے ہیں پھولوں کا — پھلی پھولی ہوئی شاخوں مزہ دیتی ہیں جھولوں کا
جمے جس شاخ پر پھولے شجر کو دیکھ کر پھولے — ہوائے سرد کا جھونکا جو آیا پالنا جھولے

برسات کے موسم کا اثر ساری مخلوق پر کس طرح پڑتا ہے اس کا بیان افق نے اس مثنوی میں کیا ہے۔

برسات کی پھوار پڑنے پر پرندے اور چرندے اپنی خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں اس کا پر کیف بیان کرنے کے بعد افق یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انسان پر قدرت کے نظاروں کا کیا اثر پڑتا ہے اور کس طرح وہ ان نظاروں کو دیکھ کر کیف و مستی میں ڈوب جاتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

کلیجہ ہوگیا ٹھنڈا جہاں ٹھنڈی ہوا کھائی — ہوا کا ہے کو افزونی مستی کی دوا کھائی
چہل سو جھی گلوں سے عین مستی میں چہک اٹھے — رہا قابو نہ دل پر جو کچھ آیا منہ میں بک اٹھے
جو نغمہ منہ سے نکلا جوش مستی سے بھرا نکلا — فسوں خیز آستھائی تھی جنوں خیز انترا نکلا

افق کی جزئیات نگاری اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انہوں نے برسات میں نظر آنے والے کیڑے مکوڑوں کا بھی ذکر اس مثنوی میں کر دیا ہے:

زمیں میں جو چھپے تھے جانور نظروں سے جاڑے میں — تماشائی ہوئے آ کر وہ قدرت کے اکھاڑے میں
کہیں لہرا رہے ہیں سانپ زلفِ یار کی صورت — کہیں ہے دہشت آگیں اژدہے خونخوار کی صورت
ہزاروں رنگ و صورت کے غرض یہ جانور پائے — کروڑوں قسم کے کیڑے جدھر اٹھی نظر پائے

برسات کا اثر ان سادھو سنتوں پر بھی دکھانا نہیں بھولے جو دنیا چھوڑ کر سنیاس لے چکے ہیں اور تپسیہ کرنے کے لئے کٹیاں بنا کر پہاڑوں اور گفاؤں میں چلے گئے ہیں۔ افق کہتے ہیں:

بڑھی تفریح و دلچسپی کٹی میں رہنے والوں کی
کنول دل کا کھلاتی ہے ہوا ٹھنڈی نہالوں کی
خوشی سے دل پہ لیتے ہیں بھری برسات کا پانی
لیا گنگا کو سر پر شو نے جیسے وقت طغیانی
جو دل اوبا کٹی سے باہر آئے دو گھڑی ٹہلے
سماں دیکھا عجب دلچسپ جو دیکھا نہ تھا پہلے
نظر سبزہ پہ ڈالی کی درختوں سے ہری آنکھیں
نظر اگلی ہوئی تبدیل پائی دوسری آنکھیں
پھڑک اٹھے پرندوں چار پاؤں کی کلیلوں سے
تراوٹ دل نے پائی قدرتی نوخیز بیلوں سے
سراہی قدرت اس کی جس پہ دنیا چھوڑ بیٹھے ہیں
لگائی لو پھر اس سے جس سے رشتہ جوڑ بیٹھے ہیں

برسات کی بہار کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے اسلامی روایات کی مدد لیتے ہوئے نہایت خوبصورت انداز میں پر کیف فضا کی تصویر اتاری ہے:

فضا باغوں کے ہاتھوں بک گئی ہے باغ رضواں کی
طبیعت سیر کو للچا رہی ہے حور و غلماں کی
درختوں پر پھٹا پڑتا ہے جوبن سبز پریوں کا
حسینوں کا چھلاوا ہے ہوائے سرد کا جھوکا
نسیم صبح صحن باغ میں دل رات چلتی ہے
پرستاں کی پری ہے چھپ کے نظروں سے ٹہلتی ہے
قدم رکھتی ہوئی سبزہ پہ عشق افزا بہار آئی
رعایت فضل کی لازم تھی سبزہ پر سوار آئی
جوانان چمن نے حسن سبزان جہاں پایا
خضر کا کثرت سبزہ سے گلشن میں مکاں پایا
طیور خوش نوا کی بولتی ہے آج کل طوطی
خوش الحانی میں یکتا لعل ہیں ضرب المثل طوطی
عنادل پر طلسم مستی عشق مجازی ہے
کلی سے ہاتھا پائی ہے گلوں سے بوسہ بازی ہے
صدائے کوکلہ سے لحن داؤدی ہری بولا
ہوئے گل سن وہ بلبل بولیاں جادو بھری بولا
ہوا شمشاد کو سکتہ وہ نغمے قمریاں گائیں
ملہاریں مور نے بلبل نے فصلی ٹھمریاں گائیں
ہزاروں رنگ کے گل تختۂ گلشن میں پھولے ہیں
شگوفے ہیں شگفتہ غنچہ پیراہن میں پھولے ہیں
بسا گلزار خوشبو سے جو پھولے پھول بیلوں کے
ہنڈولہ نخل کی شاخوں پہ جھولے پھول بیلوں کے

برسات کے موسم میں عاشق و معشوق پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا بھی بیان افق کی زبان میں دیکھئے:

جنوں سے اٹھتے ہیں لاکھوں اچھوتے ولولے دل میں | ہزاروں منچلے دل میں مچلتے ہیں نئے ارماں
رولاتی ہے کسی کو ہجر میں بدلی جو چھاتی ہے | کسی پر دیش میں پہونچے ہوئے کی یاد آتی ہے
تصور میں شب وصلت کی باتیں یاد آتی ہیں | دن ارمانوں کے امیدوں کی راتیں یاد آتی ہیں

اسی مثنوی میں افق نے بندرابن کے مندروں میں سجی جھانکیوں کا بیان بھی بہت عقیدت سے کیا ہے۔ بیان میں رہسیا واد کی جھلک ہے جس سے شاعر اپنے روحانی احساسات کو بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ برسات کے موسم میں کرشن رادھا کے بیان میں ایہام گوئی اور حسن تعلیل سے بھی لطف اندوز ہوں:

سماں برسات کا کچھ اور ہی ہے بندرابن میں | ہنڈولے مندروں کے لطف دکھلاتے ہیں ساون میں
ادھر آکاش پر گھن، اس طرف گھنشیام کی مورت | گھٹائیں کالی کالی اس طرف یاں سانولی صورت
ادھر دشمن کسی بچھڑے ہوئے کے جان کی بجلی | ادھر جھونکے میں پیاری رادھیکا کے کان کی بجلی
گھٹاؤں سے ادھر برسات کا پانی چھلکتا ہے | ادھر گھنشیام کی بنسی کی دھن سے رس ٹپکتا ہے
ادھر برسانا پانی جنبش باد بہاری کا | برسنا نور ادھر چہرہ پہ برسانے کی پیاری کا
ہوا سے اس طرف جنباں ہری پتی ہری ڈالی | ادھر ساون کے جھولے پر ہری شری کرشن بن مالی
نہیں شک اسمیں ہے خوش قسمتی انساں کے چولے کی | تصور میں بھی گر دکھلائی دے جھانکی ہنڈولے کی
ہزاروں مندروں میں چھب نرالی شیام کی دیکھی | انہیں میں شکل تلسی داس جی نے رام کی دیکھی
وہی آئے نظر جس بھاؤنا سے جو کوئی دیکھے | کوئی کثرت میں وحدت کوئی وحدت میں دوئی دیکھے

ان اشعار میں شاعر کا تصور اور اور یہ عقیدہ صاف نظر آتا ہے کہ جو ایشور ہے وہی فطرت ہے۔

چاند کی بہار

۶۰ اشعار کی مثنوی چاند کی بہار افق کے نظم اخبار کی جلد نمبر ۴ مؤرخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۸۸ میں شائع ہوئی تھی۔

چاند کی بہار ایک لاجواب مثنوی ہے جس میں شاعر نے اپنی لکھنوی اردو شاعری کی

سرحدیں جہاں تک پہونچی ہیں اور جتنی تشبیہات واستعارات ہوسکتے ہیں ان سب سے چاند کی تشبیہ دیدی ہے۔ایک نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو فطرت کی جو اشیاء انسانی ذہن کو حسن وجمال کے اعتبار سے اپنی طرف کھینچتی ہیں ان سب کو چاند سے تشبیہ دیکر شاعر نے اس طرح جمع کر دیا ہے کہ وہ حیات جاودانی کی حامل ہوگئی ہیں۔ چاند انسانی زندگی سے بہت زیادہ وابستہ ہے اس کی کشش انسان کو اپنی طرف بچپن سے کھینچنا شروع کرتی ہے اور زندگی کی آخری منزل تک کھینچتی رہتی ہے۔انسان کی اسی کشش اور چاند سے لگاؤ کو چاند کی بہار کا عنوان دے کر شاعر نے اردو نظم یا مثنوی میں ایسا شاہکار پیش کر دیا ہے جس کا بدل پیش کرنے سے کم سے کم اردو شاعری قاصر ہے۔

ساقی رخِ مدعا دکھا دے — مکھڑا مجھے چاند سا دکھادے
گھٹ کر مہ آرزو بڑھا ہے — کیوں عید کا چاند ہو رہا ہے
مانند قمر کمال دکھلا — ابرو سے رخِ ہلال دکھلا
لیں گھیر کے تجھ کو سب پیالہ — میخوار نہیں قمر کا ہالہ
صہبا میں قمر کی روشنی ہو — صافی شراب چاندنی ہو
مہتاب منیر جام بن جائے — پیمانہ مہ تمام بن جائے
ہو دور جو آب آتشی کا — ساغر بنے چاند چودھویں کا
گردوں پہ مہ تمام نکلا — حیرت ہے کہ خم سے جام نکلا
بدلا ہے ضیائے مہر نے روپ — کیا لطف ہے چاندنی بنی دھوپ
عالم نے لباس نور پہنا — پہنا سر آسماں نے گہنہ
ٹھنڈا ہوا کبک کا کلیجہ — آرام جگر خدا نے بھیجا
پرزے پرزے کتاں کا دل ہے — معشوق سہا سے متصل ہے

***

اس مثنوی میں شاعر نے فطرت کی ایک شئے کو کتنی ہی بنیادی چیزوں سے تشبیہ دی ہے کچھ مثالیں پیش ہیں:

یہ چاند ہے زیور سر شام
زینت دہِ تخت کشور شام

لیلۂ شب سیاہ کا مجنوں
مشعل کے چراغ دست گردوں

سچ ہو جو خدا کا نور کہئے
حق بولئے برق طور کہئے

رخسارِ گلہ زار ہے یہ
اک لالۂ داغدار ہے یہ

تاباں ہے نجوم آسماں میں
ہے یوسف مصر کارواں میں

روشن ہے اسی سے خانہ شب
فوٹو ہے اسی کا ماہ نخشب

تاج سر چرخ کا نگیں ہے
شاہ خاور کا جانشیں ہے

پر داغ جگر جو ماہ کا ہے
سکہ کسی بادشاہ کا ہے

قرطاس یہ ہے وہ حرف تحریر
وہ جوہر تیغ ہے یہ شمشیر

وہ نقش نگیں ہے یہ نگیں ہے
سرمہ وہ، یہ چشم سرگیں ہے

یہ مہر وہ مہر کی نشانی
پانی کی وہ لہر ہے یہ پانی

طاؤس کا پر یہ داغ ہے وہ
یہ شعلۂ گل چراغ ہے وہ

یہ جامہ وہ چین پیرہن ہے
ماتھا یہ وہ ماتھے کی شکن ہے

اس کو دل داغدار کہئے
اس کو خط روئے یار کہئے

***

اب وصف ہلال یوں رقم ہے
ابروئے خمیدۂ صنم ہے

خم ہو گیا ضعف سے قد پیر
ہے دست ید خدا میں شمشیر

خم بارے ثمر سے شاخ گل ہے
دریائے کمال کا یہ پل ہے

ہے یوسف مصر کا گریباں
رشک سر ناخن حسینہ

ہنسلی ہے گلوئے نازنیں کی
انگلی ہے یہ پنجۂ حسیں کی

زیبِ آغوش آسماں ہے
کاندھے پہ لئے فلک کماں ہے

نعل اسپ فلک یہی ہے
کہتا ہے گماں دھنک یہی ہے

محراب مکان نور کہئے
نقشِ سیمائے حور کہئے

اس مثنوی میں شاعر نے فطرت کی ایک شے کو کتنی ہی بنیادی چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔ صہبا میں قمر کی روشنی ہے، مہتاب منیر جام، پیانہ مہ تمام، ماہ ساغر مل، آب آتشیں، خم سے جام نکلا، بدلا ہے ضیائے مہر نے روپ، عالم نے لباس نور پہنا، گردوں کو بنایا چاند نے ڈھال، دکھلائے عروس شام نے گال، پرزے پرزے کتاں کا دل ہے، معشوق سہا سے متصل ہے (ایک ستارہ جس کو بنات النعش کہا جاتا ہے، ایک بہت چھوٹا تارا جو سپترشی منڈل کے تین تاروں میں سے بیچ کا ہے) چاند سہا سے ملا ہوا ہے، کنول کے پھول کو غش، دو جہاں سے کافور لطف کا نور، بسمل ڈرے مہ کی روشنی سے، ہالہ بنا مہہ کا ساحل آب، منزل پہ رواں مہہ قلم ہے، چاند ہے زیور سر شام، زینت دہے تخت کشور جام، لیلہ شب سیاہ کا مجنوں، مشعل چراغ دست گردوں، خدا کا نور، برق طور، رخسار گلزار، لالۂ داغدار تاباں ہے نجوم آسماں میں، یوسف مصر کارواں میں، فوٹو ہے اسی کا ماہ نخشب، شاہ خاور کا جانشیں، سکہ کسی بادشاہ کا ہے، چشم سرگیں، طاؤس کا پر، ماتھے کی شکن، مہتاب گلو ہے طوق ہالہ، مطلع یہ ہے آفتاب ہے وہ، جام ہے خطے جام ہے وہ، دانا اسے کہئے دام ہے وہ، فانوس وہ، شمع انجمن یہ، یہ صفحہ کا حوض ہے وہ جدول، یہ دیدہ حور وہ ہے کاجل، وہ حلقہ چشم ہے تو یہ دل، وہ پھول یہ زر، وہ کوزہ یہ گل، انگشت نما زوال سے ہے، ابروئے خمیدہ صنم، دست ید خدا میں شمشیر، یوسف مصر کا گریباں ہے، رشک سر ناخن حسینہ، ہنسلی ہے گلوئے نازنیں کی، زیب آغوش آسماں ہے، کاندھے پہ لئے فلک کماں ہے، ماہ مطلب تمام کردے۔ اس طرح شاعر نے فطرت کی ایک شئے کو کتنی ہی دنیاوی چیزوں سے تشبیہ دیکر ایک شاہکار مثنوی پیش کی ہے۔

شام کی بہار

مثنوی شام کی بہار افق کے ناول طلسم سے لی گئی ہے۔ اس مثنوی کے پہلے حصہ میں شام کا منظر واس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ شاعر نے بیان کیا ہے کہ لکھنؤ کی شام کس طرح کی ہوتی ہے۔ خصوصاً شاعر کے زمانہ میں شام کا جو منظر جو سماں ہوا کرتا تھا اس کی مرقع کشی بہت پرکیف انداز میں کی گئی ہے۔ اس وقت کے شام کے لوازمات کے لئے جو اصطلاحی لفظ استعمال ہوا کرتے

تھے ان کو شعری پیکر دیکر شام کی بہار جیسی مثنوی اردو ادب کی نظر کر شاعر نے فطرت کی شاعری کا بہت خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ چند شعر لکھنؤ کی اس شام کی نظر ہیں جو شام اودھ کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ اس شام کے بہت سے منظر تھے۔ جس میں سے کچھ مناظر حسن کل کے اس مثنوی میں بھی دکھائے گئے ہیں۔ مثنوی کے کچھ اشعار پیش ہیں:

ساقی رخ، لالہ فام دکھلا — سرخی سروئے جام دکھلا
ہو دیدۂ رند مست گردوں — پھولے شفق شراب گلگوں
ساغر میں بھرے شراب انگور — پائے قمر آفتاب کا نور

***

پردہ میں عروس شام نکھری — چہرہ پہ جہاں کے زلف بکھری
سرمہ چشم فلک میں پھیلا — آنکھوں میں بسی شبیہ لیلہ
دو وقت بہار مل رہے ہیں — غنچہ تاروں کے کھل رہے ہیں
ہر گھر میں ہوئے چراغ روشن — جگنو نے دکھائے داغ روشن
ٹوٹا زخم جنوں کا ٹانکا — دامن پھٹنے لگا قطا کا
حوضوں پہ کمل کے پھول سمٹے — زنبور سیاہ کمل کے چمٹے
پڑھتے ہیں نماز شام دیندار — روزہ کرتے ہیں لوگ افطار
پھول اٹھے نہال شمع میں پھول — سندھیا میں ہوئے ہنود مشغول
پھولوں سے جدا ہوئے عنادل — ٹھنڈا ہوا کبک باغ کا دل
قمری غم سرو سے ہے بیتاب — سرخاب سے چھوٹتا ہے سرخاب

اس مثنوی میں بھی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور خاص طور سے شام اودھ کا پورا منظر بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی میں استعمال ہوئی کچھ تشبیہات اور استعارات مثلاً مے مہر ہو غرب جام بن جائے، پیانہ چراغ شام بن جائے، پھولِ شفق شراب گلگوں، ساغر میں بھرے شراب انگور، پائے قمر آفتاب کا نور، پردہ میں عروس شام بکھری، چہرہ پہ جہاں کے زلف بکھری، سرمہ چشم فلک میں پھیلا، آنکھوں میں بسی شبیہ لیلا، آنکھیں ہوئی شب پری کی پر نور، جگنو نے

دکھائے داغ روشن، دامن پھٹنے لگا قبا کا، سرمہ سے نگاہ لڑ رہی ہے، دنبال پہ آنکھ پڑ رہی ہے، ٹوٹے پڑتے ہیں لال لب پر، افشاں ماتھوں کو چومتی ہے، روشن کیئے گھر قمر کی ضوء نے، پھول اٹھے نہال شمع میں پھول، ٹھنڈا ہوا کبک باغ کا دل، خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ شام کی بہار جزئیات نگاری کی اچھی مثال ہے جو اودھ کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔

مثنوی ہولی

ہندوستان کے خوشی کے تہوار ہولی کو افق نے بہت اہمیت دی ہے کیونکہ یہ تہوار آپسی محبت، ہمدردی، برابری اور اخوت پر زور دیتا ہے۔ اس مثنوی میں حسن کے ساتھ لطافت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ مثنوی لاہور سے نکلنے والے رسالہ آزاد میں مارچ ۱۹۰۸ء کو شائع ہوئی تھی۔ رنگوں کے تہوار ہولی کا بیان کرتے ہوئے افق کہتے ہیں کہ:

افق سرور دلی آج کا ہے عالمگیر
نصیب عیش کے عشرت کی جاگی ہے تقدیر

ہر اک طرف نظر آتا ہے لطف سیر بہار
گلی گلی سے لجاتا ہے گلشن کشمیر

جدھر نظر اٹھی ہولی کا رنگ آیا نظر
کھنچی ملی سر گردوں بھی فاگ کی تصویر

ہزارے مارتے ہیں باغ میں جو فوارے
بھرے ہیں چرخ پہ پچکاریوں کو ابرِ مطیر

فلک کے منہ پر ملا ہے گلال سورج نے
شفق نہ سمجھیں اسے نوجوان و طفل و پیر

ہے دھوکا لوگوں کو خورشید پر غلط کی ہے مہر
یہ کم کما ہے وہ جس میں بھرا ہوا ہے عبیر

ہولی کے موقعہ پر انسانی رشتے میل ومحبت کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ اس تہوار میں چھوٹے اور بڑوں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ افق کہتے ہیں:

فلک پہ جیسے بغل گیر برج جوزہ ہے
محبتوں سے گلے ملتے ہیں امیر و فقیر

وہ دن ہے آج کہ چھوٹے بڑے برابر ہیں
نہیں ہے شان کی پرواہ کبیر ہے کہ صغیر

عدو کے دل سے بھی دھو دیتے ہیں غبار کو آج
بھگو کے بھیگ کے رنگوں سے کہہ کے سن کے کبیر

نہیں شک اسمیں کہ ہے خوش نصیب ہندو قوم
جواب اس کا نہ اب تک ہوا نہ اس کی نظیر

کچھ اس اصول پر قائم کیا ہے یہ تہوار — کہ بڑھ کے اور نہیں اتفاق کی تدبیر
جو ڈالے رنگ ملے منہ پہ یا عبیر گلال — عداوتیں نہ رہیں سب بہم ہوں شکر و شیر

افق نے زندگی کے تینوں دور بچپن، جوانی اور بڑھاپے کا بیان اپنی مثنویوں میں کیا ہے۔ ان مثنویوں میں زندگی کی سچائی، بیان کی صفائی اور زبان کا لطف غور کرنے کے قابل ہے۔

بہار جوانی

مثنوی بہار جوانی میں افق نے اپنے مخصوص انداز بیاں میں جوانی کے عالم کا نقشہ کھینچا ہے اس مثنوی میں جوانی کی نفسیاتی کیفیات کو ہر زاویہ سے دیکھا گیا ہے اور ایسی حقیقت بیان کی گئی ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ اس مثنوی میں مختلف تلمیحات اور روایات کے ذریعہ شاعر نے اپنی بات کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ خصوصاً ایسی تلمیحات سے جن کا تعلق اسلامی روایات سے ہے مثنوی کے حسب ذیل اشعار خاص طور سے غور کرنے کے قابل ہیں:

کہتا ہوں شباب کی کہانی — لکھتا ہوں بہار نوجوانی
طفلی گذری جو کچھ دنوں میں — پید اہوا جوش کمسنی میں
اے پیر مغان ماہ ثانی — اے یوسف مصر نوجوانی
جوش اپنے شباب کا عیاں کر — رندوں کے نصیب کو جواں کر
دخت مینا شباب پر ہو — ساقی مثل نقاب پر ہو

***

جوانی کی علامت کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

ہمت کی مثال دل بڑھا ہے — نشہ سا ہر اک دم چڑھا ہے
نخلوں کو اکھاڑ دیں ہے یہ زعم — رستم کو پچھاڑ دیں یہ ہے زعم
آنکھوں میں سرور چھا رہا ہے — حسن آنکھ کو دل کو بھا رہا ہے
افسانۂ عشق پڑھ رہے ہیں — نظروں میں بتوں کی چڑھ رہے ہیں
یوسف کی تلاش راہ میں ہے — بتخانۂ چیں، نگاہ میں ہے

کچھ اور پڑا نظر کو چسکا چادر سے بڑھا قدم ہوس کا
مہوش جو میان راہ نکلے بے ساختہ منہ سے آہ نکلے
زلفوں میں نگاہ پھنس کے رہ جائے دل ہاتھ ملے ترس کے رہ جائے
پردے ہیں پڑے ہوئے نظر پر قابو نہیں قلب پر جگر پر

معشوق کی اداؤں کا جادو اس سن میں کیسے سر چڑھ کر بولتا ہے، افق کی زبان میں دیکھئے۔

شمشیر برہنہ ہر نظر ہے ناگن ہے جو کوئی موئے سر ہے
جادو سے نظر نظر بھری ہے جو آنکھ ہے سحر سامری ہے
دیکھیں جسے لوٹ لوٹ ہو جائے دنیا نظروں سے اوٹ ہو جائے
ناوک چاہے نشانہ چوکے دل چھیدے نظر ذرا نہ چوکے
نس نس میں ادا بھری ہوئی ہے بیباک ستم گری ہوئی ہے
خنجر سے نہ ہو جو ڈاب میں کام چتون وہ کرے نقاب میں کام
گھونگھٹ میں بھی وار اسکا چل جائے دیوار کو توڑ کر نکل جائے
پوچھو نہ حسین کیا ہوئے ہیں عاشق کے لئے قضا ہوئے ہیں

جوانی کی نعمتوں کا بیان کرتے ہوئے افق کہتے ہیں:

ہر شخص ہے عاشق جوانی یہ سن ہے بہار زندگانی
دنیا میں نہ گر شباب ہوتا آرام خیال و خواب ہوتا
اپنا نہ ملا نظیر اس کو روتے ہیں گنوا کے پیر اس کو
ہوتے ہیں جو کام زندگی میں کرتے ہیں وہ لوگ بس اسی میں
طفلی تو ہے کھیل کا زمانہ پیری ہے ملال کا نشانہ
عشرت کا اگر ہے کوئی بانی نام اسی کا ہے عالم جوانی
عاقل ہے جو اس کے قدرداں ہیں دشمن ہیں جو اس سے بدگماں ہیں
کر اے افق اس کی قدر دانی نعمت ہے پئے بشر جوانی

پیری کی بہار

مثنوی پیری کی بہار میں افق نے ضعیفی کے عالم کی تصویر کشی نایاب طریقہ سے کی ہے۔سیدھی اور سلیس زبان میں نئی نئی تشبیہات کا استعمال کر کے بیان کو اتنا پر اثر بنایا ہے جسے پڑھ کر ہر شخص کے دل پر ایک چوٹ سی پڑتی ہے۔ بامحاورہ زبان سے بیان میں اثر پیدا کرنا اور بیان کو حقیقت کے بالکل قریب لے آنا افق کی شاعری کی خصوصیت ہے۔مثنوی کی بامحاورہ زبان کا حسن بیان کو اور دلکش بناتا ہے مثنوی کی شروعات تشبیب کے اشعار سے کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اس مثنوی کے کچھ شعر دیئے جاتے ہیں:

اے پیر مغان خضر تمثال	اے ساقی بادہ کہن سال
صہبائے کہن سے بھر کے دے جام	خورشید شراب ہو لب بام
موجوں کا شراب میں نشاں ہو	جھری تنِ پیر کی عیاں ہو
قامت ہو سبو کا کم سراپا	ظاہر قد خم سے ہو بڑھاپا
پرہیز سے واعظ کہنسال	فرمائیں سفید دھوپ میں بال
پیری آئی گئی جوانی	کامل ہوا ماہ زندگانی
آخر ہوا روز آگئی شام	لبریز ہوا حیات کا جام
مستر کھنچا صفحہ بدن پر	ڈھیلا ڈھالا لباس تن پر
ناوک سے بنا کمان ہر قد	گوشہ ہوا گھر کا کنج مرقد
گم ہونے لگے ہواس ہر روز	گھٹنے لگی بھوک پیاس ہر روز
منہ فق ہوا، دانت سارے ٹوٹے	تڑکا جو ہوا، ستارے ٹوٹے
گونگے کا ہوا ہے خواب سپنا	آنکھوں نے گنوایا جوہر اپنا
گذرا جو ہے آج تک زمانہ	آنکھوں میں ہے صورت فسانہ
میٹھی نیندیں اچٹ رہی ہیں	راتیں آنکھوں میں کٹ رہی ہیں

مثنوی کا بیان اتنا فطری ہے کہ پڑھنے والا اپنی آپ بیتی سمجھتا ہے۔

قدرت کا نظر میں ہے تماشہ — ہے ضعف سے حال تولہ ماشہ
آنے کے نہ جانے کے کہیں ہیں — پتھر پڑے سینئے زمیں ہیں
پھرتی نہ ہے جسم میں نہ چستی — ہے بڑھ کے مرض سے تندرستی
چلے کے ہوئے گلابی جاڑے — گرمی نے بدن کے کپڑے پھاڑے
مرنے سے سوا ہوا ہے جینا — دوبھر ہوا پانی ہل کے پینا
اٹھتے ہیں اگر تو آہ کرکے — جگ جیتا اگر جگہ سے سرکے
ہر بات میں ضعف نے ہرایا — ہر وقت ہے آسرا پرایا
ہر عیش و نشاط میں خلل ہے — پیری صد عیب کی مثل ہے
جاتی رہی خون کی حرارت — آنکھوں سے ہوا ہوئی بصارت
ہے زعم نہ کچھ زور و مستی — نظروں سے گئی ادا پرستی
طاقت ہے زباں میں کل بدن کی — ہے عمر دراز ہر سخن کی
غصہ ہے نچوڑ عمر بھر کا — پارا ہے مزاج آگ پر کا
سو طرح کے مخمسوں میں ہے جان — بس موت کا ہے خیال ہر آن
نظروں سے ہے کم امید کی چھاؤں — لٹکائے ہوئے ہیں قبر میں پاؤں
ہر وقت ہیں منتظر سفر کے — شب کو بھی چراغ ہیں سحر کے
آفاق نگاہ سے گرا ہے — دنیا کی طرف سے منہ پھرا ہے

شاعر کا کہنا ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں کم وبیش ایسے ہی حالات آئینگے اس لئے سبھی کو بزرگوں کا احترام کرنا چاہئے اور ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہر شیوہ عالم جوانی — بچوں کی سی بن گئی کہانی
جن سے ہوا ربط عمر بھر میں — پھرتے ہیں خیال میں نظر میں
ہر تجربہ دفن سینہ میں ہے — یہ لعل گراں خزینہ میں ہے
روتے ہیں شباب اپنا کھوکر — پچھتاتے ہیں بچپنے کو روکر
قرآں کے ورق الٹ رہے ہیں — اللہ کا نام رٹ رہے ہیں
ہری نام کو دل پہ چھاتے ہیں — تلسی کے بھجن الاپتے ہیں

ایسے ہوئے نیک و پاک کل سے — گویا کہ فرشتہ تھے ازل سے
جوبن کو حسین رو رہے ہیں — سب دودھ کی مکھی ہو رہے ہیں
کوئی نہیں پوچھتا کہ کیا ہو — کس کھیت کی مولی کیا بلا ہو
گر ربط ہو خواہش و ہوا سے — پھبتی ہو کہ بوڑھے منہ مہانسے
ماں باپ کو گر حق نہ ملے گا — اولاد کو ایک سبق ملے گا
آرام کے بدلے غم ملے گا — پانی بھی نہ مرتے دم ملے گا
تعظیم افق ان کی کر ہمیشہ — پیری کے غضب سے ڈر ہمیشہ

مثنویاں (اخلاقی)

اخلاقی مثنویوں میں جن پر عام طور پر اردو شعراء نے قلم اٹھانے سے گریز کیا ہے، افق نے اپنے خصوصی اندازِ سخن میں ایسے شاہکار پیش کر دیئے ہیں جن کا بدل پیش کرنے سے کم از کم اردو شاعری قاصر ہے۔ افق کی اخلاقی موضوعات پر لکھی مثنویاں جیسے استری دھرم، گرو سیوا، قلم کی تعریف، گئو رکشا، وغیرہ میں شاعر اپنے اظہار مطالب میں بیحد کامیاب ہے۔ شاعر اپنے موضوع کے ہر گوشہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے اور جو بھی دعویٰ پیش کرتا ہے وہ دلیل اور ثبوت کے ساتھ ہے۔ تاریخی حوالوں کی کثرت سے ان مثنویوں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے اور قاری کو ان کے پڑھنے سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

استری دھرم

افق کی شاعری میں عورت کو بہت اونچا مرتبہ دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک زمانہ عورت کے حسن و صورت سے کہیں زیادہ اس کی حسن سیرت کا قائل رہا ہے۔ افق نے ہندوستان کی اس تہذیب میں پرورش پائی جس میں عورت دھن دولت، ثروت و مال اور جاہ و منصب کا آئینہ دار ہے جس میں عورت درگا، پاروتی، سیتا اور ساوتری کا جادوئی روپ ہے، وہ

علم کی دیوی بھی ہے جو آج بھی ہندوستانی تہذیب میں پوجنیہ ہے۔افق کے یہاں عورت مثالیت کا پیکر ہے۔سراپا رحمت ہے،عفت و پارسائی، وفا، ایثار و قربانی اور خود سپردگی اس کا جذبہ اعظم ہے۔عورتوں کی انہیں خصوصیات کی وجہ سے ان کا مرتبہ قابل حمد و ستائش مانا گیا ہے۔

مثنوی استری دھرم عفیف اور شوہر پرست عورت ساوتری کے بیان سے شروع ہوتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کی جان کو موت کے فرشتہ یمراج سے واپس لے آئی تھی:

قلم کو ہے ادب ساوتری کا | بیاں ہے دھرم ہندو استری کا
ہے ہندو استری شوہر کا وام انگ | ہے چوکھا اس کے حسن و عشق کا رنگ
لباس اخلاق ہے، زیور وفا ہے | سنگار اس کا محبت ہے، حیا ہے
سہاگ اس کا ہے شان پارسائی | قضا اس کی ہے شوہر کی جدائی
حبیب بیریا ہے شوہر اس کا | ہے شوہر کی اطاعت جوہر اس کا
ہے زینت گود کی، رونق ہے گھر کی | رفیق زندگی ہے عمر بھر کی

یہ اشعار افق کی مثنوی استری دھرم سے ماخوذ ہیں جس کی شروعات میں قلم کو ادب کرنا لازم قرار دیا گیا ہے کہ ساوتری جیسی ستی کا ادب کرے۔ پھر آگے کی منزل پر چلے۔ یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ مثنوی میں عورت کا ایک اعلیٰ تصور پیش کیا جائے گا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس مثنوی میں افق نے عورت کے ان رویوں کو پیش کیا ہے جو ہندوستانی تہذیب میں مثالی ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان میں عورت کا مطلب ہے عفت، پاک دامنی اور پارسائی، ہندوستان کی عورتیں اپنے خاوند کی زندگی کو اپنی زندگی سے زیادہ اہمیت دینے کو جنون کی حد تک خاوند کی رضا جوئی اور خدمت گذاری کو ہی اپنا مذہب مانتی ہے۔ بیان سادہ لیکن دلکش اثر انداز اور شعریت کے جوہر سے پر ہے۔ ہندو عورت کے بارے میں شاعر کا کہنا ہے:

پئے شوہر انیس خاص ہے یہ | شریک خلوت اخلاص ہے یہ
بٹایا ہاتھ تشویش و الم میں | رہی شامل ہمیشہ درد و غم میں
ہوئی باہر نہ جان و مال تک سے | ہمیشہ تلوے سہلائے پلک سے
ادھر رویا ہوا شوہر کا میلا | ادھر کاجل سیاہ آنکھوں کا پھیلا

دل امڑا اشک آنکھوں میں بھر آئے | برنگ بید اعضا تھر تھرائے
یہی ہے فکر دکھ کیوں کر بٹا لوں | بلا آئی ہوئی کس طرح ٹالوں
اگر لے کوئی بدلے جان کے جان | تو اس کو جان دیدینا ہے آسان

افق نے ہندوستانی خواتین کے اپنے شوہر اور خاندان کے لئے ایثار و قربانی کے جذبہ کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ان کی نفس کشی کے ساتھ زندگی گذارنے اور ہر وقت عبادت میں محورہ کر زندگی بتا دینے کو بڑی ریاضت مانتے تھے اور انہوں ہندوستانی بیوہ عورتوں کے طریقہ زندگی کو بہت ادب واحترام کے ساتھ بیان کیا ہے۔اردو شاعری میں اس طرح کے اظہار جذبات کم ملتے ہیں وہ کہتے ہیں:

جو ہندو استری کا ہو رنڈاپا | بنے تصویر ماتم یہ سراپا
چھڑایا مانگ کا ہاتھوں نے سندور | جبینِ صاف سے بندی ہوئی دور
ہوا مفقود ہر ہفتہ عروسی | دپٹا جافرانی ہے نہ طوسی
ہنسی آئے تو سی لے اپنے لب کو | بٹھا دے ہتھکڑی دست طلب کو
زباں کے ذائقہ پر خاک ڈالے | ملے جو سوکھی روٹی دال کھالے
نہ خالی برت کا دن کوئی چھوڑا | ہر ایک صورت سے رکھا دل پہ کوڑا
فدائے افتخار بیوگی ہے | بس اک پرماتما سے لو لگی ہے
غرض عمر اپنی یونہی کاٹ ڈالی | نہ چولہ جب رہا مٹی بنا لی

افق نے بیواؤں کو سنیاسیوں سے بھی زیادہ عزت کا حقدار مانا ہے،وہ کہتے ہیں:

مشرف بیوگی سنیاس سے ہے | سوا عظمت میں جوگ ابھیاس سے ہے
تپسیا جوگیوں کی دل لگی ہے | بڑا سے بھی بڑا تپ بیوگی ہے
ہے جوگ ابھیاس بالکل اختیاری | رنڈاپا ہے عطائے خاص باری
بڑا سنیاس ہے ترک علائق | برا تپ پاسداری خلائق
ریاضت ہے بڑی دل بس میں کرنا | عبادت ہے بڑی پتے کا مرنا
پرستش ہے بڑی بھگوان کی یاد | تپسیا ہے بڑی تکمیل اوراد

مثنوی میں شاعر نے مذہب عفیفہ یعنی پتی ورت دھرم نبھانے کے لئے انتہائی قربانی

کرنے والی دیویوں جیسے لکشمی، سیتا، پاروتی، گاندھاری اور پدماوتی جیسی خواتین کی قربانی اور جانثاری کے جذبہ کا بیان نہایت ادب اور عقیدہ کے جذبہ کے ساتھ کیا ہے۔

گروسیوا یا خدمت مرشد

افق کی ایک اور بلند پایہ اخلاقی مثنوی گروسیوا یا خدمت مرشد ہے جس کے ۱۶۱ اشعار میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کو سہی معنیٰ میں انسان بنانے کے لئے گرو یا مرشد کی کیا اہمیت ہے۔ افق اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ گرو کے بنا گیان یا علم نہیں مل سکتا، گرو کا درجہ ایشور سے بھی بڑا مانا گیا ہے کیونکہ گرو کی کرپا یا کرم سے علم حاصل کرنے کے بعد ہی بندہ رب کو سمجھ سکتا ہے۔

گرو بمعنیٰ مرشد جو موضوع ہے اس پر عموماً شعراء نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ علم و تصوف جو تقریباً ہندو دھرم اور خاص طور سے بودھ مذہب سے بہت زیادہ متاثر ہے کے جو پیر طریقت ہوتے ہیں ان کا پورے جمال و کمال کے ساتھ اس مثنوی میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ افق کا کلچر اردو تہذیب ہے اس لئے ان کے یہاں گرو یا مرشد کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں انکا تعلق خالص تصوف سے ہے۔ مثلاً سر حقیقت، کشف، طریقت، معرفت، سعادت استقامت اور عقدہ کشاں، ریاضت، قناعت، عزلت نفس وغیرہ۔

اس مثنوی میں افق کہتے ہیں کہ گرو یا مرشد کے راستہ دکھانے سے ہی مرید حق تک پہونچنے کے مختلف مقامات جیسے زہد، ترک دنیا، فقیری، قناعت، توکل، عبادت، محبت، عشق، پرہیز، تجلی، معرفت اور فنا طے کرنے کے بعد بقا کے مقام تک پہنچ کر خدا میں قائم ہوتا ہے۔ مرشد اپنے مرید کو ان مختلف منازل سے روشناس کراتا ہے جو اسے منزل مقصود تک پہونچاتا ہے۔ مرشد کے کرم کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مرشد حقیقت کے راز کھولنے والا، حق تک پہنچانے والا، نیکی کا راستہ بتانے والا اور مرید کا ضمیر روشن کرنے والا ہے۔ مرشد ہی زندگی کا مقصد سمجھانے والا حقیقت کے چھپے ہوئے راز کو سمجھانے والا، کرامت تک پہنچانے والا اور اس پر قائم رہنے کے طریقے بتانے والا ہے۔ وہ کامیابی کے راستہ بتانے والا، علم وفن کی گتھیاں کھولنے والا، ناممکن بات کو ممکن کرا دینے والا، تہذیب اور تمدن سکھانے والا اور سہی چلن کو بتانے

والا ہوتا ہے۔مرشد ہی علم کو عمل میں لانا سکھاتا ہے جس سے دلوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے یعنی وہ دین اور دنیا دونوں کو سنوارنے میں مددگار ہوتا ہے۔ گرو پہنچے ہوئے فقیر ہوتے ہیں جن کو تمام کمالات پر عبور حاصل ہوتا ہے اوران کی دعائیں کبھی خالی نہیں جاتی ہیں۔ افق کہتے ہیں:

گرو ہے واقف سر حقیقت — گرو ہے کاشف کشف طریقت
گرو صحرا نورد معرفت ہے — گرو منزل رسانے عاقبت ہے
گرو ہے طرہ پیرائے ارادت — گرو ہے چہرہ آرائے سعادت
گرو ہے منظر روشن ضمیری — گرو ہے آفتاب صبح پیری
گرو ہے جادہ پیمائے کرامت — گرو ہے رہنمائے استقامت
گرو ہے مکمبر راز نہانی — گرو ہے روشناس رمز دانی
گرو ہے مہر شرق مہربانی — گرو ہے رونمائے کامرانی
گرو عقدہ کشائے علم وفن ہے — گرو سے لطف اعجاز سخن ہے
گرو ہے سحر ساز خرق عادات — گرو ہے کیف بخش ثمرۂ ذات
گرو سے عقدہ اعجاز حل ہے — گرو سے بارآور نخل عمل ہے

سچے گرو کی صفات کا بیان کرتے ہوئے افق کہتے ہیں:

ریاضت مشغلہ ہے رات دن کا — عبادت ہے اساسل البیت سن کا
شکیبائے دل پونجی ہے گھر کی — توکل ہے کمائی عمر بھر کی
قناعت راہ عقبیٰ کا ہے توشہ — ہے کنج عافیت عزلت کا گوشہ
چٹائی پر ہے دل کی بادشاہت — نہ غم سے غم نہ راحت سے ہے راحت

گرو کی ریاضت یا تپسیہ سے ہی ان میں پارس کی تاثیر پیدا ہوتی ہے جو لوہے کو بھی سونا بنا دیتی ہے۔ افق کہتے ہیں:

گرو کی واجب التعظیم ہے ذات — ہے اسکی ساری دنیا سے بڑی بات
گرو سے جھکتے ہیں کشورستاں تک — ملک جاتے ہیں اسکے آستاں تک
گرو کا پاس ہے بھگوان کو بھی — ادب ہے سروشکتی مان کو بھی
گرو کی جس نے دل سے بات مانی — ملی اس کو حیات جاودانی

یہ دنیا کیا کہ عقبیٰ تک بنا لی
اسی چولے میں جیون مکتی پا لی

گرو کی دید میں ہے تین اقسام
ہے جن کا باپ، ماں، ودیا گرو نام

افق تعظیم دو دل سے گرو کو
جگہ دو گوشہ دل میں گفتگو کو

اس موضوع پر شاید ہی کسی شاعر نے قلم اٹھائی ہو۔ ہندو روایتوں کا حوالہ دیتے ہوئے شاعر نے رام، کرشن، اور دھرو کی مثال پیش کی ہیں، جنھوں نے اپنے گرؤں کی ہمیشہ قدر کی اور انکے کرم سے دنیا میں اپنا نام کیا۔ مثنوی میں خواجہ معین الدین چشتی کی رحمتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندی کے لفظوں کی مرصع کاری اس مثنوی کو اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہے۔

قلم کی تعریف

اس مثنوی میں شاعر نے ۳۸ اشعار میں قلم کی اہمت اور عظمت اور اس کے تمام مدارج کو شعری پیکر دیکے امر کر دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ قلم کے دامن سے کتب سماویہ (آسمانی کتابوں) کی حفاظت اور ترویج و اشاعت سے لیکر کسی شاعر یا ادیب کے فن پارے اور شاہکار کو محفوظ کرنے کے لئے بھی قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کا کہنا ہے:

قلم کہتے ہیں جس کو ہے قلم صہبائے مضموں کی
قلم ہے اک قلم شاخ نہال طبع موزوں کی

یہ اظہار مطالب میں زباں کو مات کرتا ہے
فقط سنتی ہیں آنکھیں جب کبھی یہ بات کرتا ہے

دوات اسکی مثال خم ہے یہ خم کا فلاطوں ہے
سیاہی اسکی لیلہ ہے یہ اس لیلا کا مجنوں ہے

ہو سچ اس کو علم گر حضرت عباس کا کہئے
علی کی تیغ کہئے اور موسیٰ کا عصا کہئے

نبی گذرے ہیں جو اسکی انھوں نے دستگیری کی
اسی سے کافر و دیندار نے فرما پذیری کی

قلم کی حضرت عباس کے علم، علی کے تیغ، موسیٰ کے عصا سے تشبیہ دیکر افق یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عزت و توقیر، شرف و کمالات اس کے لئے اپنی نظریں بچھا دیتے ہیں جس کے

ہاتھ میں قلم جیسا گوہر نایاب ہوتا ہے۔ افق کہتے ہیں کہ خدا کی تعریف بھی لوگوں تک قلم کے ذریعہ ہی پہونچی ہے اور مذہب کی مقدس کتابیں بھی انسان تک قلم کے ذریعہ ہی پہونچی ہے۔ افق کا کہنا ہے:

نہ یہ ہوتا تو شہرت فکر صبح کی نہ ہو سکتی　　اشاعت نظم ویدوں، نثر، قرآں کی نہ ہو سکتی

قلم کی طاقت کی وجہ سے ہی چین کے مشہور مصور مانی کے نگار خانہ کو شہرت ملی اور دنیا میں مانی اور بہزاد کو دوامی زندگی ملی۔ فارسی زبان کے شاعروں کی بے مثال شاعری کے احترام میں وہ کہتے ہیں:

کیا مشہور خلق ارزنگ سے استاد کو اس نے　　دوامی زندگی دی مانی و بہزاد کو اس نے
صفت اس کی اگر جانے تو نظم انوری جانے　　ظہوری جانے سعدی یا غنی یا عنصری جانے

قلم کی طاقت اور مرتبہ کا بیان کرتے ہوئے افق اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیتے ہیں:

جسے اللہ زندان عدم میں قید کرتا ہے　　اسے یہ تذکروں میں زندہ جاوید کرتا ہے
ہیں لاکھوں تیغ شمشیر و علم کے چھیننے والے　　نہیں پیدا کئے حق نے قلم کے چھیننے والے
اسی نے کی اشاعت عالموں کی خوش بیانی کی　　اسی نے بہر تحریک ہنود ریشہ دوانی کی
ہر اک دم دستگیری ناصر موجز رقم یہ ہے　　ہے قابل چومنے کے ہاتھ وہ جسمیں قلم یہ ہے
افق بھی شاگرد امداد ہے آٹھوں پہر اس کا　　رہے گا تا ابد احسان حسن نظم پر اس کا

اس موضوع پر ایسی پر اثر مثنوی اردو شاعری میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

افق نے کچھ مذہبی مثنویاں بھی لکھی ہیں جو نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ مذہبی مثنویوں میں صرف 'راماین یک قافیہ، کا ذکر کرنا ہی کافی ہے جس میں رام چرتر مانس جو شری رام چندر جی کی حیات ہے، کو ایک ہی قافیہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں ایک ہی قافیہ میں تیرہ سو اشعار لکھے گئے ہیں اور جو فنی اعتبار سے افق کا ایک شاہکار ہے۔ چھوٹی مذہبی مثنویوں میں اوتار مورتی پوجن، تیرتھ یاترا وغیرہ اہم ہیں۔

اوتار

افق کی مثنوی اوتار میں ہندو مذہب میں اوتار کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر شاید کسی اور شاعر نے خامہ فرسائی نہیں کی ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے شاعر نے ہندو مذہب کی روایات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کی ان روایات کو بھی بیان کیا ہے جن سے فلسفہ اوتار کا تصور ابھرتا ہے۔ شاعر کا مطالعہ وسیع ہونے کی وجہ سے ایسی تلمیحات ولفظیات کا استعمال کیا گیا ہے جس سے ایک خوبصورت اور دلکش شاعری وجود میں آ گئی ہے۔ شاعر نے مثنوی کی شروعات مرأت، نور، شبیہ جیسے لفظوں سے کی ہے، جو مالک حقیقی کے تصور کو سمجھنے اور سمجھانے میں مددگار ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں:

جو مرأت تصور میں ہے اوتار   قلم کرتا ہے جھک جھک کر نمسکار
گھر اوتاروں کا ہے ہندو کے دل میں   شبیہ نور ہے آنکھوں کے تل میں
اٹھاتے ہیں فلک جب دست سر پر   اثر کرتے ہیں جب بدعت بشر پر
زمیں دبتی ہو جب بار گناہ سے   جب اوجھل ہو کبھی نیکی نگاہ سے
تب ایشور دہر میں لیتے ہیں اوتار   نراکار آپ ہو جاتا ہے ساکار

گیتا کے ایک اشلوک میں بھی کرشن ارجن سے کہتے ہیں "جب جب دھرم کی ہانی ہوتی ہے اور ادھرم بڑھتا ہے تب تب ہی میں اپنے کو رچ دیتا ہوں یعنی ساکار روپ میں لوگوں کے سامنے پرکٹ ہو جاتا ہوں۔" افق کی فطرت میں یہ بات شامل کہ جس موضوع کو ہاتھ میں لیتے ہیں اسے سمجھانے کے لئے پہلے دعویٰ پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد دلیل دیتے ہیں۔ اس مثنوی میں اوتار کے متعلق دعویٰ پیش کرنے کے بعد وحدت الوجود کے فلسفہ (جس کے مطابق دنیا میں خدا کے سوا اور کچھ نہیں ہے) کے حوالہ سے افق اپنی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

جو اک شے کے دکھائے مختلف رنگ   خرد ہو جس کی قدرت دیکھ کے دنگ
تعجب کیا جو وہ ساکار ہو جائے   بنا کر کوئی شکل اوتار ہو جائے

ہے جب وہ ذرہ ذرہ میں نمودار — جب اسکا ہے ہر اک صورت میں اظہار
وہ جب بن کر گوہر میں آبرو ہے — ستاروں میں ضیا ہے، گل میں بو ہے
اسے لینا کسی قالب میں اوتار — ہے مشکل بات کیا، کیا امر دشوار
تری ہو یا سمندر یا ہو تالاب — ہے سب میں رونما مہر جہاں تاب
ہیں بالکل یوں ہی پرمیشور بھی مختار — کہ جس قالب میں چاہے ہو نمودار

دنیا کے تمام مذاہب خدا کو مظہر کائنات میں تلاش کرنے کی دعوت دیتے ہیں اسی کے حوالہ سے افق نے فلسفہ اوتار کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

نہیں ہندو دھرم ہے شاہد حال — مذاہب اور بھی کرتے ہیں اقبال
محمد جو عرب میں پیشوا تھے — بشر کی شکل میں نور خدا تھے
مسیح خوش بیاں گوہر فشاں ہیں — محمد کی صفت میں تر زباں ہیں
امیر المومنین، عکس خدا ہیں — شہنشاہ جو ہیں ظل کبریا ہیں
مسیح جو ہیں اپنے دیں کے پابند — خدا کا کہتے ہیں عیسیٰ کو فرزند
بشر میں ہیں خدائے پاک کا نور — ہے ان کے بھی تمام افکار مشہور
کھلے ہیں جنم ساکھی سے یہ اسرار — گرونانک بھی تھے ایشور کے اوتار

افق کا یقیناً یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جو انھوں نے کئی مذاہب کے فلسفوں کو ایک جگہ جمع کر کے فلسفہ اوتار کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت شاعری بھی پیش کر دی ہے۔ افق کے انداز نگارش میں ایک خصوصیت یہ بھی شامل ہے کہ جب کسی موضوع کو بیان کرتے ہیں اس کے ایک ایک جز کو اس طرح صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں کہ موضوع کی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی کیفیت پورے طریقہ سے واضح ہو جاتی ہے۔ مثنوی کے کچھ اور شعر قارئین کی نظر کئے جاتے ہیں:

مسلم ماہیت اوتار کی ہے — مجسم شکل یہ ساکار کی ہے
شہادت پردہ اسرار کی ہے — مسلم اصلیت اوتار کی ہے

جو شے روز ازل سے بے نشاں ہے | لقب یا نام تک اس کا کہاں ہے
نہ آتا گر زمانے میں نراکار | نہ آتا کہنے یا سننے میں اوتار
پرستش کر افق تو ان کی دائم | کہ ان کے ذات سے دنیا ہے قائم

اگر الفاظ کے اعتبار سے بات کی جائے تو افق کے یہاں لفظ روایت اور تہذیب کے اعتبار سے آتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے اس لئے کہ روایت لفظ رکھتی ہے اور لفظ روایت رکھتے ہیں۔ دونوں کو الگ کر دینے سے معنیٰ گم ہو جاتے ہیں۔ افق نے اپنے شاعری میں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔

مورتی پوجن

انسانی ذہن خدا کے تصور کو کوئی شکل یا صورت دینے میں اس لئے قاصر ہے کہ اس نے خدا کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ اسی لئے مختلف مذاہب اور مختلف مکتب فکر کے لوگ اپنے طریقہ اور جذبات، احساسات کے مطابق اس کے تصوراتی علامات بنا لیتے ہیں۔ دنیا کے بڑے مذاہب کے ماننے والے لوگ کسی نہ کسی شکل میں علامت کی پوجا ضرور کرتے ہیں۔ اسی تصور کو افق لکھنوی نے اپنے مثنوی مورتی پوجن میں بیان کیا ہے۔

سب سے پہلے لفظوں کی صورت کے بارے میں افق نے جو تصور پیش کیا ہے وہ بہت فلسفیانہ اور دل کے چھونے والا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ جب تحریر بن جاتے ہیں تب وہ علامت بن جاتے ہیں اور پوجنیہ بن جاتے ہیں یعنیٰ لفظ کا کسی شکل میں ڈھلنا ایک پرکار سے مورتی پوجن ہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جو دل میں گھر بناتے ہیں نراکار | نظر میں پھر رہا ہے روپ ساکار
جو لا محدود ہے محدود ہو جائے | جو غائب ہے ابھی موجود ہو جائے
اسی طاقت نے کھولے ہیں چھپے راز | سرے کاغذ بنائی شکل آواز
کوئی صورت نہ جس آواز کی ہو | وہ قائل کیوں نہ اس اعجاز کی ہو

جہاں میں حرف ہیں جس جس زباں کے	ہیں شاہد پڑھ کے دیکھو اس بیاں کے
ہوئی صورت گری کی جب ضرورت	بنی آواز کی حرفوں میں مورت
جو تحریری کتابیں پڑھ رہے ہیں	وہ بے صورت کی صورت گڑھ رہے ہیں
اگر آواز کی صورت نہ ہوتی	تو پڑھنے کی کوئی صورت نہ ہوتی
نہیں نکتہ کی کوئی شکل و صورت	مگر صورت گری کی تھی ضرورت
لکھا جب نام جگدیشور کا ہم نے	بنا دی حرف کی مورت قلم نے
نہین جس کا اجل سے کوئی آکار	بنایا شبد روپی اس کو ساکار
مخالف جان کر بھی بے ضرورت	بناتے کیوں ہیں لکھ کر نام صورت
الف یہ شین رے مورت نہیں کیا	یہ پرمیشور کی اک صورت نہیں کیا
جو دل میں فرض کی جاتی ہے صورت	اسی کی نقل بن جاتی ہے مورت

ان اشعار کے بعد شاعر نے مورتی پوجن کے بارے میں جو دلائل پیش کئے ہیں وہ عقلی اور اثباتی ہیں جن کا تعلق انسانی عقل، ذہن اور روزمرہ کی چیزوں سے ہے۔ شاعر کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کو ماورائی (جو چیز نہیں دیکھی ہو) چیزوں سے سمجھایا نہیں جاسکتا کیونکہ خدا کا تصور اپنے آپ میں ماورائی شے ہے جس کی خبر دنیا میں پیر پیغمبر اور دوسرے بانیان مذاہب نے دی ہے۔ جس کو ہندی لفظیات میں نراکار کہا جاتا ہے۔ افق نے اپنی اس مثنوی میں مورتی پوجن کے استباحت میں جو اشعار قارئین کی نظر کئے ہیں وہ شعری حسن اور خوبصورت الفاظ سے مزین ہے جس میں موقع و محل کے اعتبار سے الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

ہندی کے مشہور کوی سورداس نے بھی کہا ہے:

روپ ریکھ گن گیان جگت بن نرالمت من چکت دھاوے
سب وِدِھی اگو وِچار ہیں تاتے سور سگن لیلا پد گاوے

افق اس مثنوی میں آگے کہتے ہیں:

عوام اس مورتی کو مانتے ہیں	ہم اس صورت کو ایشور جانتے ہیں
یہ مورت خاص نرگن بل یقیں ہے	یہ روپ ایشور کا ہے پتھر نہیں ہے

اگر بھگوان کی مورت نہ ہوتی　　پرستش کی کوئی صورت نہ ہوتی
کلام حق اگر زیب قلم ہو　　تو اس پر فرقہ شاہنشاہ ختم ہو
ہے اس پر سکہ ظل الٰہی　　ہے جس پر ضرب عہد بادشاہی
نہیں کچھ مورتی پوجن نیا کام　　ہیں درجن اس کیلئے ویدوں میں احکام
ہزاروں اور ہیں ایسی مثالیں　　جو ہوں ظاہر کتب گر دیکھیں بھالیں
افق بس کیوں زیادہ موشگافی　　اشارہ عاقلوں کو بس ہے کافی

اس مثنوی کا لب لباب یہ ہے کہ ایک بڑی طاقت کی پوجا یا عبادت کسی بھی شکل یا صورت میں کی جائے وہ عبادت ہے۔ اس مثنوی میں دعویٰ اور دلیل پیش کرتے ہوئے افق نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا بنانے والے کا کوئی نہ کوئی تصور انسان کے سامنے ضرور ہوتا ہے۔

تیرتھ یاترا

افق نے اپنی مثنوی تیرتھ یاترا کے ذریعہ تیرتھ یاترا کی اہمیت اور مقامات مقدسہ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ تیرتھ یاترا ہر مذہب میں ضروری مانی گئی ہے جس کے ذریعہ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ مذہبی مقامات انسانی ذہن اور دل کی آسودگی کے لئے ضروری ہیں۔ شاید یہ ممکن نہیں ہے کہ انسانی زندگی بغیر ان مقامات پر جائے، مکمل اور کامل ہو سکے۔ انسان کا دل و دماغ ان مقامات پر سکون پاتا ہے اور اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہاں جانے سے آرزو پوری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں انسان دیوانہ وار ان مقامات پر سر جھکانے آتے رہتے ہیں۔ ان مقامات پر بہترین قدرتی مناظر اور انسان کی حیرت انگیز حسن کاری بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صحت کے اعتبار سے بھی مقدس مقامات پر جانا مفید ہوتا ہے۔ افق کہتے ہیں:

جو تیرتھ یاترا کا نیک پھل ہے　　رواں کاغذ پہ خامہ سر کے بل ہے
ہیں تیرتھ ہندوؤں کی سجدہ گاہیں　　یہی ہیں سورگ میں جانے کی راہیں

نجات ان تیرتھوں میں بالیقیں ہے
کوئی بھی یاترا نش پھل نہیں ہے

مذاہب یاترا کے سب ہیں پیرو
کوئی جاتا ہے کعبہ کو دعا گو

کوئی راہی ہے مکہ کی طرف کو
مدینہ کو کوئی، کوئی نجف کو

ہزاروں دنیاوی دینی فوائد
میسر ان سے ہیں حسب عقائد

ضروری ہے ہر اک تیرتھ ہر ایک دھام
مقدس ایک سے ہے ایک کا نام

کہیں پرکاش ہے نور اجل کا
کہیں چرنوں کا دھوون بھر کے چھلکا

کوئی پرماتما کی جلوہ گاہ ہے
کوئی اظہار قدرت کی جگہ ہے

افق نے اس مثنوی میں ہندوؤں کے مقدس تیرتھوں جیسے بدری ناتھ، کیدار ناتھ، پشکر، جگن ناتھ پوری، کاشی، ایودھیا، تروینی، ورنداون، پنڈاری وغیرہ کی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ کونارک اور دکن بھارت کے مندروں کا بھی دلکش بیان کیا ہے، مثنوی کے کچھ اشعار دیکھئے:

پوری میں جب گئے آنند کے ساتھ
ملے مندر میں پروشوتم جگن ناتھ

عمارت کی جو خوبی پر نظر کی
پھڑک اٹھی طبیعت ہر بشر کی

نفاست اس کی ہے فرد زمانہ
ہے لاگت اس کی جمشیدی خزانہ

یہاں کا رتھ عجیب و بے بدل ہے
تعجب خیز ہے ضرب المثل ہے

کونارک گاؤں میں سورج کا مندر
نمائش گاہ صنعت ہے زمیں پر

وہ تصویریں خودی ہیں خوب وخوش رنگ
کہ ہے تصویر حیرت جن سے ارجنگ

تراشے ہیں کچھ ایسے بیل بوٹے
ہر اک نقاش چیں کے جی ہیں چھوٹے

خرد حیرت میں ہے کاریگری سے
سوا صنعت ہے سحر سامری سے

الورا میں کہیں پہونچے پئے سیر
کہیں دیکھے دکن کے خوشنما دہر

افق تیرتھ مقدس ہیں ہمارے
ہیں ان کے یاتری ایشور کے پیارے

مثنویاں (رزمیہ)

سوانح عمری گرو گووند سنگھ

گرو گووند سنگھ ۱۶۷۵ء-۱۷۰۸ء) سکھوں کے دسویں گرو تھے جن کا سکھوں کے مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ہی نہایت بہادر، دلیر، جنگجو حکمراں کے طور پر ہندوستان کی تاریخ میں اپنا ایک اہم مقام ہے۔قوم کی قابل ستائش شیرازہ بندی کرنے اور مذہب کی حفاظت کے لئے حتیٰ الامکان ایثار و قربانی کرنے کی وجہ سے وہ عقیدت کے محور رہے ہیں۔ جس وقت گرو گووند سنگھ گدی نشین ہوئے ہندوستان میں مغل بادشاہ اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ وہ اپنے ناموس قومی و مذہبی اقدار کے تحفظ کیلئے پوری زندگی برسرپیکار رہے۔ بہادر اور جانباز گرو گووند سنگھ ایک باکمال سخن طراز اور سخنداں بھی تھے۔انہوں نے دیو کتھاؤں کا بیان بیحد دلکش اور پر اثر انداز میں کیا ہے۔ ان کی ایک مشہور تصنیف گووند رامائن ہے جو برج بھاشا میں ہے اور اعلیٰ شاعری کی مثال پیش کرتی ہے۔انہیں قابل حمد و ستائش شخصیت کے مالک گرو گووند سنگھ کی سوانح عمری افق لکھنوی نے مثنوی کی صنف میں نظم کی ہے۔اردو شاعری میں مرثیہ تو بہت لکھے گئے ہیں لیکن سوانحی نظمیں کم ہیں جن میں شاعر کے جذبات موجزن ہوں اور جن میں ان کی عقیدت بھی شامل ہو۔گرو گووند سنگھ کی سوانح عمری افق کی ایک پرزور اور پر اثر رزمیہ مثنوی ہے جو فنی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ مثنوی کی شروعات حمد سے ہے جس میں ۱۴۱ شعر ہیں۔ان اشعار میں مختلف تاریخی روایتوں کی طرف اشارہ ہے جہاں باران رحمت جوش میں آئی اور جہاں مصیبت یا پریشانی میں پھنسے عقیدتمند انسان کی مدد ہوئی۔ عام طور سے مذاہب عالم میں دعا کرنے کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ مالک حقیقی کے ان احسانات کا ذکر کیا جائے جو مختلف اوقات اور جگہوں پر ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ افق لکھنوی نے بھی مثنوی گرو گووند سنگھ میں جو اشعار حمد یا پرارتھنا کے لئے لکھے ہیں وہ بھی اسی طرز کے مظہر ہیں۔اردو کی دیگر مثنویوں میں بھی حمد کے اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں یہ طرز نہیں اپنایا گیا ہے۔ان میں صرف خدا سے دعا کی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں اسلامی اور دیگر روایات کو ہی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

ترحم سے اسے فرما دیا کند نہ رحمت سے اسے ہونے دیا تند

اس مثنوی میں پہلے پرارتھنا کے اشعار ہیں پھر مختصر طور پر سکھوں کے گرو مہاراجوں کی عظمت اور ملک کے لئے ان کے ایثار و قربانی کے جذبہ کا بیان ہے۔ اسی ترتیب میں سکھوں کے دسویں گرو گووند سنگھ جی کی سوانح قلمبند کی گئی ہے۔ مثنوی کے شروعاتی اشعار اس طرح ہیں:

قلم کر استتی پرماتما کی صفت لکھ خالق ارض و سماں کی
کیا ظلمت کو آخر نور جس نے بنایا ابر سے کافور جس نے
مٹایا شب کو اندھیارا سحر سے نصیب شام چمکایا قمر سے
سواد دل کو نورانی عطا کی سیاہی کھوئی بجلی سے گھٹا کی
جہاں تاریکی چشم خواب کو دی تجلی، کرمک شب تاب کو دی
اسی کے فیض چشم مکرمت سے تھا ہندوستاں مشرف شش جہت سے
چراغ علم و فن کی روشنی تھی تھی دن کو دھوپ شب کو چاندنی تھی
ہزاروں سال تک چمکا ستارہ تھا شوق علم مہر عالم آرا
سیاہی لکھتی تھی روشنی مضامیں قلم کے تھے مطالب نور آگیں

۱۴۶۹ء سے ۱۷۰۸ء تک سکھوں کے دس گرو ہوئے۔ پہلے گرو گرونانک دیو تھے۔ ان گرو مہاراجوں کی عظمت کا مختصر تذکرہ افق نے مثنوی کے ان اشعار میں کیا ہے:

قلم ہے مائل موجز بیانی سخن ہے سحر آرائے معانی
کئے اپدیش جو اول گرو نے وہ ہیں فضل و لیاقت کے نمونے
تھا گدی کو شرف ہر ایک گرو سے تھے سب ثابت قدم بڑھ کر دھرو سے
ہر ایک تھا حب قومی پر نچھاور نہ جھکتا تھا دلاور سے دلاور
کسی کو تھی نہ پرواہ مال و جاں کی اگر تھی تو فقط ہندوستاں کی
کسی نے جان دیدی رن میں لڑ کے کسی نے گل کئے شعلے جو بھڑکے
غرض ہر ایک صدقہ ملک پر تھا رفاہ قوم منظور نظر تھا
جب آئے جب کسی آندھی کے جھونکے نکالے راستے بہبودیوں کے
بھنویں ہر وقت خنجر کی تنی تھی کمانیں مائل صف افگنی تھی

ہے لکھنا تذکرہ صرف ایک گرو کا | تھا دریا موجزن جس کے لہو کا
ذرا منہ پہلے امرت جل سے دھولوں | تو پھر اس کے مقدس نام کو لوں
گرو گووند سنگھ اعزاز پنجاب | شرف ہندوستاں کے ناز پنجاب
ادھر غفلت بہت پنجاب میں تھی | تھے سب خوابیدہ خلقت خواب میں تھی
گرو گوبند سنگھ اس وقت جاگے | یہ دریا تھے ہوئے سوتوں سے آگے
گرو کا دھیان تھا ہو ہار یا جیت | نہیں ہوتی کبھی بیاہو کے پریت

مثنوی گرو گووند سنگھ سوانحی ہے۔ سوانح میں دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ بے کم وبیش بیان کی گئی ہو اور دوسرا یہ کہ اس میں مبالغہ سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اگر کسی سوانح میں مبالغہ آرائی ہو تو وہ سوانح نہیں ہوگی۔ رزم گرو گووند سنگھ کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس کا رزم المیہ پر ختم ہوتا ہے۔ مثنوی میں گرو گووند سنگھ کی زندگی کے مختلف حالات کو عنوان بند طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ جیسے پہلا عنوان ہے گرو گووند سنگھ کی پیدائش اور بچپن کا زمانہ۔ اس عنوان کے تحت پہلے اس وقت کے زمانہ کے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے اس کے بعد گرو گووند سنگھ کی پیدائش اور ان کے بچپن کو شعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ اس کے بعد گرو تیغ بہادر جی کی وفات کے متعلق واقعات، گرو گووند سنگھ جی کی مصلحت اندیشی اور گوشہ نشینی، گرو گووند سنگھ جی کی گوشہ عافیت کے باہر جلوہ افروزی، گرو گووند سنگھ جی کی مصلحت وقت کے موافق اظہار طاقت، گرو گووند سنگھ اور پہاڑی راجے، کمک کے طالب راجاؤں کی امداد، مہارانی شکتی سے طلب امداد و خواہش و مراد، خالصہ دھرم کی تقویت، گرو گووند سنگھ جی کے تعلقات دنیاوی، پہاڑی راجاؤں سے مقابلے، گرو صاحب اور اورنگ زیب، گرو گووند سنگھ جی کے دو خرد سال بچوں کے ساتھ ظالمانہ بے رحمی، ان کا استقلال اور حد درجے کے درد کا نظارہ۔ ان سبھی واقعات کو نہایت پر اثر انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ ان عنوانات کے تحت گرو گووند سنگھ کی پوری زندگی کو مثنوی کے اشعار میں بیان کیا گیا ہے جو مختلف استعارات اور تشبیہات سے پُر ہے۔ اس سوانحی مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایسے بیانات سے اعتراض کیا گیا ہے جو تصوراتی اور مبالغہ آرائی کے حامل ہوں اس لئے کہ ایسے بیانات سے سوانحی فن مجروح ہوتا ہے۔ جدید تنقید میں خود نوشت (آتم کتھا) یا سوانح کے لئے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ زندگی کے سارے پہلو

بے کم و کاشت بیان کر دیئے جائیں۔ اس مثنوی میں جو شاعرانہ انداز بیان اپنایا گیا ہے وہ نہایت اچھوتا اور بیانیہ سے پر ہے۔ گرو صاحب کی زندگی کے کہانی پن کا احساس برقرار بنا رہتا ہے۔ شاعر کا یہ بھی کمال ہے کہ اس نے سوانح کو زندگی کے تسلسل کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کے سامنے زندگی کا نقشہ سا کھینچ جائے۔

اردو کی زیادہ تر مثنویاں تصورات اور مبالغہ آرائی سے بھری پڑی ہیں۔ اس تناظر میں اگر مثنوی گرو گووند سنگھ کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مثنوی تمام لوازمات سے پر ہونے کے ساتھ ساتھ مبالغہ سے بالکل خالی ہے۔ شاعر نے اس میں یہ کوشش کی ہے جو لفظیات استعمال ہوں وہ عام فہم اور خوبصورت ہوں۔ بیان اتنا دلکش ہے کہ اس میں لفظ نگینوں کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو اپنی جگہ پر اپنی چمک دمک سے ایسی حسن کاری کرتے ہیں کہ دل و دماغ سحر زدہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر گرو گووند سنگھ کے دو بچوں کو اسلام مذہب قبول کرانے کے لئے زور دیئے جانے پر قاتلوں کے بچوں کو ڈرانے دھمکانے اور دونوں چھوٹے بچوں کے دیئے گئے جواب کو اس طرح قلمبند کیا گیا ہے:

مناسب ہے کہ پی لو جام اسلام	دم انکار ہوگی سر پہ سمسان
جدا گردن سے دھڑ ہوگا زمیں پر	پھڑکتی ہوں گی دو لاشیں زمیں پر
یہ دونوں سیدھے سادہ بھولے بھالے	ذرا ڈرتے مگر جیوٹ سے بولے
نہیں آگاہ کچھ اسلام ہے کیا	لقب کس کا یہ ہے یہ نام ہے کیا
مقدس باپ کے بیٹوں میں بیٹے	فقط اب ہم ہی دو باقی ہیں بیٹے
کئی دن تک رہیں ایسی ہی باتیں	مسلماں دونوں ہوں بس تھی یہ گھاتیں
طمع دولت کی بھی دی مال کی بھی	عروج اختر اقبال کی بھی
جواب ان کا تھا دنیا ہے یہ فانی	پیام موت ہے یہ زندگانی
پئے موت آج کیا ہے اور کل کیا	ہے مرنا ہی تو پھر خوف اجل کیا
ہے موت اچھی ہمیں اس زندگی سے	رہے زندہ تو کیا شرمندگی سے
بنا کر دل کو شیر نر انہوں نے	کلیجہ کو کیا پتھر انہوں نے
پہاڑ اپنی جگہ سے چاہے ٹل جائے	سمندر چاہے چنگاری سے جل جائے

ادھر کی چاہے دنیا ہو ادھر کی	جگہ خورشید لے چاہے قمر کی
ادھر جلاد ادھر دو سر بکف ہیں	ادھر تلواریں دوسرا اس طرف ہیں
گلا تیغ سے لڑ سکتا نہیں ہے	جگر خنجر پکڑ سکتا نہیں ہے
تحمل کیا ہے بسم اللہ کہہ دو	اڑا دے تیغ جب سر واہ کہہ دو
کہیں غم خوں ہو گارا، ہڈیاں اینٹ	لہو کی نظر ہے اک اک بھی چھینٹ
جو تم چاہو وہ کر لو بات ہے کون	تمہارا ہاتھ پکڑے ذات ہے کون
مگر جس وقت لوگے نام اسلام	تو سچے بادشاہ کا لیں گے ہم نام
گرو کی فتح کا آوازہ ہوگا	نہیں غم کچھ جو کچھ خمیازہ ہوگا
ہوا سوبہ منغض گفتگو سے	زیادہ سرخ کی آنکھیں لہو سے
یہ باتیں منہ سے کم عمروں کی سن کے	نکالا بغض دیواروں میں چن کے

مذکورہ بالا اشعار میں سوانح کے بیان کرنے میں تاریخ، تلمیحات، محاورات، روزمرہ اور تشبیہات کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے جس سے بیان کی تفہیم آسان ہوگئی ہے۔ اس بیان میں المیہ کے ساتھ استقامت کا مظہر قابلِ غور ہے۔ استقامت کی وجہ سے ہی خوشی خوشی جان پر کھیل جانے والے بچوں کی عزت وتوفیق ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے المیے جن کا دل و دماغ پر غلط اثر پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے، مفکر شاعر اور اچھے دل و دماغ رکھنے والے ادیب موت وحیات اور فلسفہ کائنات کے فنا کے موضوع کو پیش کر کے اس المیہ کو خوبصورت لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں جو انسانی دل و دماغ کو غمزدہ کرنے کے ساتھ خوبصورت تصور اور خیال بھی دے جاتے ہیں۔ افق نے اپنی اس مثنوی میں ان خیالات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ یہ مثنوی خیر وشر یعنی برائی اور بھلائی کا آئینہ ہے لیکن قاری اور سامع کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ شاعر نے کسی مذہب یا تہذیب کی مذمت یا برائی کی ہے۔ اچھے اور آفاقی ادب کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ وہ مسلمہ حقیقت بیان کرے، اس پوری مثنوی میں مسلمہ حقائق پوری طرح جلوہ گر ہیں مثال کے طور پر افق کہتے ہیں:

حکومت چار سو اسلام کی تھی
تبر کی، تیر کی، سمسان کی تھی
مسلمانوں سے بس یہ بدظنی تھی
کہ ان کو خونفشانی کی ٹھنی تھی
مگر دل میں تھی صرف ان سے عداوت
جو تھے ظلم و جفا کرنے میں دہاوت

اس سوانح میں جذبات کا بیان ہے اور شاعر کی عقیدت بھی عیاں ہوتی ہے۔ مثنوی کے آخر میں نوحہ کی طرح کے کچھ اشعار کہے گئے ہیں:

ستمگر بھی نہ تھے جب ہوش میں خود
اجل نے لے لیا آغوش میں خود
ہوئے مثل زر خالص کو کشتہ
بنے دیوار مذہب کو جو کشتہ
سنا ماں نے تو سر پٹکا زمیں پر
یہ کہتے کہتے دم توڑا وہیں پر
میری گودی کے لعل آنکھوں کے تارے
دلارے زندگانی کے سہارے
نہ گھبرانا کہ میں بھی آ رہی ہوں
جگر کی ممتا کو دکھلا رہی ہوں

☆☆☆

رباعیات

اردو کے تقریباً سبھی شعراء نے رباعیاں کہی ہیں۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے۔ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ایک ہی ردیف قافیہ میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ رباعی کا موضوع کوئی خاص نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ تر اردو شعراء نے فلسفانہ، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر رباعیاں کہیں ہیں۔ سیاسی اور سماجی مسائل بھی رباعیوں کے ذریعہ اٹھائے گئے ہیں۔ ایک رباعی میں پورا ایک خیال بیان ہوتا ہے۔ پرانے شعراء نے غزل کے مضامین پر بھی تمام رباعیوں کہیں ہیں۔ اکبراللہ آبادی جیسے طنز و مزاح کے شعراء نے اپنی رباعیوں سے لوگوں کو خوب ہنسایا ہے پھر بھی رباعی کا میدان زیادہ تر معرفت اور فلسفہ رہا ہے۔ افق نے بھی اردو شاعری کی اس صنف میں کافی کہا ہے۔ انہوں نے جن مضامین کو اپنی رباعیوں کے لیئے چنا ہے ان میں خاص طور پر حب الوطنی، قومی یکجہتی، سماجی بہبودی، سماجی بیداری اور دھرم نرپیکچھتا (سیکولرزم) وغیرہ ہیں۔ افق نے اپنی رباعیوں میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ ان کی رباعیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی تمام رباعیوں میں کئی محاوروں یا روزمرہ کا استعمال ہوا ہے اور خاص طور پر ہر رباعی کے آخری مصرعہ میں کسی نہ کسی محاورے کا استعمال کر کے اسے عام فہم بنایا گیا ہے۔ یہ انداز بیان اردو کے کم شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ افق نے لکھنؤ میں استعمال ہونے والے تمام محاوروں کو بہت خوبصورتی اور شاعرانہ انداز میں شعری جامہ پہنایا ہے جس سے ان کے کلاسیکل ادب پر مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ محاوروں کا اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ رباعی پڑھنے سے محاورہ کے معنیٰ تقریباً معلوم ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی افق کی شاعری کا کمال ہے کہ انہوں نے اپنی رباعیوں میں محاورات کے جو معنیٰ مراد لیئے ہیں وہ پوری طرح سے واضح ہو جاتے ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

صورت میری شاعری سے آرام کی ہے
کاغذ میرے حق میں سلطنت جام کی ہے
خورشید افق جسے جہاں کہتا ہے
اک مہرِ افق وہ میرے نام کی ہے

ہندوستان کی عظمت کو افق نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ اس طرح بیان کیا ہے:

ہندوستاں گھر جہاں پناہی کا ہے
ماتھے پہ اسی کے فخر کا ٹیکا ہے
عظمت کا ثبوت قدرتی ہے افق
اوپر ہے ہند نیچے امریکا ہے

***

فردوس نظیر ہے خطاب کشمیر
دہلی ہے قدیم مرکز تخت و سریر
مشہور ہے لکشمی کا گھر ملک دکن
مشرق سے افق ہے جلوہ مہر منیر

***

حوروں کی طبیعت اس پہ لوٹی دیکھی
وسعت میں بہشت اس سے چھوٹی دیکھی
سر ہند سے ہو گیا فلک کا نیچا
جس وقت ہمالیہ کی چوٹی دیکھی

***

دنیا میں کہیں جواب کب ہند کا ہے
جو جاہ ہے جو تزک ہے، سب ہند کا ہے
سب خلد کے یاں آ کے مزے لوٹتے ہیں
بر حق جنت نشاں لقب ہند کا ہے

***

یہ چاروں رباعیاں حب الوطنی کے جذبہ کے تحت افق نے اپنے ملک کے لئے کہی ہیں جس کی عظمت اور سر بلندی ثقافت اور کرامت زمانہ قدیم سے آج تک مشہور زمانہ رہی ہیں۔ خصوصاً کشمیر کی حسن کاری اور اس کے جنت نشاں ہونے اور دلی کی تاجوری کا ذکر جو یقیناً ہماری عظمت اور کرامت کی نشانیاں ہیں۔ ہمارے ملک کی دولت وثروت بھی مشہور زمانہ رہی ہے جو دوسرے ملکوں کے فاتحین کے لئے کبھی کبھی باعث کشش ہوئی ہیں۔ اس کا بھی ذکر افق نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ مشرق سے مہر منیر کا ذکر کر کے ہندوستان کی جغرافیائی حیثیت اور محل وقوع (دنیا کے نقشہ کے حساب سے) کو بیان کر کے بتایا ہے کہ اس ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

اردو کے اور شعراء کی طرح افق نے بھی انسان کے لئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ ہر مذہب میں اخلاقی قدروں کو انسانی زندگی میں عمل میں لانے پر زور دیا ہے اسی لئے سبھی مذہب احترام کے قابل ہیں۔ مذہب کے نام پر آپس میں تعصب نہیں ہونا چاہئے۔ ضرورت ہے فرقہ وارانہ خلوص کی۔ جس سے باہمی ہمدردی، میل ملاپ، امن اور محبت کا ماحول بنا رہے۔ مذہبی تحمل کے ذریعہ اہل ہند کو راہ مستقیم پر چلنے کی تحریک افق نے اپنی اس رباعی کے ذریعہ اس طرح دی ہے:

مولیٰ لامذہبی سے انسان کو بچائے
نفرت نہ کسی دین سے ہونے پائے
مذہب پہ رہو افق ہمیشہ قائم
سمجھے رہو جان جائے ایمان نہ جائے

مذہب کی اہمیت اور ضرورت انسانی زندگی کے لئے اسی طریقہ سے ہے جیسے آب و ہوا کی ضرورت۔ خوبصورت اور کامیاب زندگی اچھے معاشرہ اور اچھے سماج کی تعمیر مذہبی اقدار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاریخ انسانی اس بات پر شاہد ہے کہ جب مذہب معاشرہ سے رخصت ہو گیا تو سماج میں برائیاں اور بدعنوانیاں عام ہو گئیں۔ ایسے خیالات کی ضرورت ہو سکتا ہے افق کے زمانہ میں کم رہی ہو، لیکن آج ہندوستانی سماج اور معاشرہ کے لئے یہ بات بہت اہم ہو گئی ہے جہاں قدم قدم پر مذہب کے لئے جھگڑے ہوتے ہیں۔

حب الوطنی کے جذبہ کے تحت اپنے قومی مسدسوں کی طرح افق نے کئی قومی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان رباعیوں میں افق نے قوم کی ترقی پر توجہ دینے کو خدا کی راہ کا سودا مانا ہے۔ قومی یکجہتی اور خلوص کے بارے میں غیر جانبدار رویہ اختیار کرنے والوں کو افق نے سماج کے چوکس محافظ بننے کا پیغام دیا ہے تا کہ ہندوستانی سماج دوسروں کے لئے مثالیت کے نمونہ پیش کر سکے۔ اپنی ان رباعیوں کے ذریعہ افق نے قومی یکجہتی کے لئے باہمی ہمدردی، خلوص اور نیک نیتی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، وہ کہتے ہیں:

ہمدردیِ قوم سے نہ ہمت ہارو
جس طرح ہو سب سے پہلے مہرہ مارو
لے لو اسے اپنی جان تک بیچ کے مول
سودا یہ خدا کی راہ کا ہے یارو

***

ہمدردی قوم سے تنفر یارو
اتنی تو نہ ہمت اپنی ہارو
عقبٰی کو مٹا رہے ہو دنیا کے لئے
دانِستہ بہشت پر نہ لاتیں مارو

***

بھائی کی طلب کبھی نہ اصلاً دیکھی
سمجھے نہ بھلی کسی کی دیکھا دیکھی
ہمدردی باہمی نہ کی تونے افق
دنیا میں کبھی نہ جاتی دنیا دیکھی

***

سمجھا بھائی کو صرف بھائی ہم نے
بھولے سے نہ کی کبھی بھلائی ہم نے

اور اس پہ ہے ناز حب قومی افسوس
مسجد ایک اینٹ کی بنائی ہم نے

***

جس نے ہم قوم سے عداوت ٹھانی
کی اس نے حماقت اس نے کی نادانی
سمجھے رہے خوب اے افقؔ وہ یہ مثل
لاٹھی مارے جدا نہ ہوگا پانی

***

بھوکا ہے کوئی قوم میں کوئی ننگا
جھگڑا ہے کہیں، کہیں لڑائی دنگا
اصلاح نہ ہم سے ہوسکی کچھ لیکن
جب دیکھئے تب بہائی الٹی گنگا

***

جس کو نہ فلاح قوم کی طاق رہے
خود بینی سے نام نیک کیا خاک رہے
جب کان ہو تیرے سن غمنا کی قوم
اے پنہا بغوش تب تیری ناک رہے

قومی رباعیات میں افق نے قومی احساسات، جذبات اور اتحاد کو جگانے کی پرزور کوشش کی ہے۔ قوم کے سربرآوردہ شخصیات کو شاعرانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے ان کی غیرت قومی کو للکارا ہے کہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وہ آگے نہیں آتے صرف قول ہی قول ہے کام کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی میں ملک کی ترقی مضمر ہے۔ قوموں کے عروج ارتقاء کی خوبصورت کہانی کا نام ترقی یافتہ ممالک ہیں اور پستی بدحالی کی داستان پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک ہیں۔ افق ہندوستان کی ترقی اور خوشحالی اس میں بسنے والی قوموں کے اتحاد اور ایک دوسرے کی ہمدردی اور مل جل کر رہنے میں دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے

کوئی شاعر مصلح یا پیغمبر نہیں ہوا کرتا۔اس کا کام ہے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو پیش کرنا اور اس سے بھی بڑی عظمت اس کی یہ ہے کہ مستقبل کے آئینے میں اپنی قوم اور ملک کے حالات کو دیکھ لے۔ادب کے اصول ونظریات میں اسی کو آفاقی ادب کہا جاتا ہے۔افق کو اس بات کا رنج تھا کہ اتحاد اور اتفاق کی کمی اور باہمی نفاق کی وجہ سے ملک میں تنزلی ہے اور انہیں وجوہات سے برطانوی حکومت دن بدن غلامی کا شکنجہ ملک پر اور سختی سے جکڑ رہی ہے۔افق لوگوں کو آگاہ کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ قومی شیرازہ بندی میں ہی ملک کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے اور ایک منظّم ملک ہی آنے والی کسی آفت اور مصیبت سے اپنے کو ابار سکتا ہے۔ان کی نظر میں اتفاق اور اتحاد ملک اور قوم کی ترقی فلاح و بہبود کامیابی اور کامرانی کے لئے بیحد ضروری ہیں۔اس بارے میں افق کی بامحاورہ زبان میں ان کی حسب ذیل رباعیوں کو دیکھئے:

ہم نے اگر اتفاق کا دیکھامنہ
دل اپنا دکھا سکے کسی کا کیا منہ
ہمدردی باہمی سے افلاس و زوال
رہ جائیں گے لے کے آپ اپنا سا منہ

***

کج فہم اپنے خیال ناموزوں سے
ناراض ہیں اتفاق کے مضموں سے
صد حیف نہ ہم سے ہو بہی خواہی اے قوم
افسوس ہمیں ہوں اپنے بغلی گھونسے
ہم کو جو کچھ اہل قوم سے میل نہیں
ہمدردی و اتفاق کے کھیل نہیں
بدنام ہوئے نتیجہ آخر یہ ہوا
سب کہنے لگے کہ ان تلوں میں تیل نہیں

***

ابتر ہے بہت یاں کے اقوام کا حال
پورا کرو جلد اس کا ہر ایک سوال
لے لو خبر آج کل نہ جانے کیا ہو
اے اہل منال ہے گھڑی میں گھڑیال

***

ہمدردی قوم کی اچھی ہے ہر بات
ہیں رحم دلی کے خوب مرغوب نکات
کیا ایک رباعی ان کے اوصاف لکھے
یاں سوانگ بہت ہے اور تھوڑی ہے رات

***

ہر ایک کے وعظ و پند سے کھولو کان
سمجھاؤ نفاق باہمی کے نقصان
کام اپنا کرو افق کسی کی نہ سنو
بکنے دو انہیں جو حلق کے ہے دربان

***

یوں ہی جو رہے گا عقل و ادراک سے بیر
سمجھیں گے جو ہم عزیز و ہمدرد کو غیر
ایک روز ذلیل ہوں گے کچھ شبہ نہیں
بکرے کی ماں منائے گی کب تک خیر

***

گر دل پہ تمہارے ہو غم قوم کی چوٹ
ہو چشم فلاح صورت قوم پہ لوٹ
اے اہل منال خوش ہو کل قوم افق
ہو ٹھیک مثل پہاڑ تنکے کی اوٹ

***

جس نے رشتہ نکیر کا توڑ دیا
بے مہری دل کا آبلہ پھوڑ دیا
کہتا ہے وہ ہو کے خوش کہ آپس کا نفاق
بھاری پتھر تھا چوم کے چھوڑ دیا

افق نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ یہ بات بار باراور زوردیکر کہی ہے کہ برطانوی سرکار کے خلاف مہم جاری رکھنے کے لئے ساری قوم کوایک جٹ ہوکر جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ان کا ماننا تھا کہ مظلوم اور غریب ہندوستانی عوام کی بنیادی ضرورتیں پوری کی جائیں تبھی ان میں ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے اوراپنے حقوق کے لئے لڑنے کی بیداری ہوگی اوراس کے لئے ضروری ہے کہ سماج کے اونچے طبقے کے دولتمند اور بارسوخ لوگ پسماندہ طبقے کے لوگوں کی مدد کرنے اوران میں بیداری کا احساس جگانے کے لئے آگے آئیں۔اس طبقے کا اس ماحول میں فرض بنتا ہےاوران پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایثار وقربانی کے جذبہ کے تحت ملک اورسماج کی بہبودی کے لئے پسماندہ طبقے کے لوگوں میں ان پر ہو رہے ظلم کی مخالفت کرنے کی چھٹپٹاہٹ پیدا کرنے کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ ملک اورقوم کی نظر کردیں۔اپنے اس پاکیزہ فرض سے بےتعلقی رکھنے والے صاحب مقدور لوگوں کی ذہنیت پر افق حسب ذیل رباعیوں میں اس طرح طنز کرتے ہیں:

پتھر سے زیادہ سخت دل ہے جن کا
در بند ہے ان کے دیدہ باطن کا
احسان کریں کسی پہ ممکن یہ نہیں
گھس جائیں اتار دیں جو سر سے تنکا

***

جو لوگ زبان ہلا کے ہر ایک جگہ
کرتے ہیں درست حالت قوم تباہ
ایسے ہمدرد صاحب مال افق
پنساری بنے ہیں لے کے ہلدی کی گرہ

***

بد باطن قوم کی خبر کیا لیں گے
تسکین کے عوض جواب سوکھا دیں گے
آہ و فریاد قوم سن سن کے افق
ممکن کیا ہے جو کان پر جوں رینگے

***

کڑوی باتیں ہیں ظاہری میٹھے بول
بکنے لگی رحم کی نظر آگ کے مول
ظاہر میں رحیم سنگ دل باطن میں
اے دل افسوس ڈھول کے اندر پول

***

ہیں بد باطن جو دشمنی کے بھوکے
ملتے ہیں ہر ایک سے منہ بنا کے روکھے
رونا ہنسنا برابر ان کا ہے افق
سچ ہے ساون ہرے نہ بھادو سوکھے

***

کرتا نہیں کوئی زر سے امداد عوام
اوڑھیں کہ بچھائیں پند آمیز کلام
ہمدردی اہل غم فقط باتوں سے
بچھیا موئی واہ واہ بامن کے نام

***

ہمدردی سے کیوں حجاب اے دل ایسا
تھوڑا دو جو نہ دے سکو بہت سا پیسا
کرنا ہے جو کام اس میں کیا شرم افق
نکلے جب ناچنے کو گھونگھٹ کیسا

قوم کے رفاہ عام کے کام یعنی امداد قومی کے بارے میں افق بتانا چاہتے ہیں کہ جو اہل سخاوت ہے وہ رفاہ عام کا کام کریں جس سے کہ ترقی کی راہیں کھل سکیں۔ جیسے تعلیمی اور تربیتی ادارے قائم کریں، یتیموں اور مظلوموں کی پرورش کے اوران کے فلاح اور بہبود کے ادارے قائم ہوں جس سے قوم کی مدد ہو سکے اور خوشحالی اور فارغ البالی کی بہاریں سایہ فگن ہو سکیں۔ کیونکہ شاعر افق آفاقی ذہنیت اور آفاقی سوچ رکھتے ہیں اس لئے ان کی ایسی تمنا تھی کہ اگر اہل ثروت امداد قومی پر اتر آئیں تو ہندوستان جلد ہی ترقی کرے گا اور غلامی کے عذاب سے بھی جلد نجات پائے گا۔

افق ہندوستان کی ترقی علم کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ ان کے زمانہ میں جدید سائنس کی ترقی کا دور شروع ہو چکا تھا، نئی نئی ایجادات، انکشافات (کھوجیں) سامنے آ رہی تھیں۔ افق نے ہندوستان کے علم وفن، تہذیب اور تمدن کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انکو معلوم تھا کہ ہم جس ملک کے باشندے ہیں وہاں یہ سارے علوم چاہے طب، کیمیا، نجوم، فلسفہ، معدنیات وغیرہ کے ہوں سب پہلے سے موجود تھے۔ ہم نے ان کو پس پشت ڈال دیا اور یوروپ کی تحقیقات وتنقیحات سے متاثر ہوکر ان کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ افق لکھنوی نے ہندوستان کے علوم اور فنون پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم کو بیدار کرنے اور علم وفن کی طرف راغب کرنے کی شاعرانہ انداز میں حمایت کی ہے۔ یہ مسلمہ اصول ہے کہ شعر دل ودماغ پر جلد اثر پذیر ہوتے ہیں اس لئے شاعری کا سہارا لے کر انہوں نے گذشتہ زمانہ کے ہندوستان کی یاد آوری کرائی ہے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی رباعیوں کے ذریعہ ان باتوں کی طرف توجہ دینے کے لئے افق نے اس طرح آواز دی ہے:

اجداد کے علم وفن کے اب تک ہیں نشان
پڑھنے لکھنے کا ہم کو لیکن نہیں دھیان
ہے اہل قلم میں یہ لیاقت کی کمی
افسوس اونچی دکان پھیکا پکوان

***

سر اپنے جو علم و فن کا ٹیکا ہوتا
گھر ہر گھر میں نہ مفلسی کا ہوتا
تکمیل جو علم و فن میں ہوتی ہم کو
ممکن کیا تھا جو بال بھی بانکا ہوتا

***

کیوں سر پہ زوال کی مصیبت نہ پڑے
تعلیم کے نام سے کئے کان کھڑے
حیرت جو برستی ہے تمہارے منہ پر
پڑتے ہیں افق پہ لاکھ پانی کے گھڑے

***

تحصیل علوم و فن سے ہر دم بھاگے
دم بھر بھی نہ خواب غافلی سے جاگے
شاکی ہوئے ہم تو اس پہ کہتے ہو افق
آنکھوں کی برائی واہ بھوں کے آگے

***

ذی فہم تو علم کی کریں چاہ پڑھیں
ہم حیف نہ کچھ لکھیں نہ آہ پڑھیں
ہو فاقہ کشی کا ہمیں تو حیلہ لیکن
آنتیں فاقوں سے قل ہو اللہ پڑھیں

***

تھا نور مہ نجوم جب تک تھی رات
جب تک لائق تھے ہم تھی آرام کی بات
تصدیق ہماری قوم کی ہے یہ مثل
دولہا کے دم کے ساتھ ساری تھی بارات

ہمارا سماج قدامت پرست اور رواج پسند ہے۔ ترقی پسندی کی طرف ہمارے خیالات راغب نہیں ہیں جس کی وجہ سے ہم پستی اور غریبی کے حصار سے نکل نہیں پاتے ہیں۔ ملک ترقی یافتہ بن سکے سماج میں ایسا ماحول پیدا کرنے کے لئے افق اپنے مخصوص انداز میں حسب ذیل رباعیوں میں کہتے ہیں:

کی قدر نہ مال و زر کی حاشا ہم نے
گھر اپنا لٹایا بے تحاشہ ہم نے
شادی میں، غمی میں، رنج و راحت میں افق
دیکھا گھر پھونک کے تماشا ہم نے

***

بلبل ہوئی قید یاد گلشن نہ گئی
ٹوٹی مگر آب نوک سوزن نہ گئی
ہم مٹ گئے پر مٹی نہ اگلی رسمیں
رسّی ہوئی جل کے خاک اینٹھن نہ گئی

***

غافل جو ہمارے ہم وطن ہوتے ہیں
غفلت میں تمام مال و زر کھوتے ہیں
کیا جاگے افق نصیب ان لوگوں کا
جب سوتے ہیں گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں

***

غفلت کا کیا ہے گرم بازار افق
ہوتے نہیں بیہوشی سے ہوشیار افق
اور اس پہ یہ قول کہ غافل نہیں ہم
آنکھوں پہ اٹھائی تم نے دیوار افق

جس شاعر کے اندر وطن پرست دل ہے وہ اپنے ملک اور سماج کو تمام عیب اور

ان سے پیدا ہونے والے خطروں سے آگاہ کئے بنا نہیں رہ سکتا۔ افق کی شاعری بھی اس کی ایک مثال ہے۔ افق نے سماج کی ایک بہت بڑی خرابی شراب نوشی کی برائیوں کی طرف عوام کی توجہ بار بار دلائی ہے وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ مے پرستی تمام عیبوں کی جڑ ہے جس سے لاکھوں گھر تباہ ہوتے ہیں اور پورا سماج بیمار ہو جاتا ہے۔ اپنے شاعرانہ انداز میں اس عیب سے بچنے کے لئے افق عوام سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:

لاکھوں کی رقم جو خرچ فرماتے ہو
دم بھر کا مزہ شراب سے پاتے ہو
اے فخر برادرانہ مے خوار افسوس
مسجد ایک اینٹ کے لئے ڈھاتے ہو

***

دیکھو جسے مبتلا ہے دخت رز کا
ہم شکل ہے دور جام کے مرکز کا
کوئی ہے فضول خرچ کوئی عیاش
لنکا میں جو ہے وہ ہے باون گز کا

***

صہبا جو بزرگ نوش فرماتے ہیں
اولاد کو مے پلا کے گرماتے ہیں
افسوس افسوس حیف صد حیف افق
گیہوں کے ساتھ گھن پسے جاتے ہیں

***

کیوں ہم در میکدہ پہ گھستے ہیں جبیں
کیوں فائدۂ شراب ہے ذہن نشیں
گو کہتے ہیں آفتاب اس کو لیکن
ہندو پوجیں جسے یہ سورج وہ نہیں

سماج کے تمام مسائل حل کرنے کے لئے اور اس کی بہبودی پر چوکسی سے نظر رکھنے کے لئے قابل افراد کی کمیٹیوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں پنچایت کی اہمیت شروع سے رہی ہے۔ ہمارے گاؤں کا بہت سا نظام انہیں کے سپرد ہوتا تھا اور انکا فیصلہ سب قبول کرتے تھے۔ آج بھی پنچایتوں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ان کو زیادہ حقوق دیئے جانے اور ان کے ذریعہ ہی سماجی مسائل کو حل کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ افق نے بھی اپنے دور میں برطانوی نظام میں عوام کو اپنے حق کے لئے اپنی آواز اٹھانے کا ذریعہ پنچایتوں کے ہی سپرد کرنے کا راستہ دکھایا ہے۔ اجتماعی کوششیں ہی برطانوی سرکار سے اپنی رائے منوانے کا ایک کارگر طریقہ تھا۔ سماجی بہبودی کے لئے بنائی گئی مختلف کمیٹیوں کی اہمیت کو افق نے اپنی چند رباعیوں کے ذریعہ اس طرح بتایا ہے:

پنچایت انجمن کمیٹی کے سماج
ہے فائدہ بخش ہر امیر و محتاج
دس آدمیوں کی رائے ہوتی ہے مفید
ہے قول کی پانچ پنچ مل کیجئے کاج

***

ہمت جو فدا رہے ہر اک خوش خو پر
قابو ملے اتفاق بے قابو پر
ممکن یہ نہیں کمیٹیوں میں ہو نہ کچھ
کیا جائیں گی یہ کوششیں اوپر اوپر

افق نے ہندوستانی سماج میں اخلاقی قدروں کو قائم رکھنے کی ضرورت کو بہت اہمیت دی ہے۔ ان قدروں کی بنا پر ہی وہ انسانی زندگی کی برتری کی توقع رکھتے تھے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہمیں چھوٹی چھوٹی لیکن کئی نہایت اہم باتوں پر ہمیشہ توجہ دینا چاہئے۔ افق نے اپنی اخلاقی رباعیوں میں اخلاقی اقدار پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے کہ اچھے معاشرہ کی تعمیر کے لئے اخلاقی قدروں کو اہمیت دینا بیحد ضروری ہے۔ جس معاشرہ میں اخلاقی قدروں میں گراوٹ آ جاتی ہے وہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ انسان کی کچھ خاص خراب عادتوں اور

کمزوریوں کے بارے میں توجہ دلاتے ہوئے افق نے اپنی ان رباعیوں کے ذریعہ اس طرح نصیحت کی ہے:

تیشہ کھایا جو بڑھ گئی شاخ شجر
دنبل نے جو سر اٹھایا کھایا نشتر
سرکش ہے جو اس کی لازمی ہے پستی
نیچا دیکھا افق بڑے بول کا سر

***

دل سوزی ہم نفس سے تم باز نہیں
خالی بدعت سے کوئی انداز نہیں
سمجھے رہو ہر سزا کی ملتی ہیں جزا
لاٹھی میں خدا کی یارو آواز نہیں

***

جو روح ہجوم غم سے گھبراتی ہے
اس پر نہیں قوم تو ترس کھاتی ہے
امداد کر اس کی جلد کرکے خیال
رہتا نہیں وقت بات رہ جاتی ہے

***

عزت جہاں میں پاتا ہے جھوٹا بشر کہاں
قابل یقیں کے ہوتی ہے جھوٹی خبر کہاں
کافی پئے سند ہے یہ تمثیل اے افق
سچے کی قدر پاتا ہے جھوٹا گھر کہاں

***

اوصاف بہت ہیں سچ کے دس پانچ نہیں
اس کے حسن و ثواب کی جانچ نہیں

سچا جو ہے وہ بری ہے تکلیفوں سے
واللہ ہے سچ کہ سانچ کو آنچ نہیں

***

کسریٰ ہے وہی جو سبق نیکی کا پڑھے
صہبا ہے وہی جو علم میں سب سے بڑھے
حاتم ہے وہی جو کرے ہمدردی قوم
ہے پھول وہی افق مہ سر جو چڑھے

افق نے اپنی رباعیوں میں تخیلات کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کی کئی رباعیوں میں معرفت اور فلسفہ الٰہیات کا بھی پر اثر بیان ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی حسب ذیل رباعی دیکھئے:

زندگی کا کچھ بھروسہ دارِ فانی میں نہیں
بلبلے کو ایک دم کی آس پانی میں نہیں
آگے پیچھے سب بڑے چھوٹے ہیں راہیِ عدم
کوئی طفلی میں نہیں کوئی جوانی میں نہیں

قصیدہ

قصیدہ کی شروعات عربی شاعری سے ہوئی۔ بعد میں یہ فارسی شاعری کی ایک اہم صنف کی شکل میں پروان چڑھی۔ عام طور سے ایک روایت یہ چلی آرہی ہے کہ فارسی قصیدہ نگاری عربی قصیدہ نگاری سے متاثر ہے۔ لیکن اس بارے میں کچھ اہم باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ عرب اور ایران کا ماحول، سماج اور محل وقوع ایک دوسرے سے بالکل الگ تھا۔ عرب کی زندگی سختی، دشواری اور تنگ حالی کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ عربی تہذیب اسلام کے آنے سے پہلے دوسری تہذیبوں سے متاثر نہیں تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری فطرت کے زیادہ قریب تھی۔ عربی قصیدہ نگاری میں عام طور سے محبوب اور اس کے دیار کا ذکر ہوتا تھا جس میں شاعر حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ لفظوں، تشبیہات، استعارات کو ایسی ترکیب سے شاعری میں پروتا تھا کہ ایک ایسی لازوال شاعری ابھر کر سامنے آتی ہے جس کی مثال اسلام کے آنے کے بعد عربی شاعری میں نہیں ملتی ہے۔ اسی اعلیٰ قصیدہ نگاری کو اردو ادب کے مؤرخین نے کہہ دیا کہ فارسی قصیدہ نگاری کے اوپر عربی قصیدہ نگاری کے اثرات ہیں۔ جہاں تک فارسی شاعری کا سوال ہے اس کی اپنی ایک الگ روایت ہے۔ اس کا اپنا لمبا سفر ہے اس کی قصیدہ نگاری عرب کی شاعری کے اثرات مرتب ہونے سے پہلے ہی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ فارسی قصیدہ نگاری اور عربی قصیدہ نگاری میں بعد المشرقین یعنی پورب پچھم کا فرق نظر آتا ہے۔ فارسی شاعری میں جن تلمیحات، تشبیہات، موسم، چمن، گل، بلبل، وغیرہ کا ذکر ہے وہ عربوں کے آنے کے پہلے بیان کے اعتبار سے اپنے معراج کمال کو پہنچ چکے تھے۔ عربی شاعری میں جس سچائی اور سادگی سے سلمیٰ اور وامق کا ذکر کیا گیا ہے عذرا اور سعاد کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس انداز میں فارسی شاعری میں نہیں ملتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عرب کے لوگ سچ بولنے میں یقین رکھتے تھے اور ان کی مہمان نوازی بھی مشہور تھی۔ یہ عربی قصیدہ نگاری پر فارسی قصیدہ نگاری کا اثر تھا کہ بعد

کی عربی قصیدہ نگاری میں مبالغہ آرائی آ گئی۔

فارسی میں خاقانی قاآنی جیسے باکمال شاعروں کا نام قصیدے کے میدان میں بہت ہوا۔ فارسی قصیدوں میں عربی الفاظ کا بھی کافی استعمال کیا گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری کا بہت کچھ فارسی شاعری سے مستعار یعنی ادھار لیا ہوا ہے اس وجہ سے فارسی قصیدہ نگاری کے اثرات کو اردو قصیدہ نگاری میں بھی قبول کیا گیا ہے۔ اردو قصیدہ نگاری پر فارسی قصیدہ نگاری کا اثر نمایاں ہے چاہے دکھنی دور کی قصیدہ نگاری ہو یا شمالی ہندوستان کی۔ جس طرح فارسی شعراء دربار میں قصیدہ نگاری کیا کرتے تھے اسی طرح اردو کے بڑے قصیدہ نگار شعراء تقریباً سبھی درباری شاعر تھے۔ یہ بات تو فارسی اور اردو میں مشترکہ ہے لیکن یہاں ایک بنیادی فرق کا ذکر کیا جانا ضروری ہے۔ فارسی قصیدہ نگار شعراء جن درباروں سے وابستہ تھے وہ یقیناً اسلام کے عروج سے پہلے بڑی شان وعظمت کے حامل تھے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کے اردو شعراء جن درباروں سے وابستہ تھے وہ دربار صرف نام کے تھے۔ ان درباروں کی اصلی شان وشوکت ماضی کی بات ہو چکی تھے لیکن ان کے امراء اپنی تصوراتی زندگی میں اپنی بڑائی، شان وشوکت، رعب وداب اور عظمت رفتہ کا بیان سنکر خوش ہوتے تھے۔ ان کی اس خوش فہمی سے فائدہ اٹھا کر اردو شعراء نے قصیدہ نگاری میں انتہائی درجہ کی مبالغہ آرائی سے کام لیا اور اپنے سرپرستوں کی شان وشوکت بہادری اور سخاوت کا بیان کرنے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ پھر بھی فنی اعتبار سے اردو قصیدہ نگاری کو بہت عروج ملا اور قصیدے کی شکل میں ایک عظیم شاعری پروان چڑھی۔ یہ شاعری یقیناً لفظوں، تشبیہات وغیرہ کے اعتبار سے اعلیٰ شاعری کے درجے میں ہے۔ اس فن میں بہت سی ایسی چیزیں آ گئیں جو اردو غزلیہ شاعری میں نہیں تھیں۔ مثال کے طور پر تشبیب کا ذکر یا بہاریہ منظریہ اشعار لکھنا وغیرہ۔ یقیناً قصیدہ نگاری ہمارے کلاسیکل ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔

ہندوستان میں فارسی قصیدہ نگاری کی صنف مغل بادشاہوں کے ساتھ آئی اور اردو شاعری کا ایک مخصوص حصہ بن گئی۔ اردو کے قصیدوں کے بارے میں جن دو شعراء کے نام مشہور ہیں وہ سودا اور ذوق ہیں۔ سماج میں آئی تبدیلی کی وجہ سے قصیدے لکھنے کی روایت اردو شاعری میں لگاتار کم ہوتی جا رہی ہے۔

قصیدہ بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کی شان میں کہے جاتے رہے ہیں۔ عالم دین کی خوبیوں کا بیان کرنے کے لئے بھی قصیدہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ قصیدہ میں شاعر کسی عظیم شخصیت کے بڑے کارناموں بہادری، سخاوت اور دوسری اہم خصوصیت کا پرزور بیان کرتا ہے۔ خاص طور پر قصیدہ کے پانچ حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ تشبیب کہلاتا ہے جس میں کسی منظر یا واقعہ کا بیان ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ گریز کہلاتا ہے جس میں ممدوح عظیم شخصیت کے بارے میں خاص خاص باتیں بتائی جاتی ہیں۔ تیسرے حصے کو مدح کہتے ہیں جس میں شاعر اپنے ممدوح کی حمد وثنا کرتا ہے اور خوبیوں کا پرزور بیان کرتا ہے اور یہی قصیدہ کی جان ہوتی ہے۔ مدح میں شاعر مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے۔ چوتھے حصہ میں تعریف کئے جانے والے کے لئے دعا یا ایشور سے پرارتھنا کی جاتی ہے۔ پانچویں اور آخری حصہ میں شاعر اکثر اپنا مدعا بیان کرتے ہیں۔

قصیدہ لکھنے میں شاعری کا خاص مقصد صلاحیت بیان کرنا ہوتا ہے، اس لئے قصیدے زیادہ طویل ہوتے ہیں اور ان میں لفظوں کا خصوصاً استعمال ہوتا ہے جن سے بہادری سخاوت جیسی اچھائیوں پر روشنی پڑتی ہو۔ قصیدہ میں شاعر زیادہ تر بلاغت سے کام لیتا ہے اور تخیل کی اونچی سے اونچی اڑان بھرتا ہے۔ قصیدوں میں تشبیہات اور استعارات کا بھی بھرپور سہارا لیا جاتا ہے جس سے بیان پراثر ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدوں میں اشعار کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ غزل کی طرح قصیدہ میں بھی مطلع یعنی پہلا شعر ایک ہی ردیف اور قافیہ میں ہوتا ہے۔ قصیدہ کے تیسرے حصہ یعنی مدح کو بھی ایک نئے مطلع سے شروع کیا جاتا ہے۔

افق نے قصیدہ نگاری کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے جو قصیدے دستیاب ہیں ان پر روشنی ڈالنے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان کے قصیدوں میں وہ سب خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کامیاب قصیدوں کی جان ہوتی ہے۔ انکے قصیدوں میں تخیل کی اونچی اڑان کا لطف ملتا ہے اور تشبیہات، تلمیحات، استعارات کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ بھی ان کے قصیدوں میں نگینوں کی طرح جڑے ملتے ہیں۔

افق کے جو قصیدے دستیاب ہیں انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو میر محبوب علی خاں، نظام حیدر آباد دکن اور انکے وزیر اعظم مہاراجا کشن پرشاد بہادر شاد کی شان میں کہے گئے ہیں دوسرا حصہ وہ ہے جو ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے ان کے یہ قصیدے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ ان قصیدوں کا الگ الگ تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔

افق کے چاروں اہم قصیدوں میں سب سے خوبصورت قصیدہ بتقریب عطائے خطاب راجہ راجگان عالی جناب مہاراجہ کشن پرشاد بہادر سابق وزیر اعظم نظام دکن کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ اس قصیدہ کی شروعات تشبیب سے ہوتی ہے۔ یہ تشبیب بہاریہ ہے جس میں باغ، بلبل، طوطی، گلستاں، خزاں، پھول، طیور، نرگس، سوسن، سنبل وغیرہ کا ذکر کر کے شاعر نے بہار کا منظر کھینچا ہے۔ لفظوں کی دروبست سے شاعر نے نغمگی کی کیفیت پیدا کی ہے جس کی پھول کے مسکرانے اور کلی کے کھلنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس قصیدہ کے کچھ اشعار قارئین کی نظر کئے جاتے ہیں:

عجب خوشی کے سعید ساماں، میان باغِ جہاں ہوئے ہیں
کہ بلبل و طوطی گلستاں، ہما کے ہم آشیاں ہوئے ہیں
خزاں ہوئی ہے خزاں رسیدہ، فضا چمن کی ہے نوا ریدہ
غلام پھولوں کے زر خریدا، طیور شیریں زباں ہوئے ہیں
خوشی کا پید اسبب ہوا ہے، ارم چمن کا لقب ہوا ہے
جو سبزہ تھا خضر اب ہوا ہے، نہال کہنہ جواں ہوئے ہیں
خروس نے پایا ہے ضیغہ سر، ملی ہیں بھونروں کو کلگئے زر
نہال ملبوس سبز پا کر، بہار کے مدح خواں ہوئے ہیں
عطا ہوا طوق سلسلوں کو، ملا کمر بند بلبلوں کو
عنایت اعزاز سے گلوں کو، عمامہ زرفشاں ہوئے ہیں
کھلے ہیں فرط خوشی سے لالے، انار نے دانت ہیں نکالے
جو شب کو غنچہ تھے کھلنے والے، سحر کو خنداں کناں ہوئے ہیں

نہ زلف سنبل میں برہمی ہے، نہ اشک کی اوس میں نمی ہے
نہال ہے نخل خرمی سے، چمن چمن بوستاں ہوئے ہیں
نفس نفس ہے دم مسیحا، زبان سوسن ہے انس سے گویا
نگاہ نرگس نے نور پایا، جو یہ تجلی فشاں ہوئے ہیں

بہاریہ اشعار کے بعد گریز اور مدح کے اشعار کہے گئے ہیں شاعر نے اپنے ممدوح کی تعریف میں جو گلکاریاں صفحہ قرطاس پر کی ہیں وہ لفظوں، تشبیہات، معنیٰ اور مفاہیم کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ ان اشعار میں شاعر نے مدعا کو علاوہ قصیدہ کے سبھی اجزاء کو سمیٹ لیا ہے۔ اپنے ممدوح کی تعریف میں عبقری شخصیت کے نام سے تشبیہ دے کر انکی شاعرانہ عظمت، جود وسخا، انصاف پروری، سخن سنجی، رعب وداب اور بہادری کا بیان کیا ہے۔ اپنے ممدوح کی سلطنت کا بیان کرتے ہوئے خاص طور سے اسے ''لکشمی کا گھر'' کہا ہے پھر عدن اور معدن کا لفظ لا کر اس کی گہرباری اور زمین کی زرخیزی کو ایسی تشبیہ سے بیان کیا ہے جیسے وہاں کھلنے والے پھول بھی طلائی رنگ کے ہوتے ہوں۔ اپنے ممدوح کی سلطنت کو زمانہ بھر میں یکتا اور یگانہ بتا کر خسرو کی سخاوت اور دریا دلی سے تشبیہ دیکر سب کی کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے۔ اسی طرح پورے قصیدہ میں تلمیحات، تشبیہات کا استعمال کر کے اپنے ممدوح کی شان وشوکت کو بیان کیا ہے۔ قصیدہ کے کچھ چنندہ اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جس سے شاعر کی قصیدہ نگاری کی عظمت کی وضاحت ہو سکے گی:

جو حیدرآباد سلطنت ہے، بہار گلزار شش جہت ہے
وہ اس کی عزت ومنزلت ہے، کہ صدقہ ہفت آسماں ہوئے ہیں
یہ سلطنت لکشمی کا گھر ہے، عدن یہ معدن گہر ہے
زمین زرخیز اس قدر ہے کہ پھول تک زرفشاں ہوئے ہیں
زمانہ بھر میں یگانہ ہے یہ، امید گاہے زمانہ ہے یہ
تفضّل خسروانہ ہے یہ، کہ سب یہاں کامراں ہوئے ہیں
نظام کی کیا صفت رقم ہو، زیادہ جتنا لکھوں وہ کم ہو
مقابلہ میں نہ ان کے جم ہو، کب ایسے کشورستاں ہوئے ہیں

خیال جود سخا ہے پیہم، لحاظ انصاف ہے ہر ایک دم
یہی ہیں روئے زمیں پہ حاتم، کب ان سے نوشیرواں ہوئے ہیں
ہیں کرشن پرشاد نام نامی، لقب ہے مہاراجہ گرامی
ہلالی وعنصری و جامی بھی ان سے بڑھ کر کہاں ہوئے ہیں
انیس آتش وزیر گذرے، دبیر غالب منیر گذرے
نہ اب تک ایسے دبیر گذرے، نہ ایسے آتش زباں ہوئے ہیں
عقیق گنجینۂ یمن کا، اگال مشہور ہے دہن کا
وہاں جو سرچشمہ ہے عدن کا، یہ لب سے گہر فشاں ہوئے ہیں
گروہ بیکس کے بن کے حامی، خریدلی شہرت دوامی
بہائے اوصاف نیک نامی، عقیق و لعل گراں ہوئے ہیں
عمارت ان کی ہے خاندانی، شکوہ سطوت ہے جاویدانی
ظلال حق آب زندگانی، برائے اعزاز و شاں ہوئے ہیں
جو دیکھے ترچھی نگاہ تک سے، لرز کے تارے گرے فلک سے
یہ رعب ان کا ہے کب کجک سے، متیلے پیلے دما ہوئے ہیں
بڑھا دیوالی کے روز پایہ، خطاب خلعت کے ساتھ پایہ
وہ شاہ نے مرتبہ بڑھایا، کہ پست ہفت آسماں ہوئے ہیں
وقار و عزت کا بخت چمکا، ہے دور صہبائے جام جم کا
ہوا ہے کامل قمر حشم کا، نصیب شوکت زباں ہوئے ہیں
یہ مدح خواں دور افتادہ، ہوا خبر سن کے خوش زیادہ
جو دل میں تھا نظر کا ارادہ، یہ چند شعر ارمغاں ہوئے ہیں

قصیدہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے ممدوح سے دلی لگاؤ اور جذبات کی وابستگی تھی وہ کہتے ہیں:

نہیں یہ بے وجہ شادکامی، ہے موقع عشرت دوامی
افق کے اک قدرداں نامی، مقرب حکمراں ہوئے ہیں

اس قصیدہ کے آخری شعر میں افق نے تاریخ بھی کہی ہے:

ملک یہ اوج فلک پہ بولے، برائے تاریخ سال عیسیٰ
افق مہاراجہ کرشن پرشاد، راجہ راجگاں ہوئے ہیں

۱۸۹۳ء

افق نے دوسرا قصیدہ میر محبوب علی خاں نظام دکن کی مدح میں ان کی سالگرہ کے موقع پر کہا ہے۔ اس قصیدہ کی خصوصیت یہ ہے کہ بنا کسی تمہید کے ممدوح کی تعریف شروع کر دی گئی ہے۔ افق لفظیات اور بیان کے اتنے ماہر ہیں کہ جو بھی بیان کرتے ہیں اس میں روانی برجستگی، شگفتگی اور دلکشی موجزن ہوتی ہے۔ نظام کی تعریف میں جو پہلا لفظ انہوں نے استعمال کیا ہے وہ 'خسروئے فریدون' ہے جو جرأت، شجاعت، بہادری و سپہ گری کو بیان کرتا ہے۔ نظام کی سخاوت کو بیان کرنے کے لئے پارس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ان کی نگاہ کرم کی وضاحت کے لئے 'عزیز خلق' اور مدد کے لئے 'نوح کی کشتی' کا لفظ استعمال کر کے شاعر نے اپنے ممدوح کی ہمہ جہت شخصیت کو اجاگر کیا ہے۔

یہ قصیدہ ممدوح کے جشن سالگرہ کے موقع پر لکھا گیا تھا اس لئے اسی کے مطابق یا اس کے متعلق لفظوں اور تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے جو شاعری کی جلوہ سامانیوں سے پر ہیں۔ کچھ منتخب اشعار ہدیۂ قارئین کئے جا رہے ہیں جس سے شاعر کی شاعرانہ عظمت کی وضاحت ہوگی:

خیال مدح سرائی کی ہے جو دل میں جگہ
ہے خامہ دو زباں کی جگہ پہ بسم اللہ
جو ہیں نظام دکن خسروئے فریدوں جاہ
جری، شجاع، توانا بہادر اہل سپاہ
عزیز خلق کو وہ آنکھ سے زیادہ ہیں
ہے ان کی آنکھ کا ڈورا ہر ایک کو تار نگاہ
ہے پارس ان کا ید فیض، خاک پا اکسیر
ہے کیمیا سخن عاطفت ہما ہے نگاہ

ہے ان کی چشم کرم نوح کے لئے کشتی
خضر کے واسطے تارِ نفس ہیں تارِ نگاہ
تمام اشاروں میں کرتی ہے کام اعداء کا
ہے رشک لشکر مژگان یار ان کی سپاہ
عدو بھی ہیں زر بخشش سے ان کے مالا مال
گرہ ہے اہل دل کی، نہیں ہے دل کی گرہ
کیا نظام نے دستِ کرم سے گھر بار
نگاہ فیض نے برسایا ہن ہر ایک جگہ
فدائے مہ نہ ہو جس وقت تک گل خورشید
طلوئے شمس کی جب تک ہے سوئے شرق جگہ
جناب خضر کی عیسیٰ کی زندگی پائیں
ہو ان کی دہر میں ہر ایک سال سالگرہ

اس قصیدہ کے آخری اشعار میں دعا اور تاریخ کہی گئی ہے، یہ اشعار حسب ذیل ہیں:

دعا یہ ہے افق کے مدح خواں کی خالق سے
ضیائے مہر ہو جب تک چراغ خانہ ماہ
دعا کے بعد افق نے لکھا یہ مصرعہ سال
مبارک اے شہ محبوب جشن سالگرہ

۱۸۹۳ء

افق کا ایک اور قصیدہ بھی میر محبوب علی خاں نظام دکن کی شان میں ہے۔ اس قصیدہ میں شاعر نے دس شعروں میں سجدۂ تعظیمی کو بیان کیا ہے۔ قصیدہ کے پہلے شعر میں شاعر نے اپنے قلم کی تعریف کی ہے دوسرے شعر میں ردیف اور قافیہ کی تعریف کی ہے، تیسرے شعر سے نظام دکن کے وصف بیان ہوتے ہیں۔ دس شعروں میں سجدہ سلام کے ارد گرد نظام کی تعریف گھومتی ہے اور آخری شعر میں یہ کہہ دیا ہے کہ پیر و جواں سب انکو سجدہ کرتے ہیں۔ افق کا یہ بیان اردو کی قصیدہ نگاری سے الگ ہے۔ افق کے دوسرے قصیدوں میں بھی اس طرح کے بیانات

ملتے ہیں جس میں اس طرح کے اظہار جذبات مل جائیں گے لیکن فنی اعتبار سے یہ اشعار کامل اور مکمل ہیں جو ہمیشہ ادب کے طالب علم کو اپنی طرف کھینچتے رہیں گے۔ اگلے جو اشعار آرہے ہیں ان میں نظام کی شان و شوکت جاہ وجلال کو بیان کیا گیا ہے۔ مبالغہ آرائی جو قصیدوں کی روایت ہے، یہاں بھی پورے طریقے سے جلوہ گر ہے۔ کہیں کہیں تو بہت زیادہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے جو یقیناً حقیقت سے بہت دور ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فنی اور شعری اعتبار سے کسی طرح کا کوئی جھول چھوٹنے نہیں پاتا ہے۔ چوالیس شعروں کے اس قصیدہ کی سب سے بڑی خصوصیت لفظ کمر کا استعمال ہے جو اس قصیدہ کا ردیف ہے۔ شاعر نے اس قصیدہ میں اپنے ممدوح کی شان کی ساری چیزیں بیان کر دی ہیں جو مختلف تشبیہات استعارات اور تلمیحات کے حوالہ سے ہیں۔ قصیدہ کی تفہیم کے لئے کچھ اشعار دیئے جا رہے ہیں جس سے شاعر کے فن کا اندازہ ہوگا:

باندھے میرا قلم جو ہے تحریر پر کمر
نقد مراد پاکے بنے گنج زر کمر
ہر ایک سر ہے قافیہ کو دیکھ کر کمر
ہے ہر ردیف شعر سے شرمندہ ہر کمر
لکھتا ہوں میں جناب نظام دکن کے وصف
کرتا ہے سحر طبع محیط نظر کمر
دل میں ہے شوق اس قدر ان کے سلام کا
بنتا ہے ماہ عید جھکا کر کمر کمر
اللہ رے شوق سجدہ شاہ جہاں پناہ
گردوں جھکائے رہتا ہے آٹھوں پہر کمر
شاخیں چمن میں بارِ ثمر سے جھکی نہیں
خم کر رہے ہیں سجدہ شہ کو شجر قمر

شاعر نے اپنے ممدوح کی شجاعت کا بیان کرنے میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے:

سیف ان کی قتل کرتی یوں اہل سیف کو
کرتی ہے جیسے خون فدائے قمر کمر

کرتے ہیں ایک ہاتھ میں یہ جسم سے جدا
سر، حلق، دوش، ہاتھ، کلائی جگر، کمر
کشتی لڑے جواں سے وہ سہراب کی طرح
سیدھی کرے میان لحد لیٹ کر کمر
تیروں کا مینہ برستا ہے کرتی ہے جب یہ جنگ
ہوتا ہے ان کے تیغ کا پانی کمر کمر
رن میں پہنچ کے خود پہ لچکے جو ان کی سیف
سمجھے عدو کی ہو گئی بالائے سر کمر
سر کا نشاں نہ گردن اعداء پہ کچھ رہے
چھوڑے اگر حضور کی تیغ کمر کمر
افسر کو سر پہ تاج کو سر پر غرور ہے
نازاں کمر پہ تیغ ہے شمشیر پر کمر
ہوتا ز پشت پر اگر احسان شہ کا وار
جھکتی ہلال کی نہ کبھی اس قدر کمر

اس قصیدہ میں محاوروں کا استعمال بھی بیان کی خوبیوں کو بڑھاتا ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

وہ شخص ان کے آگے چلے کجروی کی چال
باندھے ہو جس کی جان برائے سفر کمر

***

توڑا انہوں نے دل تو عدو سر اٹھائے کیا
کیوں کر نہ پست سانپ ہو ٹوٹے اگر کمر
ڈالے جو ہاتھ جیب میں ہو بارش گہر
برسے ہنوں کا مینھ ٹٹولیں اگر کمر

اس قصیدہ میں دعا کے اشعار میں بھی محاوروں کی بانگی دیکھئے:

حق سے دعا یہ کر کہ سلامت رہے نظام
جب تک نہ برسے اوس کا پانی کمر کمر
بڑھتا رہے مہ چشم دولت حیات
جب تک فلک کی تھامے ہے شمس و قمر کمر

افق نے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے عطائے خطاب کی تقریب میں بارہ شعروں کا ایک قصیدہ لکھا ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ جس میں داغ دہلوی کی تعریف ان کی شاعرانہ عظمت نقل مکانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ داغ کی شاعرانہ عظمت کو ناسخ، حافظ شیرازی وغیرہ کی شاعری سے تشبیہ دے کر داغ کی بالا دستی کو جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے قطع نظر اس قصیدہ سے شاعر کی فارسی دانی اور فارسی زبان وادب پر کمال ظاہر ہوتا ہے:

فاش می گویم کہ از جادو طرازی سخن
استاد شاعران اصفہاں شد داغ ہند
نظم اردو را چناں در زیور خوبی کشید
عیسیٰ جاں بخش اعزاز بیاں شد داغ ہند
اولاً تا دیر از فرمانروائے رامپور
مستفید افتخار بیکراں شد داغ ہند
ناگہاں یوں آں قدح بشکست آں ساقی نہ ماند
در دکن از خطۂ دہلی رواں شد داغ ہند
یافتہ ماوائے خویش از قدر دانی نظام
از خطابات جلیلہ کامراں شد داغ ہند
شملہ عزت یوں القاب دبیر الدولہ گشت
بر زمیں ہمچوں دبیر آسماں شد داغ ہند
چوں نظام الملک کردش عرف ناظم یار جنگ
رشک نظم آرائے شرواں بیگماہ شد داغ ہند

ناسخ اعزا جاں فصیحان جہاں راز و جہاں
چوں فصیح الملک از صاحب کراں شد داغ ہند
بلبل شیراز وا انلم طوطی ہندوستاں
شد خجل چوں بلبل ہندوستاں شد داغ ہند
ہمچو شاگردانش گشتن استادان جہاں
چوں بحکم شاہ استاد جہاں شد داغ ہند
از زبان دانا دہلی تابیندم باد ذوق
کس با عز و شرف گشتہ چناں شد داغ ہند
چوں افق در لکھنؤ ایں مژدہ خوش گوش زد
گفتگو تاریخش کی استاد جہاں شد داغ ہند
(۱۸۹۲ء)

تاریخ نکالنے کا فن

تاریخ نکالنے کا فن عربی وفارسی شاعری سے اردو شاعری میں آیا۔ عام طور سے لوگ ایسا نام رکھ دیتے ہیں جس کی حروف تہجی (الفابیٹ) کے اعداد نکالنے کے بعد تاریخ پیدائش یا وفات نکل آتی ہے۔ اردو شعراء نے اس فن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور عظیم ہستیوں کی تاریخ پیدائش اور وفات اور بادشاہوں نوابوں کی زندگی کا اہم واقعات کی تاریخیں نکالی ہیں۔ بعض تاریخیں شعری اور فنی لوازمات سے پوری طرح سجی ہوئی ہیں۔ یہ ایک مشکل فن ہے کیونکہ اس میں شاعر کو مختلف کیفیات اور مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ افق لکھنوی نے بہت سے اصناف کی طرح اس صنف میں بھی کامیاب تجربہ کئے ہیں اور اہم واقعات کی تاریخیں نکالی ہیں جو تمام شعری اور فنی اعتبار سے کامیاب ترین تاریخیں کہیں جاسکتی ہیں افق لکھنوی نے جو تاریخیں نکالی ہیں ان میں سے کچھ اہم تاریخوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ افق لکھنوی نے سب سے پہلی تاریخی اپنے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا کے نوبستہ کے مکان میں رام استھان یا ٹھاکر دوار کی سنگ بنیاد رکھے جانے پر کہی تھی۔ یہ اشعار آج بھی نوبستہ کے مکان کے رام استھان پر لگے سنگ مرمر کے کتبہ پر نقش ہیں:

میرے اخ معظم جو ہیں تمنا تاج سر
ہے یہ رام استھان ان کی یہ دوامی یادگار
ہاتف غیبی افق کے ساتھ درشن کے لئے
کہتا آیا اے سیارگھویر لکشمن تین بار
(سنوت ۱۹۴۱)

افق لکھنوی نے اپنے مشہور شاہکار 'یک قافیہ رامائن' کے اختتام پر بھی تاریخ کہی ہے جس سے رامائن 'یک قافیہ' کے مکمل ہونے کی تاریخ نکلتی ہے۔ شعر اس طرح ہے:

کر قلم بند اے افق اب مصرعہ تاریخ سال
رام رگھوکل کیتو، رگھوکل، بھانو، رگھوکل، چندرما
۱۸۸۵ء

مشہور عالم اور ماہر تعلیم اور کئی مشہور تعلیمی اداروں کے بانی اور سماجی بہبودی کے لئے اپنی زندگی صرف کر دینے والے کائستھ قوم کے سرپرست منشی کالی پرشاد کل بھاسکر کی تاریخ وفات افق نے اس طرح نکالی ہے:

کائستھ پاٹھ شالہ کا بانی نامدار
ناہید قوم، نیّر قوم آفتاب قوم
کائستھ کمپنی کا مربی و سرپرست
بہرام قوم وحاتم والا خطاب قوم
دنیائے بے ثبات سے اس سال اٹھ گیا
نظرِ کسوفِ مرگ ہوا ماہتابِ قوم
سونا ہوا ہے خانہ ہمدردئ عوام
بے سرپرست ہوگئے کار ثوابِ قوم
کلک افق نے مصرعہ تاریخ یہ لکھا
ہے ہے غروب آج ہوا آفتابِ قوم
(۱۸۸۶ء)

افق ۱۸۸۹ء میں نظام حیدر آباد کے وزیر مہاراجا گردھاری پرشاد باقی کے ذریعہ مدعو کئے جانے پر حیدر آباد دکن گئے تھے۔ جہاں میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد نے انکو ملک الشعراء کا خطاب عطا فرمایا۔ اور صیغہ سرپیچ دے کر نوازا۔ اس سلسلہ میں جو نظم افق نے کہی، اس کے بھی آخری شعر میں انہوں نے تاریخ کہی ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار پیش ہیں۔

میر محبوب علی خاں شہ جمجاہِ دکن
بڑھ کے دارا و سکندر سے ہے جنکا پایہ

شہ جمجاہِ نے کی ذرہ نوازیٔ مجید
قیمتی ضیغہ و سر پیچ عطا فرمایا
شکریہ کیا ہو ادا شاہِ دکن کا مجھ سے
وہ ہیں خورشید فلک میں ہوں زمیں کا سایہ
خاموشی کو حدِ تعریفِ ستائش کرکے
سال تاریخ سے کرتا ہوں فسوں تر پایہ
لب الہام سے پڑھتا ہوں یہ ایثار افق
میں نے ہے ضیغہ و سرپیچ مرصع پایا
(۱۸۸۹ء)

افق نے ۱۸۹۲ء میں داغ دہلوی کے عطائے خطاب کی تقریب میں جو قصیدہ فارسی زبان میں کہا ہے اور ۱۸۹۳ء میں میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد دکن کی سالگرہ کے موقع پر اور ۱۸۹۳ء میں ہی مہاراجہ کرشن پرشاد شاد وزیر اعلیٰ حیدرآباد کی تاریخ میں جو قصیدے قلم بند کیئے ہیں انکے مقطع میں بھی تاریخ نکالی ہے۔

ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کو بھی افق نے بہت شاعرانہ انداز میں قلم بند کیا ہے، ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کے سلسلہ میں ۱۹۰۳ء میں ہوئے دہلی دربار کی دو تاریخیں بھی نکالی ہیں جو اس طرح ہیں:

کیا دہلی میں جشنِ تاج پوشی لارڈ کرزن نے
ہوا عظمت سے جس کی گرد جشنِ جم کا افسانہ
ہے رونق اور ہی اور رنگ آرائی سے جلسہ کی
ہے بزم جم میں صہبا ریز کے خسرو کا پیمانہ
افق نے انعقادِ جشن کی تاریخ یوں لکھی
کہ رسم تاج پوشی میں ہوا دربار شاہانہ
(۱۹۰۳ء)

***

تاج پوشی کا جو یہ دربار دہلی میں ہوا
بول اٹھی روحِ سلیماں واہ کیا ہی جشن ہے
لکھ دیا کلکِ افقؔ نے مصرعہ تاریخ سال
امپرر ایڈور ہفتم کا یہ شاہی جشن ہے
(۱۹۰۳ء)

افق کی نثر نگاری

افق لکھنؤ کے جس دور اور دبستان کے ادیب ہیں اس دور میں تین طرح کی نثر لکھی جاتی تھی۔ ایک رجب علی بیگ سرور کی نثر نگاری تھی جو مسجع، مقفیٰ ہوتی تھی۔ یہ پرانے زمانہ کی بوجھل اسلوب کی نثر تھی جس میں عربی فارسی الفاظ اور جملوں کی کثرت تھی۔ سرور آسان اسلوب کو پسند نہیں کرتے تھے اور فارسی اسلوب پر منعقد تشبیہات سے بھری ہوئی اردو تشبیہات سے بھری ہوئی اردو نثر کو ہی اعلیٰ نثر مانتے تھے۔ وہ آسان اردو نثر کی ہنسی اڑاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آسان زبان میں لکھی میر امن کی مشہور تصنیف باغ و بہار کے جواب میں اپنا عظیم شاہکار ''فسانہ عجائب'' پیش کر اپنی نثر نگاری کے فن کا سکہ جمایا۔ سرور کی نثر نگاری پرانے زمانے کی تھی جس میں تصنع یا بناوت کا غلبہ ہے اور جس کو لکھنے سمجھنے کے لئے عربی اور فارسی کی اچھی قابلیت ہونا ضروری تھا۔ یہ نثر نگاری مشکل قسم کی ہے جو عام قاری کے افہام سے باہر کی بات ہے۔ پھر بھی سرور کا کمال یہ ہے کہ مشکل زبان کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے زبان و بیان کی چستی اور روانی کو قائم رکھا۔ انہوں نے جس منظر کا بیان کیا جیسے تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ فسانہ عجائب کی زبان اور اسلوب کی ایک مثال دیکھئے:

''جس وقت زاغ شب نے بیضہائے انجم آشیانے مغرب میں چھپائے اور سیدان سحر خیز دام بردوش آئے اور سی مرح زریں ذباح طلبال غیرت لعل قفس مشرق سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گذری سویرا ہوا بڑا بھائی اٹھا۔ چھوٹے نے وہ کباب جو پسماندۂ شب یعنی رات کو بچے رکھے تھے وہ نوش کر گیا ور حال کچھ نہ کہا۔ دو گھڑی دن چڑھے جب لعل اگلا تب سمجھا ہم نے بہت تدبیر کی مگر سلطنت بڑے بھائی کی قسمت میں تھی۔ پھر وہ لعل بطریقہ نذر روبرو لایا اور رات کا افسانہ مفصل سب کہہ سنایا۔ اللہ کی عنایت سے جلد آپ کو سلطنت حصول ہو۔ یہ نظر غلام کی قبول ہو۔ اس کو اس کی سعادتمندی سے خرسندی حاصل ہوئی۔''

دوسری نثر نگاری میر امن دہلوی اور انشاء اللہ خاں انشاء کی تھی جو آسان زبان اور

سلیس اسلوب میں ہوتی تھی۔ میر امن نے قصہ چہار درویش کا ترجمہ باغ و بہار کے نام سے (۱۸۰۱ء) اور ''اخلاق محسنی'' کا ترجمہ ''گنجینۂ خوبی'' کے نام سے آسان اردو میں کر کے اردو میں نثر میں اپنا خاص مقام بنالیا۔ میر امن کی نثر نگاری میں سلاست اور روانی ہے۔ انہوں نے محاوروں کا بھی اچھا استعمال کیا ہے۔ وہ بیان کیئے گئے قصوں کے ذریعہ سماجی اور اخلاقی قدروں کی جڑیں پختہ کرنے میں بھی کامیاب رہے جس کی وجہ سے اردو ادب میں اپنی مخصوص جگہ بنا سکے۔ انہوں نے سنسکرت اور اردو کے الفاظ بھی اپنی نثر میں بہت خوبصورتی سے پروئے ہیں۔ باغ و بہار کی زبان اور اسلوب یعنی شیلی کا ایک نمونہ دیکھئے:

''جب رخصت ہونے لگا تو بہن نے ایک بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے مرصعہ تواضع کیا اور ایک خاصدان میں مٹھائی بھر کر ہرنے میں لٹکا دی اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا دہی کا ٹیکا میرے ماتھ پر لگایا۔ آنسو پیکر بولی، سدھارو تم کو خدا کو سونپا۔ پیٹھ دکھا کر جاتے ہو اسی طرح منہ دکھاتے جلد آنا۔ میں نے فاتحہ پڑھ کر کہا اللہ تمہارا بھی حافظ ہے میں نے قبول کیا۔''

سید انشاء اللہ خاں انشا عربی اور فارسی کے بڑے ادیب تھے، اور ہندوستان کی کئی اور زبانوں پر بھی انہیں عبور حاصل تھا، پھر بھی انہوں نے آسان اردو نثر میں ہی گلکاریاں کیں۔ ان کی ''رانی کیتکی'' کی کہانی جس کی اردو ادب اور ہندی ادب دونوں میں خاص اہمیت ہے، پوری بھاکھا ٹھادیٹھ الفاظ میں لکھی گئی ہے اور اس میں عربی فارسی اور سنسکرت کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

انشاء اللہ خاں کی رانی کیتکی ادے بھان چرت، کہانی کے بارے میں کہا گیا ہے:

''یہ وہ کہانی ہے جس میں ہندی چھٹ، اور کسی بولی کا میل ہے نہ پُٹ۔''

کہانی میں استعمال کی گئی نثر کا ایک نمونہ پیش ہے:

تب کنور نے جی مسوس کے ملولہ کھاں سے کہا ''اتنی رکھائیان نہ کیئے میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک ایکپیڑ کی چھاؤں میں اوس کا بچاؤ کر کے پڑ رہوں گا۔ بڑے تڑکے دھندھلکے میں اٹھکر جدھر کو منہ پڑے گا چلا جاؤں گا۔ کچھ کسی کا لیتا دیتا نہیں۔ ایک ہرنی کے پیچھے سب لوگوں کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا تھا، کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا تھا؟ جب تلک اجالا رہا، اس کے

دھیان میں تھا جب اندھیرا چھا گیا اور جی بہت گھبرا گیا ان امرائیوں کا آسرا ڈھونڈھ کر یہاں چلا آیا ہوں۔"

تیسری نثر نگاری ان دونوں کے بیچ کی تھی جو نہ بہت زیادہ مسجع ہوتی تھی اور نہ بہت زیادہ آسان۔ ایسی نثر کے نمونہ کے طور پر غالب، سرسید احمد، آزاد اور حالی کی نثر لی جا سکتی ہے۔ سرسید کی زبان سلیس صاف اور سادی ہے۔ لیکن روانی سے پُر ہے۔ انہوں نے مشکل مضامین کو بھی آسان زبان میں بیان کیا ہے۔ ان کی نثر کا نمونہ 'تہذیب الاخلاق' میں لکھے ان کے ایک مضمون 'رسم ورواج' سے لیا گیا ہے:

"جو رسوم و عادات کی بمقتضائے آب وہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہے ان کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے انہیں سکھائیں ہیں جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر صرف ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے۔ مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے، پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے۔"

آزاد کی نثر نگاری بہت دلکش ہے۔ انہوں نے نثر میں استعارات کا استعمال بھی سب سے پہلے کیا ہے۔ ان کی نثر کا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

"ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق :

جب وہ صاحب کلام عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا جن کی خوشبو شہرت عام بنکر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے۔ ملک الشعراء کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے ظغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ اجڑ گیا۔ نہ ہم سفیر رہے نہ ہم داستاں رہے نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اس زبان کو لئے ٹکسال تھا۔"

حالی کی نثر نگاری آزاد کی نثر نگاری سے ملتی جلتی ہے۔لیکن حالی نے زیادہ منطق سے جڑے ہوئے مضامین پر لکھا ہے جس کی وجہ سے لازمی طور پر ان کی نثر میں وہ رنگین بیانی نہیں ہے جو آزاد کے یہاں پائی جاتی ہے۔

اس دور میں ایسے نثر نگاری بہت کم مل پائیں گے جن کو تینوں اسلوبوں میں یکساں کمال حاصل ہو۔

افق کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ نثر کے تینوں اسلوبوں میں خامہ فرسائی کرنے کی قدرت رکھتے تھے، اور اتنا ہی نہیں موضوع اور مقام کے اعتبار سے ان کا نثری اسلوب بدلتا رہتا تھا۔افق کا دستیاب نثری ادب تقریبا چھ ہزار صفحات پر محیط ہے۔ جو انکے آٹھ ناولوں کے علاوہ ہیں۔اور یہ معلوم نہیں ہے کہ اسکے علاوہ اور کتنے صفحات ہونگے جو ہندوستان کے قدیم کتب خانوں میں محفوظ ہیں، یا ناپید ہوگئے ہیں۔افق کی نثر کی جو سب سے اہم خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ محاوراتی زبان کے ساتھ یا تھ جملوں کا دروبست ایسا ہے کہ ایک ایسی نثر کا وجود عمل میں آ گیا ہے جو اسی کیٹیگری میں آئے گی۔ جیسے سرسید، آزاد، حالی، شبلی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نثر نگاریاں ہیں۔افق لکھنوی کی نثر نگاری کا جائزہ اگر اس حیثیت سے لیا جائے تو ایک نئی دریافت ہوگی، اور اردو ادب کے عظیم نثر نگاروں کی فہرست میں ایک ایسے نام کا اضافہ ہو جائیگا جو اردو ادب کے مؤرخین اور راتبین کی نظروں سے اب تک اوجھل رہا۔یقیناً افق کی نثر نگاری قابل مطالعہ ہے اور یہ بات اس دعویٰ کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا کوئی شاہکار کوئی طالب علم پڑھ لے تو اس کو اردو ادب کے رموز واسرار سے آ گہی ہو جائے گی۔

افق کی نثر نگاری کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اصطلاحی لفظوں کو ایسا استعمال کر دیا ہے کہ وہ اردو زبان کا حصہ اس طرح بن گئے ہیں گویا ان کے استعمال کا ایک لمبا سفر ہو، دورِ حاضر میں یہ بات بہت زور وشور سے اٹھائی جارہی ہے کہ ہندی اور اردو کی سرحدوں کو ملا دیا جائے یہ کام افق لکھنوٗ نے بہت پہلے ہی کر دیا تھا کہ ہندی کے لفظوں کو انکے ہی معنوں میں اردو میں استعمال کیا جائے، جبکہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ترجمہ پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ہندی اصطلاحی الفاظ کو انہی معنوں میں استعمال کر دینے سے افق دو مطلب حل کر دینا چاہ رہے تھے، ایک تو یہ کہ ترجمہ کرنے سے وہ معنی اور مفاہیم ادا نہیں

ہو سکتے جو ان لفظوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اور دوسرا یہ کہ اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا، اگر دوسری بات کو زبان کے اعتبار سے تسلیم کرلیا جائے تو یقیناً افق کی یہ بڑی خدمت ہے جس سے اردو زبان ہمیشہ گراں بار رہے گی۔ افق کے نثری اسلوب کا دور وار جائزہ لینا انکی نثر نگاری کے فن کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

افق کی پہلی نثری تصنیف

افق کی پہلی نثری تصنیف ''آئینۂ قواعد'' ہے۔ جو ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کا یہ ابتدائی نثری کارنامہ ہے جس کی حمد یہ عبارت تو مسجع مقفع ہے لیکن جہاں قاعدے سمجھائے گئے ہیں اس کی نثر عام فہم ہے۔ نثر کا نمونہ یہ ہے:

''ایسے ضابطہ داں و قادرِ زمیں و زماں کی حمد کے بعد یہ اضعف العباد دوارکا پرساد افق لکھنوی خدمت نکتہ سنجان عالی وقار میں باکمال ادب عرض پرداز ہے کہ اس ہیچ می رضا نے فقط ملک کی ضرورت تعلیمی کو پورا کرنے کے لئے جس کا زیادہ تر اہل زبان کی قواعد، زبان دانی پر دار و مدار ہے، اس رسالہ کو مستند کتابوں سے تالیف کیا ہے اور اس کے جملہ مطالب کو ایک آسان زبان میں اور اس کے قواعد کو ایک عام فہم طرز میں بیان کیا ہے جس کے ذریعہ سے امید کی جاتی ہے کہ مدارس سرکاری کے تمام طلبہ فائدۂ کامل اٹھا سکتے ہیں اور خاص و عام بھی جن کو حصول علم کی فکر ہے، اس رسالہ کو اپنا معلم بنا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ رسالہ نفع رسانی عام میں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں قاصر نہ رہے اور اپنی اشاعت کے ذریعہ ہماری یادگار اور علمی کاروبار کے فروغ کا باعث ٹھہرے۔''

اس اقتباس سے افق کی نثر نگاری کے دونوں نمونے سامنے آجاتے ہیں۔ جہاں انہوں نے حمد باری پر قلمطرازی کی ہے وہاں مسجع مقفع عبارت کا استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حمد باری عالمانہ بحث ہے اس لئے اس میں ایسے لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے جو ان کی عالمانہ صلاحیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کتاب کی غرض و غایت اور افادیت کو بیان کیا ہے وہ عبارت دور حاضر کی زبان سے بالکل دور نہیں ہے۔

رامائن بالمیکی

تاریخی حوالے کو نظر انداز کرتے ہوئے افق لکھنوی کے عظیم شاہکار رامائن بالمیکی کی نثر نگاری کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ رامائن بالمیکی جو ۱۰۶۸ صفحات کی کتاب ہے، لسانی فنی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی زبان مسجع اور مقفیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس عام فہم اور رواں ہے۔ کہیں کہیں جب افق کا شاعرانہ جذبہ موجزن ہوتا ہے نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ اسی کی مد نظر ان کی اس کتاب کو جائزہ لیا جا رہا ہے۔ رامائن بالمیکی کی شروعات حمد سے ہوتی ہے۔ حمد ان کی نثر میں بھی ہے اور نظم میں بھی۔

افق کی جو نثر حمدیہ ہے وہ مسجع مقفع ہونے کے ساتھ ساتھ تشبیہات سے پُر ہے۔ نمونہ کے طور پر یہ اقتباس پیش ہے:

''گل چنان و گل مع مانی! نقل بندوان گلشن نکتہ دانی! آپ نے گلزار کائنات کی سیر، چمنستان معلومات کی گلگشت میں بوستان ندرت خیابان قدرت کے لاکھوں درخت ثمر دار شجر پُر بہار دیکھے ہوں گے ان کے پتے پتے بوتے بوٹے کے رنگوں نگار سے آنکھوں ہری کی ہوں گی۔ ان دوروزہ بہار عارضی کی سبزہ زاروں کی پر فریب نظر فریبی اور دلفریبی کے واسطے نگار خانہ ارجنگ سے کم نہیں۔ پتہ پتہ آنکھیں ہری اور طبیعت گلزار کرنے میں ید طوبیٰ رکھتا ہے۔ سرو آزاد ہے یا شمشاد، ادھر صورت نظر آئی کہ سرو قدان سمن، فام و شمشاد، قامتان گل اندام کی تصویر آنکھوں میں گھر کر گئی۔ سمن ہے یا نسترن مہیک مہک کر گلے آزار و رخسار سے خوشبو دماغ میں بھر گئی۔ سنبل نے گیسوئے مشکیں زلف عنبری کا نظارہ دکھا کر دل کو دام محویت میں گرفتار کیا۔ نرگس نے مردم دیدہ کو چشم سرمگیں و دیدہ شرمگیں سے دو چار کیا۔ سوسن نے غنچہ دہنوں کے لب گلگوں کی اوواہٹ دکھادی۔ اناروں نے غنچہ لبوں کی کھلی ہوئی بتیسی کی یاد دلادی۔ دل تو دل اک نگاہ غلط انداز بھی خوشہ خوشہ پر شیفتہ ہو جاتی ہے۔ نگاہ تو نگاہ کلی کلی اچٹی ہوئی طبیعت کو بھی اپنا فریفتہ بناتی ہے۔ مگر یہ نظارا کیا ہے، چار دن کی چاندنی۔ یہ تفریح کیا ہے۔ دوروزہ بہار، ایک طلسم۔ پریوں کے چھلاوے کی شباہت ہیں اس کو ذرا بھی قیام نہیں۔ شرر کو ذائقہ حیات ہے مگر اس میں لطف

زندگی کا نام نہیں۔"

یہ اقتباس افق کی مسجع مقفع عبارتوں کی جھلک ہے جس میں اردو کلاسیکل شاعری کی تقریباً اہم الفاظ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ پڑھنے یا سننے میں بار نہیں گذرتا ہے لفظوں کی بندش میں قاری یا سامع کھو جاتا ہے۔

'بالمیکی رامائن' سے ہی لئے گئے افق کی آسان عام فہم اور سلیس زبان کو نمونہ بھی دیکھئے:

"وشوامتر۔ آپ نے جو کچھ کہا میں نے خاموشی سے سنا، آپ پہلے اپنے آخری سوال کا جواب سن لیجئے پھر اور راگ مالا ہوگا۔"

یہ زبان موجودہ دور کے مطابق آسان عام فہم اور محاوراتی ہے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جیسے راجہ دشرتھ کا یہ مکالمہ "آپ کا کہنا صحیح ہے، ممکن ہے کہ راون میرے نام سے کانپتا اور رعب سے تھرتھراتا ہو، مگر میں سچ کہتا ہون کہ راون کا مقابلہ کرنا تو درکنار، اگر اس کی صورت دیکھ لوں تو روح ستر کوٹھوں میں چھپے۔"

افق کی زبان موقع و محل کے اعتبار سے بدل جاتی ہے یہ ان کے ایک عظیم فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ اجودھیا کی تعریف میں انہوں نے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

"شری لوکش جی کا بلبل نطق نغمہ زن ہوا، طوطی زبان شکر شکن ہوا کہ دریائے سرجو کے کنارے ایک پر فضا و فرحت بزکش مقام ہے جسکا نام کوشل دیش ہے۔ اس کے مشرق جنوب کی طرف کوشلپور بستا ہے جہاں کنچن ہی کنچن برستا ہے۔ یہیں ساحل دریائے سرجو پر ایک دارالسلطنت معدنیات سیم و زر سے مامور ہے اجودھیا کے نام سے مشہور ہے، اجودھیا کے حالات پوشیدہ نہیں۔ عجب پاک مقام ہے اور واہ واہ کیا پوتر دھام ہے۔"

اس اقتباس میں محل کے اعتبار سے زبان بدل گئی ہے جس کو عام قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

رامائن بالمیکی میں افق لکھنوی نے کہیں کہیں نثر میں شاعری کی ہے۔ افق کی شاعرانہ نثر نگاری کی ایک مثال دیکھئے جس میں فنکار نے اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہوئے رام کے نام کرن کے سلسلہ میں کہا ہے:-

''راجہ دشرتھ کے بارگاہ عالم پناہی شہنشاہی میں شادیانے بجنے لگے۔جشن عظیم کا تیاری ہوئی۔ زر و جواہر، زیور وخلعت انعام واکرام سے سب مالا مال ہوگئے۔ گئو دانوں کا تانتا لگ گیا۔ پیدائش کے تیرہویں دن گرہوں اور برہموں کی پوجا ہوئی۔ وِدوان پنڈتوں اور شاستر داں برہمنوں نے ویدرچاؤں اور وید منتروں سے سب جنم سنسکار کیئے۔ وشست جی نے مہارانی کوشلیہ کے نورنظر کا نام رام رکھا۔ وجہ یہ بتائی کی ہر چیز میں سری رام چندر جی کے انوار قدرت کا ظہور ہے۔ یہ خورشید میں ہیں، ماہ میں ہیں، کوہ میں ہیں، کاہ میں ہیں، گل میں یہی ہیں، بو میں یہی، رنگ میں یہی، ہر سنگ میں یہی، شررسنگ میں یہی، یہی بحر میں، یہی نہر میں، یہی لہر میں، یہی آب میں، یہی خاک وآتش و باد میں، یہی رعد و برق سحاب میں، یہی مہر و ماہ سپہر میں، یہی رنگ بوئے گلاب میں، یہی جام اہل خروش میں، یہی جوش عہد شباب میں۔ جس طرح چاند کی نور افشانی سے کلیجہ کو ٹھنڈک پہونچتی ہے اسی طرح سری رام چندر جی کی جوہ افروزی سے سب کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑگئی ہے بس یہی نام موزوں ہے۔''

افق کی شاعرانہ نثر نگاری کی ایک اور خوبصورت مثال دیکھئے جس میں راون کی اشوک واٹیکا میں قید سری سیتا کی اس کیفیت کا بیان ہے جوان پر سری رام چندر کے بھیجے دوت سری ہنومان کے منہ سے اچانک رام نام سننے کے بعد طاری ہوئی تھی۔

''جس وقت پرں ندے چہک اٹھے اور سیتا جی کے کانوں میں تسلی بخش آواز پہونچی جانکی جی کے بائیں اعضا دفعتاً پھڑکنے لگے۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔ کچھ وجد کا سا عالم ہو گیا، نظروں کے سامنے سری رام چندر کی تصویر پھرنے لگی۔ یکایک وہ چونک سی پڑیں اور آنکھیں کھلی تو دوپٹہ کندھے سے سرک گیا۔ گھونگھٹ کھل جانے پر وہ سمجھیں کہ شگون نیک ہے۔ سری رام چندر جی کے ملنے میں اب دیر نہیں۔ اس خیال نے ان کے چہرہ پر خودشی کی سرخی دوڑا دی اور غمزدہ حالت اس طرح بدل گئی جس طرح چاند گہن سے چھوٹ جاتا ہے۔''

یہ اقتباس شاعرانہ نثر کی بہترین مثال ہے۔ اس میں سیتا جی کی اس نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے جوان کے اوپر رام نام سننے کے بعد طاری ہوئی تھی۔ یہ فطری بات ہے کہ ایک ایسی خاتون جو اپنے شریک حیات کو اور اس کی عزت وعفت کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہو، اور اس کی محبت میں جان دینے کا فیصلہ کر چکی ہو، اور اس کو کہیں سے امید کی کوئی ایسی کرن

نظر آ جائے جو حیاب بخش اور اپنے رفیق حیات سے ملنے کی ہو تو اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اسی کیفیت کو افق لکھنوی نے اپنے نثری پیرائے بیان میں ایسا بیان کر دیا ہے کہ شاعری کی منزلیں نثر سے ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

افق کو آسان ترین زبان لکھنے پر بھی قدرت کامل حاصل تھی۔ جہاں ان کا بیان آسان اور سادہ نثر میں اس طرح ڈھل کر آتا ہے کہ قاری کو افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ زبان کا بھی لطف ملتا ہے۔ دیکھئے راون اپنے مشیروں سے کہہ رہے ہیں:

آپ سے بڑھ کر میرا کوئی خیر اندیش و جاںنثار نہیں اس لئے آپ میری بہتری کی رائے دیں۔ یہ سمجھنا فضول ہے کہ سری رام چندر کا لشکر سمندر کو عبور نہیں کر سکتا۔ ان میں وہ قدرت ہے کہ چاہیں تو سمندر خشک کر دیں۔ ساگر راجہ سگر کی اولاد کا کھودا ہوا ہے، ضرور اپنے بانیوں کی رعایت کریگا۔ اگر رام چندر جی ادھر آ گئے تو بری ٹھریگی۔ ذرا خوب سوچ و چار کر مشورہ دیجئے کہ کیا کیا جائے۔ بانروں سے ہارنا لنکا بھر کے لئے کلنک کا ٹیکا ہوگا۔" یہ اقتباس افق کی آسان نثر کی بہترین مثال ہے اور شاید انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایسی ہی نثر کبھی بہترین ادب کا معیار پائے گی۔

منظر نگاری

افق جہاں نثر میں منظر نگاری کرتے ہیں وہاں لفظوں کی بندش اور تشبیہات کے استعمال سے ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ قاری کی نظروں کے سامنے وہ مقام یا باغ مجسمہ ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ چترکوٹ کا ایک منظر دیکھئے:

"سویرا ہوا، سورج نکلا، ادھر ادھر سیر کرتے ہوئے چترکوٹ کی طرف چلے۔ گلگشت سے دل باغ باغ ہوتا تھا۔ سبزہ زار کی بہا آنکھوں کو طراوت دیتی تھی۔ برگ و ثمر سے طبیعت ہری ہو جاتی تھی۔ غنچہ و گل کا کنول کھلا جاتا تھا۔ کہیں مور ناچتے تھے کہیں ہنس چہلیں کرتے تھے۔ مرغان خوشنوا کی میٹھی میٹھی بولیاں دل لبھاتی تھیں۔ جو نظارہ تھا دل فریب تھا۔ یہی کیفیت سبزہ زار اور لطف بہار دیکھتے ہوئے رام چندر جی چترکوٹ پر پہنچے۔ عجب پر فضا مقام

نظر آیا۔ جھرنوں سے صاف شفاف پانی کی روانی اور سبزہ زار کی دل آویزی نے اس مقام پر انکے قدم جکڑ لئے۔ وہ وہاں ٹھہر گئے اور ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دل بے اختیار ہو گیا۔ باغ بان قدرت کی گلکاریاں دیکھ کر طبیعت بول اٹھی کہ اس جگہ سے بڑھ کر اور کون مقام ہوگا جہاں اہل دنیا آرام سے رہ سکتے ہوں۔"

یہ اقتباس منظر نگاری کی بہترین مثال ہے جس کو پڑھنے کے بعد چتر کوٹ کے اس پاکیزہ مقام کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے جہاں رام چندر جی نے اپنی زندگی کے کچھ دن گذارے تھا۔ اس مقام کی منظر کشی میں فنکار نے وہ ساری چیزیں پیش کر دی ہیں جو ایک منظر کی تصویر بنانے کے لئے ضروری ہیں۔

افق جو کچھ بھی لکھتے ہیں وہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ زبان کی روانی ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ہوا کے خوشگوار جھونکے آرہے ہیں جن میں لفظوں کا استعمال موقعہ کی مناسبت سے اور جو بیان کرنا چاہتے یں اس کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہندی روایت کے بیان کرنے کے لئے وہ کبھی کبھی ایسے لفظوں کا استعمال کرتے ہیں جو روانی برجستگی کے ساتھ ساتھ ایک پورے فلسفہ کو اپنے دامن میں سمیٹے رہتا ہے۔ یہ ان کے بڑے ادیب ہونے کی دلیل ہے کہ انہوں نے فلسفۂ حیات و کائنات کو اردو، ہندی، فارسی اور عربی کے لفظوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں بڑے بڑے ادیب لڑکھڑا جاتے ہیں۔ افق لکھنوی جس بھی فلسفہ کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کو برجستہ اور ایسی رواں زبان میں بیان کرتے ہیں کہ قاری پڑھنے پر یا سامع سننے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کی رواں زبان کا ایک چھوٹا سا اقتباس پیش ہے جس میں راجہ جنک کے دربار کی منظر کشی کی گئی ہے:

"صبح کا سماں ہے، آفتاب نے چہرے کی چمک دمک دکھا کر نقرئی کرنوں سے چاروں طرف نور برسانہ شروع کر دیا۔ راجہ جنک نسیم کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کا مزہ لیتے مرغان خوش الحان کی میٹھی میٹھی رس بھری بولیاں سنتے دربار دربار میں رونق افروز وہئے۔ ایک روز پہلے ہی عظیم الشان دربار کی خبریں مشہور ہو گئیں تھیں اس لئے کیا عمائد کیا اراکین، کیا والیان دربار، کیا روئے نامدار، سب کے سب جمع ہونے لگے اور ایک بھیڑ نظر آنے لگی۔ راجہ جنک نے وشوامتر کی طلبی کو امرائے دربار بھیجے۔ وہ سری رام چندر اور سری

لکشمن کو لئے ہوئے محفل سپہر مشاکل میں رونق افروز ہوئے۔ فرائض پیشوائی و استقبال مراسم، تعظیم تکرین ادا ہوئے۔ آنکھیں بچھ گئیں، سب کو پلکوں پر جگہ ملی۔ راجہ جنک ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔''

افق کے نثر کی سلاست روانی اور برجستگی کا ایک اور نمونہ پیش ہے:

''ان داتا میں ناستک نہیں۔ ایشور گواہ ہے کہ یہ گفتگو بدنیتی سے نہ تھی۔ آپ بھرت جی کی درخواست سنی ان سنی کئے دیتے تھی، اسی لئے میں نے آپ کو واپس لے چلنے کے واسطے تقریر کا یہ پہلو اختیار کیا۔ آپ ادھرم خیال فرماتے ہیں تو میں معافی مانگتا ہوں۔ میری غرض اصل یہ تھی کہ کسی طرح آپ کا قلب پھیروں۔ اگر ادھر کا ذرا بھی خیال ہو تو روسیاہ۔''

اس اقتباس میں لفظوں کی بندش اور طرز ادا سے بڑے بڑے معانی و مفاہیم کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ زبان کی روانی اور برجستگی پورے طریقہ سے جلوہ نماں ہے۔ قاری لفظوں کے پورے پورے مفاہیم سمجھنے کے ساتھ ساتھ بیان سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔

ہندی الفاظ کا استعمال

اردو کے ادبا اور شعراء نے ہندی کے وہ الفاظ جو مشترکہ نہیں ہیں ان کا استعمال نہیں کیا ہے۔ چونکہ افق لکھنوی ہندوستانی روایات کی واقفیت کے ساتھ لفظوں کی گہرائی اور گیرائی سے بھی واقف ہیں اس لئے وہ اپنی نثر میں ایسی مرصع کاری کرتے ہیں جس سے بیان میں کسی طرح کی رکاوٹ یا ٹھہراؤ محسوس نہیں ہوتا ہے۔

رامائن بالمیکی سنسکرت زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے، اس میں جو اصطلاحی لفظ ہیں وہ پوری روایت اور تہذیب رکھتے ہیں۔ فنکار کا کمال یہ ہے کہ ان لفظوں کو انہیں کے معنوں میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کا حصہ ہو گئے ہیں۔ فنکاری اسی کو کہتے ہیں۔ اگر ان لفظوں کا ترجمہ اردو میں اس وقت کر دیا جائے تو یہ کتاب زبان و بیان اور ادب کے اعتبار سے کمزور ہو جائے گی۔ اس لئے کے ہر لفظ کی اپنی تہذیب اور اپنا سفر ہوتا ہے اور اس لفظ کا ترجمہ اگر دوسری زبان میں کیا جائے گا تو وہ اپنی تہذیب اور سفر کی غمازی کریگا۔ جیسے درشن کا

ترجمہ زیارت سے، موہت کا ترجمہ فریفتہ سے، اندھانگنی کا ترجمہ اگر شریک حیات سے کیا جائے تو وہ معنیٰ اور مفہوم کبھی ادا ہی نہیں ہو سکتے جو ہندی ادب کے الفاظ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔اس طرح بہت سے لفظ پیش کئے جا سکتے ہیں جن کی اپنی تہذیب ہے۔مثال کے طور پر ہندی کے الفاظ سوارتھ، سفل، اردھانگنی، چرنوں کا پرتاپ، ممتا، گئودانوں کا تاتا، گرہن، برہمن، ودوان، پنڈت، شاستر داں، وید کی رچا، منتر، جنم سنسکار، گنوردھن، رشی، مہرشی، آنند، آکاش، برہملوک، بدھائی، رنیواس، نومی، تتھی، نکشتر، ترلوک، وراٹ روپ، بالک، اوتار، شبھ لگن، شبھ گھڑی، نام کرن، موہت، پرمدھرم، سکھ، انداتا، وراجمان، مون، مہاراجہ دھراج، پرسن، دیوپتر، کرم، ہون، آشیرواد، پرتاپ، نبھے جاتے، بھید، پرواہتائی، کشاسن،، سیوک، درشن، چرن، داس، سجن، پرتگیا، اکارتھ، شراپ، جس، آشا، ورت، آسن وغیرہ دیگر الفاظ لئے جا سکتے ہیں۔ان سبھی لفظوں کی اپنی الگ تہذیب ہے جن کو افق لکھنوی نے اسی طریقہ سے استعمال کر دیا ہے۔تعجب اس بات کا ہے کہ اس وقت تک ترجمہ نگاری کا فن اس طرح پروان نہیں چڑھا تھا جو آج کل ہے۔اردو ادب کے ذخیرہ الفاظ میں نئے لفظوں کو شامل کر کے افق نے اردو ادب کو یقیناً وسعت دی ہے۔

محاوراتی زبان

افق نے پوری بالمیکی رامائن کی زبان محاوراتی لکھی ہے۔ایسے محاورے جو لکھنو کے دبستان میں اس وقت جاری وساری تھے اور آج بھی بولے جاتے ہیں۔لیکن افق نے ان محاوروں کو اپنے انداز میں استعمال کر کے اپنے معنیٰ مراد لئے ہیں جس سے ان کی زبان ایسی محاوراتی زبان بن گئی جو اردو ادب میں اپنا ایک مقام اور آہنگ رکھتی ہے۔وہ اپنے اسلوب کے موجد اور خاتم ہیں۔ایسی محاوراتی زبان ان کے دور کے ادبا کے یہاں تلاش کرنا تو لاحاصل کو حاصل کرنا ہے۔ہاں بعد کے دور میں کچھ ادیب ایسے ضرور ملیں گے جن کے یہاں محاوراتی زبان ملتی ہے لیکن انکا تعلق ایک تو یہ کہ دبستان لکھنو سے نہیں ہے، دوسرا یہ کہ انکے ادب کا کینواس اتنا محدود ہے کہ افق لکھنوی کی ایک کتاب کے برابر بھی نہیں ہے۔مثال کے طور پر رامائن بالمیکی

کے ایک باب میں استعمال کئے گئے کچھ محاورے حسب ذیل ہیں:

"گھڑیاں گننا، ایک ایک پل پہاڑ، آنکھوں کی پتلی، شدہ شدہ سال پورا ہوا، شادیانہ بجنا، کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی، زبان دے چکے، سر آنکھوں پر، جنبش لب کے منتظر، باچھیں کھل گئی، جلال برسنا، سر کے بل چلنا، بات پڑ پڑنا، پتھر کی لیک، برہما کا اکشر، ناک میں دم، پانی پانی ہونا، نام بڑے درشن تھوڑے، اونچی دکان پھیکا پکوان، تیور پر بل پڑنا، منہ پر مہر لگا دی، کوسوں دور، قلع قمع ہونا، ، آنکھ اٹھا کر دیکھنا، گلے پڑنا، آنکھ کا تارا، کلیجے کا ٹکڑا، ہاتھ جھاڑ بیٹھنا، لچھن جھاڑنا، گھر کی راہ لینا، دل ٹوٹنا، چوں چرا کرنا، ڈوب مرنے کی بات، چلتے پھرتے نظر آنا وغیرہ۔

مہابھارت

مہابھارت سنسکرت زبان میں ۱۸ کھنڈوں کی ایک اہم قدیم اور تاریخی کتاب ہے جو نظم اور شلوکوں میں ہے اور جس میں کائنات کی شروعات سے لیکر کوروں اور پانڈووں میں ہوئی عظیم جنگ اور پانڈوو کے سورگ جانے تک کا تفصیلی بیان ہے ان اہم تاریخی واقعات کو ویدویاس جی نے ۱۸ پروں یا کھنڈوں میں بیان کیا ہے۔ مہابھارات کے بھیشم کھنڈ میں ۱۸ ادھیایوں میں کرشن کا ارجن کو دیا گیا وہ اپدیش بھی ہے جسے بھگوت گیتا کہتے ہیں۔

گیتا میں شری کرشن نے ارجن کو عبادت، عمل، فریضہ پرستش، بیراگ یا ترک دنیا کے اسرار ورموز کو سمجھاتے ہوئے فرض اور نہ کردنی کا فرق بتایا ہے۔ جس سے راغب ہوکر ارجن اپنے پھینکے ہوئے دھنش بان کو اٹھا کر اپنے چچا، بھائیوں اور استادوں سے دھرم یودھ (مذہبی جنگ) کرنے کو آمادہ ہوئے۔

مہابھارت میں کوروں اور پانڈووں کے بیچ کروچھیتر میں ۱۸ دن چلی عظیم جنگ کا آنکھوں دیکھا حال راجا دھرشٹر کے منتری سنجے کی زبانی بیان ہے۔ مہابھارت کا قصہ مختصر طور پر اس طرح ہے۔

راجہ بھرت کے ایک رکن اور گدی نیشن شانتنو ہستناپور کے راجہ تھے جن کے تین بیٹے تھے دوسرے بیٹے چترانگت کی موت کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا وچتر ویریہ گدی پر بیٹھا۔ وچتر ویریہ کی دو بیواؤں کے ویاس سے نیوگ سے ایک ایک بیٹا دھرشٹر اور پانڈے ہوئے دھرتراشٹر پیدائشی نابینا تھے اس لئے راج گدی پانڈو کو ملی کچھ وجوہات سے پانڈو دھرتراشٹر کو راج سونپ کر جنگلوں میں ریاضت کے لئے چلے گئے پانڈو کی دو بیویاں کنتی اور مادری سے پانڈو کے پانچ پتر یدھشٹر، بھیم، ارجن، نکل اور سہدیو ہوئے جو پانچ پانڈو کہلائے ادھر محل مین دھرتراشٹر کی پتنی گاندھاری کے سو پتر ہوئے۔ پانڈو اور مادری کے وفات کے بعد کنتی اپنے پانچوں پانڈو بیٹوں کو لیکر ہستناپور لوٹ آئی۔ پانڈو نے راج محل میں راجکماروں کے لئے لازم اور مناسب

ہر طرح کی تعلیم حاصل کی۔ پانڈو ذہانت اور شجاعت میں ہر طرح سے کورووں سے کہیں آگے تھے اس لئے دھرتراشٹر کا سب سے بڑا بیٹا دریودھن اور اسکے بھائی پانڈووں سے بہت حسد کرنے لگے جب راجیہ کا بٹوارا ہوا تو پانڈووں کو اندر پرستھ اور کورووں کو ہستناپور کا راجیہ ملا لیکن کورو و لگاتار پانڈووں کو نیست و نابود کرنے اور ان کا خاتمہ کر دینے کی کوشش میں لگے رہے۔ جوئے کے کھیل میں دریودھن اپنے ماما شکنی کی چال بازی سے پانڈووں میں ان سب سے بڑے بھائی یدھشٹھر سے جیت گیا اور یدھشٹھر جوے میں اپنا سارا راج پاٹھ، ملکیت، دھن دولت اور یہاں تک کہ پانچوں پانڈووں کی اکیلی بیوی دروپدی کو جوئے میں ہار گئے۔ یدھشٹھر کو بھائیوں اور دروپدی کے ساتھ بارہ سال تک جنگلوں میں رہنے اور ایک سال تک چھپے طور سے رہنے کی (اگیات واس) کی سزا بھی ملی۔ تیرہ برس جلاوطنی کی میعاد ختم ہونے کے بعد جب پانڈو واپس آئے اور انہوں نے راجیہ واپس مانگا تو دریودھن نے کہا کہ وہ انہیں سوئی کی نوک کے برابر بھی زمین نہیں دیگا جس کی وجہ سے مہابھارت کی جنگ ہوئی۔ دھرت راشٹر کے نہایت قابل بھائی وِدُر نے بہت سمجھایا کہ بھائی بھتیجوں کا حق مارنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے مگر دھرت راشٹر اپنی اولاد کی محبت میں اتنا گرفتار تھے کہ انہوں نے دریودھن کو جنگ کی صورت ٹالنے سے نہیں روکا۔ شروع میں پانڈوو میں سے ارجن کورووں سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے چچا زاد بھائیوں سے، رشتہ داروں اور گروؤں کی جان کی قیمت پر راج نہیں چاہتے لیکن شری کرشن نے انہیں یہ کہ کر جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا کہ دھرم، ایمان کی حفاظت کے لئے اور حق کے لئے کسی سے بھی جنگ کرنا انسان کا فرض ہے۔ جس سے اسے کسی بھی حالت میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ کرشن نے کہا کہ انسان کا کام صرف اپنے فرض کو انجام دینا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا یہ ایشور کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ کورووں اور پانڈووں کے بیچ ہوئی اس جنگ میں ہندوستان کے تمام راجا پانڈووں یا کورووں کی طرف سے لڑے اس لئے اسے مہابھارت کا یدھ کہتے ہیں۔

افق کا مہابھارت کا اردو ترجمہ بھی ان کا اہم کارنامہ ہے یہ پانچ ادھیایوں میں کیا گیا ہے اور اس ترجمہ کی زبان رامائن بالمیکی کے مقابلہ میں زیادہ آسان اور عام فہم ہے۔ نمونہ کے طور پر مہابھارت کے ترجمہ کا ایک اقتباس پیش ہے جس میں افق کہتے ہیں:۔

”یہ روداد زمانہ سرگذشت پاستانی ہے
شنیدہ کہنے کو دراصل آنکھوں کی زبانی ہے

اودھ کے مقدس مقامات میں نیم سار عرف نیم سارنیہ ضلع سیتاپور کا وہ متبرک تیرتھ ہے جہاں علائق دنیاوی کو لات مار کر ونسپتی کو دنیا کی نعمتوں پر ترجیح دینے والے رشی منی صرف ویدھ ونی سے زندگی کا مزہ لوٹتے اور روشن ضمیری کی غیبی طاقتوں سے لوک پرلوک بنانے والی عقلی اور عملی ایجادوں سے آریہ ورت کو روئے زمیں کا سرتاج بنائے ہوئے تھے۔ اسی کی ٹوٹی پھوٹی گھاس پھونس کی کرٹیوں میں جلنے والے ادھی کے چراغ میں قدرت نے وہ روشنی پیدا کر رکھی تھی جو دوپہر کے آفتاب اور پورنماشی کے چاند کی آنکھوں چوندھیاتی اور نور حقیقی میں اپنی تڑپ دکھاتی تھی۔ یہاں کے تپون کی خاک کے ذرہ آج بھی چشم حقیقت کے لئے آئینہ کا کام دیتے ہیں جن میں آج کل کی روشنی میں اپنا منہ دیکھنے والوں کو وہ مقدس صورتیں دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لینا پڑتی ہیں جن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صفر نے سارے برہمانڈ کو محدود کر کے وہ قدرت دکھائی کہ جرمنی کا مشہور اور معروف سنسکرت کا فاضل یورپ کی علمی لیاقت کا نفس ناطقہ مسٹر میکس مولر بھی انگشت بدنداں ہو کر پکار اٹھا کہ یورپ کی سب ایجادیں ہیچ، سائنس کے سارے کرتب واہیات، آریہ قوم کے ایک صفر کو کوئی سسائنٹفک ایجاد نہیں پہونچ سکتی۔ صرف ایک صفر نے وہ کرامات دکھائی ہے کہ خواہ کتنی ہی اعلیٰ سے اعلیٰ ایجادیں ہوئی ہوں مگر کوئی تعلیم یافتہ ملک کوئی صنعتوں حرفت کا بانی بھارت ورش کے سامنے سر اونچا نہیں کر سکتا۔ آج نیم سارن وہ نیم سارن نہیں جس کی آب وہوا کی تاثیر نے علوم وفنون کو نشو ونما دیکر چار دانگ عالم میں علمی روشنی پھیلائی۔ دنیا کے چپہ چپہ پر کسب فنون کے باغ لگائے۔ اب وہاں خاک اڑتی ہے۔ غول صحرائی کے صدائے بے ہنگام سے کانوں کے پردہ پھٹتے ہیں مگر ہم آج کل کا ذکر نہیں کرتے۔ اس زمانہ کی خبر دیتے ہیں جب دنیا کی تمام مقدس صورتوں کا نظارہ صرف اسی مقام پر دونون دنیا کی زندہ جاوید عظمتیں پیش نظر کرتا تھا اور جس کی برکتیں اس وقت بھی آریہ ورت کی خاک کو روئے زمین پر بسنے والوں کے لئے اکسیر بنائے ہوئے ہیں۔“

افق نے مہابھارت کے مقدمہ میں نیم سار کے حوالہ سے آریہ ورت کی عظمت و توقیر کے بیان میں عالمانہ انداز اپناتے ہوئے ایسی زبان لکھی ہے جو آسان عام فہم اور موجودہ دور کے زمانہ تک محیط ہے۔ چونکہ افق لکھنوی بہترین نثار ہیں اس لئے وہ علمی سے علمی بات کو بھی آسان اور عام فہم زبان میں اس طرح لکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کو معلومات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا بھی لطف ملتا ہے۔

مہابھارت میں دو طرح کی نثر ہے۔ ایک تو خود جو مصنف اپنی زبان سے ادا کرتا ہے، دوسری وہ جو مہابھارت کے کردار ادا کرتے ہیں۔ مہابھارت کے کردار مختلف جذبات و احساسات اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے پر ہیں۔ ان سب کے جذبات اور احساسات کے مطابق زبان کا استعمال اور تراکیب کی دروبست یہ فنی چیزیں ہیں جن کو مصنف نے بہت ہی ذی روح انداز میں ادا کیا ہے کہ کرداروں کی ذہنی اور دلی کفیت صاف طور پر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ جدید تنقید میں ایسے ہی ادب کو ادب برائے زندگی اور ادب عالیہ کے مقام پر فائز کیا گیا ہے۔ مہابھارت کی نثر ان تمام لوازمات سے مزین ہے۔ مثال کے طور پر مہابھارت کے پانچویں سرگ کے صفحہ ۹۹۷ کا یہ اقتباس دیکھئے:

''شری کرشن جی کی کرن کو تحریک جوش و خون اور کرن کا دریودھن کی ترک رفاقت سے انکار۔

''کروچھیتر کی سرزمین کو پرسورام نے ۲۱ بار چھتریوں کے خون سے سیراب کیا اب وہ پھر خون کی پیاسی ہے۔ اگر وہاں خون کی ندیاں نہیں بہیں گی تو بے زبان زمین کی پیاس کیونکر بجھے گی۔ تمام پنڈتوں تمام تجربہ کاروں کو یقین ہے کہ دریودھن کے دن پورے ہوگئے ہیں۔ بدشگونیاں بھی کورووں کو پیغام موت سنا رہی ہیں۔ ہرنوں کی قطاروں کی بائیں طرف کی دوڑ دھوپ، گھوڑوں کی تعاقب میں چیل، بگلوں کی پرواز، آسمان سے خون اور گوشت کی بارش بھی خبر دیتی ہے کہ کورو مٹے اور راجہ یدھشٹر کا اوج اقبال ہوا۔''

یہ بیانیہ نثر ہے جو آسان اور سلیس ہے اس میں واقعات کو تسلسل کے ساتھ آسان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ نثر نگاری میں روانی ایسی ہے کہ حروف عاطفہ یعنی اور کا استعمال نہ کے برابر ہے جو زبان کی سلاست اور روانی کے لئے بیحد مفید ہے۔ ایسا اسلئے بھی ہے کہ اس

زبان کا استعمال عام آدمی کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ یہ زبان محل سرا یا درباروں کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔ مہابھارت کے اپنے ترجمہ میں افق ایک اور باب میں لکھتے ہیں۔

''بھیشم پتاماہ اور درونا چاریہ نے کنتی مہارانی کی تقریر سن کر دریودھن سے کہا کہ معاملہ نازک ہے۔ بہتر ہے کہ صلح کر لو۔ وراٹ نگر میں اکیلے ارجن نے ہم سب کو ڈھیر کر دیا تھا۔ کسی کے بنائے کچھ نہ بنتی تھی۔ اب ہم بھی وہی ہیں اور ارجن بھی وہی، اس پر شری کرشن جی کی حمایت کا طرہ، پھر بھلا پانڈؤں سے سر یر ہونے کی کون امید ہے؟ ہم لوگ بہت لڑ بھڑ چکے ہیں، بڑھاپے میں منہ پر سیاہی لگنا باقی رہ گئی تھی، اس کے لئے تم نے سارے سامان کر دیئے ہیں۔ معلوم ہو گیا ہے کہ تم ہم لوگوں کی جان کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ لاکھوں آدمیوں کا خون مفت ہو گا اور ہاتھ جھنجی بھی نہ آئے گی۔''

اس اقتباس میں محاوراتی زبان کا استعمال ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس وقت تک اردو نثر نگاری میں کافی نکھار آ گیا تھا اور اچھی محاوراتی زبان استعمال ہونے لگی تھی جس میں مصنف کی جدت چار چاند لگا دیتی تھی۔ افق نے اپنے محاوروں کو اپنے طریقہ سے استعمال کیا ہے۔ جس سے وہ آسانی سے قاری کے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

افق نے مہابھارت میں خصوصاً نصیحت آمیز باتوں کو بہت جنچی تلی زبان میں لکھا ہے جس سے قاری اور سامع کو پڑھنے یا سمجھنے میں کسی طرح کی دقت پیش نہ آئے۔ مثال کے طور پر یہ جملے دیکھئے:

''ا۔ راجکماروں کو سستی، غرور، تلون مزاجی، سرکشی، خود بینی، خود آرائی، صحبتیں بیجا ان سات چیزوں سے بچنا چاہئے۔

۲۔ چھ باتیں دنیا میں غنیمت ہیں تندرستی، وطن میں قیام، فرض سے سبکدوشی، صحبت نیک، حسب مرضی روزگار، سکونت بیخوف۔

۳۔ حسب ذیل آدمیوں کو کبھی چین اور آرام نہیں حاسد، بے صبر، غصہ ور، شکی، دوسروں کے دست نگر۔

۴۔ خصلتیں یا عادتیں جو دنیا میں کامیابی یا کامرانی کے لئے ضرری ہیں، راست گوئی، دان پنیہ، چستی و چالاکی، غیبت سے نفرت، صبر و تحمل، دھرم کی پابندی۔

اسی طرح پوری مہابھارت میں موقع ومحل کے اعتبار سے زبان و بیان کا استعمال کیا گیا ہے جو افق کی مہارت کی دلیل ہے اس لئے کہ عظیم فنکار موقع ومحل کے اعتبار سے اور قاری کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھ کر زبان و بیان کا استعمال کرتے ہیں۔

☆☆☆

ٹاڈ راجستھان

ٹاڈ راجستھان کا خلاصہ "خلاصہ یادداشت روزنامہ کرنل ٹاڈ" (شایع ۳ اپریل ۱۹۰۷ء) میں افق لکھنوی نے مؤرخانہ انداز میں جو خلاصہ پیش کیا ہے اس سے ان کی تاریخ نگاری کا پتہ چلتا ہے یہ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اس میں ٹاڈ کے ان روزناموں کو درج کیا گیا ہے جو اس نے اپنے راجستھان کے قیام کے دوران رقم کیا تھا۔ کیونکہ افق نے ٹاڈ راجستھان کی ان جلدوں کا مطالعہ کیا تھا جو اس نے راجستھان کی تاریخ کی شکل میں لکھا ہے اور اس کے مترجم بھی افق لکھنوی ہیں۔ خلاصہ سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ فنکار نے جہاں ترجمہ کیا ہے ترجمہ کا احساس نہیں ہونے دیا کمال یہی ہے کہ اصل کے مقابلہ میں ترجمہ زیادہ مؤثر اور دلچسپ ہو گیا ہے چونکہ افق اردو کی ساری اصطلاحوں سے واقف تھے جو تاریخ میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں سب سے بڑا کمال ان کا یہ ہے کہ تاریخ نگاری کو ادبی دائرہ میں داخل کر دیا ہے جس سے معلومات کے ساتھ ساتھ قاری زبان سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔ ان کے ترجمہ کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

لکھتے ہیں "جلد اول میں ماڑواڑ اجمیر کے دورے سے واپسی اور اجمیر تک کے واقعات حوالہ قلم ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد ۹ جنوری ۱۸۲۰ء تک معلق تاریخ ساز کا قیام جے پور میں رہا۔ بعدہٗ بوندی کوٹا میں ان کا تقرر رہا اور انکو یہاں جانے کی ضرورت ہوئی اس موقع پر انہوں نے باشندگان ریاست اور انکی طرز معاشرت کے حالات قلم بند کر کے تاریخ ہذا میں شامل کئے۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں اس زمانہ سے قبل کسی انگریز کی رسائی نہ ہوئی تھی۔"

اس اقتباس سے احساس ہوتا ہے کہ افق معروضانہ انداز اور تلخیص عبارت لکھنے پر بھی قادر تھے۔ یہ پیراگراف کوئی مؤرخ ہی لکھ سکتا ہے یہ اُس آدمی کی عبارت ہرگز نہیں ہو سکتی جو تاریخ نگاری کے رموز و اسرار سے واقف نہ ہو۔ آگے جو اقتباس پیش کیا جائیگا وہ اسطرح کا کامیاب ترجمہ ہے کہ اگر ترجمہ کا تصور ہٹا دیا جائے تو تصنیف کا احساس ہوتا ہے۔

"اودے پور میں پورا مہینہ گذرا تھا کہ ہندوستان کے موسم سرما کی بہار کا لطف پیش

نظر ہوا انگریز موسم گرما میں ایسے ہی دلفریب مقاموں پر بود و باش اختیار کرتے ہیں آلہ مقیاس الحرارت "بیرومیٹر" اس پہاڑ کی گھاٹی پر صبح ہی جم جاتا تھا اور پھر ہوتے ہوتے نو درجہ پر ٹھہرتا تھا۔ جس روز روانگی عمل میں آئی آسمان نیلم کی طرح نظر آتا تھا۔ مطلع بالکل صاف اور رات کو ستاروں کی چمک دمک پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔"

اس اقتباس میں اصل صاحب کتاب نے ایک منظر پیش کیا ہے جس کو مترجم نے اپنی زبان دے کر شاہکار بنا دیا ہے اس طرح کے منظران کی کتاب میں جگہ جگہ پر ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ ٹاڈ راجستھان کی سبھی نو جلدوں میں فنکار نے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ دو ہزار ارسٹھ صفحات پر مشتمل اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ قاری واقعات تواریخ کی جانکاری کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے حسن سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک مثال دیکھئے:

"چوہان اور راٹھور تاجداروں میں حد درجہ دشمنی تھی مگر پرتھوی راج چوہان نے تاریخی حالات سے جو دبدبہ حکومت قنوج پر واضح ہوتا ہے وہ تعجب خیز ہے تاریخ چوہان میں راجہ جے چند کو منڈلیش خطاب سے یاد کیا گیا ہے یہ معترف ہے کہ یہی راجہ تھا جس نے دریائے سندھ کے مغربی فرماں رواں کو نیست نابود کر کے آٹھ راجاؤں کو اسیر کیا۔ انہل واڑہ کے راجہ سدھ راج کو دوبار زیر کیا اور جام طاقت و نخوت و دبدبہ حکومت سے راجسوئے یدھ کے ساتھ اپنی بیٹی کا سوئمبر کیا۔ اچھے اچھے راجاؤں نے اس یگیہ میں شرکت کی۔ راجہ جے چند کی دیوتاؤں کے برابر پرستش کی۔ ایسے ایسے سوئمبروں اور راجسوئے یگیوں کا نتیجہ ہمیشہ خراب رہا اور حصول عظمت و شوکت کی چال پٹ پڑی ہے۔"

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ٹاڈ راجستھان میں جو نثر استعمال کی گئی ہے وہی موضوع تاریخ کے اعتبار سے ہے یعنی آسان عام فہم اور سلیس ہے اس لئے کہ تاریخ کا موضوع مشکل زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے۔ فنی اعتبار سے تاریخ میں ذو معنیٰ لفظوں کا استعمال دیانتداری کے خلاف ہے اس لئے کہ تاریخ کا مطلب ہوتا ہے کہ واقعات کو بے کم و بیش واضح لفظوں میں بیان کر دیا جائے۔ چونکہ افق زبان و بیان کے ماہر ہیں اس لئے انہوں تاریخ بیان کرنے کے لئے تاریخ کی زبان کا ہی استعمال کیا ہے۔

افق لکھنوی بحیثیت ایڈیٹر نظم اخبار

افق کا دور شاعرانہ تھا دبستان لکھنوی جو اردو زبان کے سجانے سنوارنے اور اس کو عروج و کمال تک پہونچانے کا آخری دبستان تھا اس کے آخری دور میں افق لکھنوی نے عوام کے ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بالکل اچھوتے ڈھنگ کا اخبار نکالا جس کو نظم کا نام دیا۔ "نظم" اس اخبار کی سن اشاعت ۵ اگست ۱۸۸۸ء ہے یہ اخبار عوام کی ذوق تسکین کے مطابق تھا اس لئے مقبول عام و خاص تھا۔ پورا اخبار ۱۲ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ جس کے چار صفحات نثر کی نظر ہوتے تھے اور آٹھ صفحات میں ساری خبریں نظم اردو میں پیش کی جاتی تھی۔ نظم یقیناً نظم ہوتی تھی جس میں شعری لوازمات پورے طریقہ سے برتے جاتے تھے۔ اس لئے کہ افق لکھنوی کا جو دور تھا خواص کیا عوام تک نظم میں کسی طرح کی کمی یا فن غلطیوں کو معاف نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انکے دور کا جو شعری سرمایہ موجود ہے وہ فنی اعتبار سے اعلیٰ شاعری ہے۔ نظم اخبار کی وہ خبریں جو نظم میں ہوا کرتی تھی فنی اعتبار سے اعلیٰ درجے کی اور اعلیٰ پیمانہ کی ہوتی تھیں۔ بحر و قافیہ کا التزام کیا جاتا تھا۔ جس سے قاری خبر کی معلومات کرنے کے ساتھ ساتھ نظم سے بھی محظوظ ہوتا تھا یہ ایک اچھے ایڈیٹر کی علامت ہے کی وہ زمانہ کے نبض شناس ہو۔ افق لکھنوی نے اپنے زمانہ کی دھکتی ہوئی نبض پر نظم اخبار نکال کر انگلی رکھ دی۔ صحافت کی تاریخ کا پہلی اور شاید آخری تجربہ ہو۔ مختلف خبروں کو نظم کے انداز میں بیانکرنا یہ بھی ایڈیٹر کی جدید کاری تھی کیونکہ ان کا جو شاعرانہ دور تھا وہ غزلوں کا تھا نا کہ نظموں اور غزل کا دامن خبروں کا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اردو ادب کے لئے افق کی خدمت یہ بھی ہے کہ اس دور میں انہوں نے خبریں صنف نظم میں لکھیں جبکہ انکا دور نظم کا نہیں غزلیہ شاعری کا تھا اور ایسی نظم کا استعمال کیا جس کا انداز تقریباً غزلوں کا ہے لیکن وہ غزل نہیں ہیں۔

نظم اخبار کے صفحہ اول پر افق لکھنوی کی ایک مثنوی شائع ہوا کرتی تھی جو انکے اخبار

کے مزاج اور فکر کو واضح کرتی تھی مثنوی میں انہوں نے وہ سب کچھ بیان کر دیا تھا جو وہ اپنے اخبار کے ذریعہ کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ افق لکھنوی خوش طبع شاعر ہیں اس لئے اس مثنوی کا پورا ماحول شاعرانہ ہے۔ مثنوی کا پہلا شعر حمد یہ ہے اس کے بعد کے اشعار میں صنف نظم اور نظم اخبار کے بارے میں بیا نکیا گیا ہے اور اس کے سارے پہلوؤں کو شعری پیکر اجاگر کیا گیا ہے۔ مثنوی رقم کی جارہی ہے جس کا مطالعہ کر کے قاری خود ہی اندازہ لگالیں کی نظم اخبار کیا تھا اور اس کی حیثیت اور عظمت کیا تھا۔

نظم اخبار کی افتتاحی تاریخ

نظم اخبار کے صفحہ اول پر حضرت افق کی یہ معرکۃ الآراء مثنوی مدتوں شائع ہوتی رہی:

ہے شکر اس خالق عالی صفت کا
مصنف ہے جو بندشِ جہت کا

اشاعت نظم کی فرمائی جس نے
ردیف مہر و ماہ چمکائی جس نے

دکھائی خوبیاں فکر متیں کی
غزل تصنیف کی دنیا و دیں کی

کہا خمسہ حواس انس و جن کا
کیا دیواں مرتب رات دن کا

رقم کی مثنوی دین و ایماں
سنائی نظم بید و نثر قرآں

کہا قطعہ چہار انفاس تن کا
عناصر اور اخلاط بدن کا

بلاغت نظم پردہ میں دکھائی
فصاحت نثر نسریں میں دکھائی

رباعی لکھی اعتراف جہاں کی
کہی بیت ابرو و چشم بتاں کی

کیا تصنیف مطلع دو جہاں کا
بنا مصرعہ ہلال آسماں کا

نظیر اس کا نہیں فکر متیں میں
کلام اس کا ہے ہر بحر و زمیں میں

کچھ اس کا ایسا فیض علم و فن ہے
ریاض دہر گلزار سخن ہے

چکوریں شاعر شیریں زباں ہیں
عنادل طوطی ہندوستاں ہیں

سوا ہیں مور شکات مسن سے
خجل ہے بلبل شیراز جن سے

غزل گوہر زبان بوستاں ہے
ہر ایک سوسن کا پھول اہل زباں ہے

زبان دانی کا ہے قمری کو غرہ
ہے صاف اہل چمن کا روزمرہ

حنائے بوستاں اہل قلم ہے
صبا گویا نسیم صبح دم ہے

ہے شعر اب موجوں کی زباں پر
لب جو پر ہیں مصرعہ سنوبر

بہار نظم ہر جانب عیاں ہے
زیادہ بوستاں سے بوستاں ہے

مسلسل ہے وہ نثر سنبلستاں
صفت میں جس کے عاری ہے گلستاں

دکھاتی ہے ہراک شے نظم کی شان
گل صد برگ نظروں میں ہے دیوان

ہر ایک پتہ نہال بوستاں کا
ہے گلدستہ کلام شاعراں کا

کہانی اے افق چھیڑی کہاں کی
ضرورت طول گیسوئے بیاں کی؟

مچادے افتخار نظم کی دھوم
دکھادے جلوہ اخبارے منظوم

مہینہ میں ہو جوش نظم دو بار
بنے ماہ دو ہفتہ جس میں اخبار

ہر ایک انداز کے مضموں ہو اس میں
مطالب نثر کے موضوع ہوں اس میں

ہو بہر مرگ مضموں فکر صیاد
رہے خامہ مثال سرو آزاد

ذہانت کوئی باریکی نہ چھوڑے
قلم جودت ہر ایک مضموں میں توڑے

ملے غافل جو محو خواب آرام
تو یہ پانی کے چھینٹے کا کرے کام

سخن سنجی میں ہو ضرب المثل یہ
بنے جنبور مضموں کو کنول یہ

قمر ہو یہ قتان جہل بد کو
ہو پانی آتش جہل و حسد کو

عروس نظم کو بن جائے افشاں
مسی و سرمہ و گلگلوں نہ وہ پاں

بنے بہر گلستان سخن پھول
ہو گوش شعر گوئی کو کرن پھول

خبر کے واسطے یہ تار ہو جائے
گلوئے علم و فن کا ہار ہو جائے

بنے یہ مخبر حالات عالم
دوائر سب ہوں اس کے ساغر جم

رہے پہنے یہ فردوسی کا جامہ
بیان جنگ میں ہو شاہ نامہ

ہو خوش اس کی روش سے کل زمانہ
نہ دکھنے دے یہ تسبیحوں کا دانا

ظرافت کا نیا انداز دکھلائے
مذاق فکر کا اعجاز دکھلائے

رعایا کا دل و جاں سے ہو غمخوار
رہے ہر دم مطیع حکم سرکار

ضمیمہ میں بہار نثر دکھلائے | جمال گل عذار نثر دکھلائے
غرض اخبار کے جو جو ہیں منصب | وہ سب اس میں ہوں نظر طرز انصب
نہ دے زلف سخن کو اے افق طول | تیرا حصہ ہوا یہ طرز معقول
بڑھا تعریف سے توقیر اشعار | رقم کر بے بدل منظوم اخبار

۱۸۸۸ء

یہ نظم افق کے دور کے دبستان لکھنؤ کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔ اس مثنوی کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصہ میں حمد باری ہے دوسرے حصہ میں دبستان لکھنؤ ثنا خوانی کی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں اپنے دور کے اعتبار سے صحافت کے رموز و اسرار کر تقاضوں کا بیان ہے۔ پہلا حصہ جو حمدیہ اشعار پر مشتمل ہے اس میں کائناب کی اور مذاہب کی بہت سی چیزوں کو نظم کے انداز بیان میں دیکھا گیا ہے۔ اور پوری کائنات کو شاعرانہ انداز میں اس طرح بیانکیا گیا ہے گویا بنانے والاے نے پوری کائنات کی حسن کاری اس طرح کی ہے جیسے وہ ایک خوبصورت نظم ہے چاند ستارے ماہ و مہ، ردیف و قافیہ اور اس کے بیچ کی ساری چیزیں تشبیہ و استعارات کے لفظوں میں بیان ہے۔ شاعر کی اسے جدت ہی کہا جائے گا کہ اپنے مالک حقیقی کی بالکل نئے انداز اور نئے آہنگ کے ساتھ ثنا خوانی کی ہے۔ جیسے چکور کو شاعر شیریں کہنا، عنادل کو طوطی ہند کہنا اور اپنی زبان دانی کی تعریف میں یہ کہنا کہ وہ سوسن کا پھول ہے۔

دوسرے حصہ میں دبستان لکھنؤ کی ثنا خوانی کی گئی ہے شاعر کو اپنی زبان دانی پر ناز ہے قمری کی طرح، اخبار میں روزمرہ صاف ستھرا استعمال ہوتا ہے شاعر کا ماننا ہے کہ دبستان لکھنؤ کے ادیب قلم کے دھنی ہیں ان کی قلم نسیم صبح کی طرح چلتی ہے اشعار میں جذبات دریا کی موجوں کی طرح موجزن ہوتے ہیں۔ پورا دبستان گلستاں کی طرح ہے جہاں نظم ہی نظم کی بہار ہے۔ دبستان لکھنؤ کی نثر سنبلستاں کی طرح ہے (ایران کی ایک خوشبودار گھاس جس کی شاعری میں محبوب کی زلف سے تشبیہ دی جاتی ہے۔)

مثنوی کے تیسرے حصہ میں افق نے اپنے وقت کے اعتبار سے اپنے اخبار کے مقاصد اور تقاضوں کا بیان کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ان کے اخبار میں پورے دیار کے واقعات اس طرح بیان ہوں گے جیسے وہ آنکھوں دیکھے ہوں یعنی اخبار جان جم یا جمشید کے اس پیالہ کی

طرح ہوگا جس میں سب کچھ دکھائی دیتا تھا افق یہ بھی کہتے ہیں کہ اخبار میں جنگوں کے حالات فردوسی کے شاہنامہ کی طرح بیان ہوں گے۔ اخبار رعایا کا غمخوار ہوگا اس کے ذریعہ کسی کو پریشان نہیں کیا جائے گا حسب ضرورت واقعات اور تنقید شرافت میں بیان ہوں گے جس کا اپنا الگ ہی انداز ہوگا۔ ضمیمہ میں جو بہار نثر دکھلائیں گے وہ خوبصورت نئے پھولوں کی طرح خوشنما ہوگی اخبار کی سارے لوازمات دلکش انداز میں برتے جائیں گے۔

نظم اخبار کی اشاعت ہر ماہ میں دوبار ہوتی تھی اور اس کے صفحہ اول پر یہ شعر لکھا رہتا تھا:

از تمنائے تمنا و تمنائے افق
گشت نظم اخبار مہر عالم آرائے افق

اس اخبار کے منظر عام پر آتے ہی سارے ہندوستان میں اس کی دھوم مچ گئی۔ عالمانہ صلاحیت اور شاعرانہ ذوق رکھنے والوں کے ساتھ ہی ساتھ عوام نے بھی اسے بہت سراہا اور دل سے پسند کیا۔ آگرہ اخبار جو آگرہ سے شائع ہوتا تھا اس میں نظم اخبار کی تاریخ میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ اس متعلق آگرہ اخبار میں شائع ایک مسدس کے کچھ بند خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

شکر صد شکر کہ پھولی چمنستاں میں بہار
صفحہ کاغذ کا بنا تختہ خط گلزار
مرحبا فرقۂ تعالیٰ ارباب دیار
سنئے گلشن سے ذرا زمزمہ ہود ہزار
واہ کس رنگ سے گلزار سخن پھل لایا
نظم اخبار نہ تھا ہند میں وہ بھی آیا

نظم اخبار کس انداز سے نکلا دیکھو
اب تلک ہند میں جو تم نے نہ دیکھا دیکھو
اور اس باغ میں ایک طوفاں تماشہ دیکھو
بلبل باغ کو یوں زمزمہ پیرا دیکھو

جس سے کانوں میں صدا لطف سخن کی آئے
جو ہوا آئے وہ تاتار و قطن کی آئے

پھول گل کھائے اگر دیکھ لے رنگ تحریر
خار کھائے جو سنے بلبل نالاں تقریر
ماہ کا داغ ہو دیکھے تو سخن کی تنویر
گھٹ کے خورشید جہاں تاب بنے ذرا نظیر

شمع جل جائے اگر چرب زبانی دیکھے
تیغ کٹ جائے اگر سیف بیانی دیکھے

ہے تمنا و افق زمزمہ پیرا اس کے
ایسا اخبار نہ دیکھا نہ سنے یہ نغمے
مشق اول کے ورق ہیں کہ سخن کے چربے
حق تعالیٰ نظر بد سے بچائے رکھے

کوپلیں پھوٹی ہیں نخل سخن اردو میں
پھول پھولے ہوئے دیکھو چمن اردو میں

افق کا بہت سا کلام نظم اخبار میں شائع ہوا ہے افق کے دونوں بڑے بھائیوں منشی رام سہائے تمنا ور منشی ماتا پرساد نیسا کا کلام بھی اس اخبار میں شائع ہوتا تھا اس اخبار میں برطانوی سرکار کی پالیسیوں کی تنقید بھی خوب ہوا کرتی تھی اور کئی موضوعات پر طنز و مزاح کے لہجہ میں بھی تشریحات کی جاتی تھی۔

نظم اخبار میں افق نے ایسی نظم کا استعمال کیا ہے جن کا انداز غزلوں کا ہے لیکن وہ غزل نہیں ہیں۔ مثلاً لاہور کی ایک خبر کے دو شعر دیکھئے:

یہاں کی ایک طوائف ہے مشہور
پرستاں کی پری فردوس کی حور

***

محبت میں بہم شیر و شکر تھے
گل و بلبل پہ اہل نظر تھے

اسی طرح نظم اخبار کی اور بھی خبریں ہوتی تھیں جو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شیریں ذوق کی تسکین کیا کرتی تھیں۔

نظم اخبار مؤرخہ 5/مارچ ۱۸۹۰ء میں شاہ ایران کے ہندوستان آنے پر لکھتے ہیں:

جو ایراں کے شہر کشور ستاں ہیں
نظیر سنجر و نوشیرواں ہیں
حرم ہے ساتھ ان کے چشم بد دور
جو خلد خط ایراں کے ہیں حور
ہیں ان سب سے چراغِ خانداں سات
زمینِ فارس پر ہیں آسماں سات
یہ ساتوں ہفت جوشِ مملکت ہیں
یہ ساتوں ہفت کاہِ شش جہت ہیں
یہ فرد سات چشم شاہ کے ہیں
یہ ہفت اختر سپہ جاہ کے ہیں
میانِ ہفت کشور فرد ہیں یہ
جوانو صفدر و پامرد ہیں یہ
یہ شاہ کج کلاں کے آنکھ کے نور
ہیں زینت بخش ایراں چشم بد دور

☆☆☆

نظم اخبار مارچ ۱۸۹۰ء میں شائع ایک اور خبر دیکھئے:

خبر مشہور کرتے ہیں یہ اخبار
کہ یاں آئے گا پھر کابل کا سردار
جو ملنا لاٹ صاحب سے ہے منظور
تو ہوگا تخت گاہے خاص سے دور
ذرا اے ہند تو ہوشیار ہو جا
"ٹکس" کے واسطے تیار ہو جا
ٹکس صاحب کے بانی آئیں گے پھر
خزانے دیشیوں کے جائیں گے پھر
نہ ہو اِفلاس و ناداری سے خائف
خزانے کھول دے بحر تحائف
مہیا ساز و سامانِ حشم کر
مسافر مہمانی کے بہم کر
نہ کر پرواہ اگر ہو زیر باری
نہ گھبرا جو ہو حالت غم کی طاری
لگادے گھر میں پھر صراف کے آگ
لنگوٹی میں ذرا پھر کھیل لے پھاگ
سبابِ آخرت ہے میزبانی
حج اکبر ہے صرف ایک مہمانی

کاٹھیاواڑ کی ایک خبر افق نے اپنے "نظم" اخبار میں اس طرح شائع کی تھی:

عجب سرکش ہیں اس خطے کے ڈاکو
بجا ہے گر کہیں ان کو ہلاکو

ہیں ان کے شور و شر سے زیر شہزور
کسی کے رعب سے دبتی نہیں کور
جفا کاری سے باز آتے نہیں ہیں
صدا محو دل آزاری یہ ہیں
کیا اہل پولیس کو حال میں تنگ
دکھا کر جوہر شمشیری کی جنگ

ایک اور مثال دیکھئے۔ ''ایک نواب صاحب سانپوں کو پکڑنے کا شوق رکھتے تھے اور مے نوشی کی عادت سے بھی مجبور تھے۔ ایک دن جب وہ نشہ کے عالم میں تھے انہیں سانپ نے کاٹ لیا اور وہ راہی عدم ہوئے۔ افق صاحب نے نظم اخبار میں یہ خبر شائع کرتے ہوئے نواب صاحب کی وفات پر یہ تاریخ کہی۔ ''لکھ دو میخواری ہے آخر کار مار آستیں''۔

افق لکھنوی بحیثیت صحافی

افق لکھنوی کا دور صحافت کے اعتبار سے اتنا ترقی یافتہ دور نہیں تھا۔ اس وقت تک صحافت کے وہ فنی لوازم سامنے نہیں آئے تھے جو آج صحافت میں برتے جارہے ہیں۔ اسے نظم اخبار کے نثر کے جو اقتباسات دستیاب ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حب الوطنی کے تحت اخبار میں جو خبریں وہ لکھتے کہ وہ غیر جانبدار ہونے کے ساتھ ساتھ آسان، عام فہم زبان میں ہوتی تھیں۔ یہ دنیا کا دستور ہے کہ جو بھی ذریعہ ابلاغ ہیں ان کے نظریات اپنے ملک قوم کے مطابق ہوا کرتے ہیں۔ چونکہ اس وقت ہندوستان انگریزوں کے زیر قبضہ تھا، آزادی کی جنگ جاری تھی، اگرچہ جنگ آزادی کے وہ تیور نہیں تھے جو بعد کے دور میں آئے پھر بھی اخبار کا مقصد ہندوستانی قوم کو بیدار کرنا اور عظمت رفتہ کی یاد دلانا تھا۔ اخبار میں جو خبریں شائع ہوتی تھیں انکا انداز خبر کا ہی ہوتا تھا لیکن جملوں کے دروبست میں افق اپنی بات کہہ دیتے تھے۔ عظیم صحافت اسی کو کہا جاتا ہے کہ زبان و بیان کے پیرایہ میں اپنی بات کو اس طرح کہا جائے کہ جس کے مطلب کی بات ہو وہ تو سمجھ جائے لیکن فریق مخالف پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ سمجھ نہ پائے دوسری بات یہ ہے کہ وہ سمجھے تو مگر ردعمل کا پہلو نہ تلاش سکے۔

افق سن ۱۸۸۸ء میں بحیثیت ایڈیٹر نظم اخبار میں لکھتے ہیں:

''۱۰؍ستمبر ۱۸۸۸ء کو دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ نیشنل کانگریس کا ٹاون ہال میں منعقد ہوا جس میں خواجہ علی محمد، بھیم جی رئیس بمبئی اور جناب مرلی دھر صاحب وکیل انبالہ اور جناب امراو مرزا صاحب ''حیرت'' نے نہایت عمدہ اور مفید اسپیچ میں بیان فرمایا حاضرین نہایت خوش ہوئے اور بڑی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ خیالات مخالفانہ کی جڑ کٹی۔ ان تینوں اسپیکروں کی لیاقت اور فصاحت وغیرہ کا عالم میں دھوم مچ گئی۔ چیرس پر چیرس ہوتے تھے۔ جناب حیرت صاحب نے ایک دردانگیز نظم پڑھی جس پر نعرۂ تعریف بلند ہوتے تھے۔ اس جلسہ میں تقریباً ۱۰۰۰ معزز ہندو ۵۰۰ باعزت مسلمان اور ۱۲ یورپین موجود تھے۔ جناب شیخ حفیظ اللہ خاں صاحب میونسپل کمشنر اس جلسہ کے چیرمین تھے۔ ہم ہمدردان ملک کو اس جلسہ کی کامیابی

کے لئے مبارکباد دیتے ہیں۔"

یہ شائع کی گئی خبر اس بات کی مثال ہے کہ ان کے اخبار کی نثر ایسی تھی جو عالم سے سب کی سمجھ میں آجائے۔ ضرورت کے مطابق انگریزی کے بھی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس سے معنیٰ اور مفاہیم پوری طرح ادا ہو جاتے ہیں۔ افق بحیثیت ایڈیٹر اپنی یہ اہم ذمہ داری بھی نہایت خوبصورتی سے ادا کر رہے تھے کہ وقت کی ضرورت ہے ملک کے حق میں سوچنے والے اپنے مختلف خیالوں کو ملا کر یکجہتی کا اظہار کریں تب ہی غلامی کا طوق گردن سے اتر سکتا ہے، ایک اور مثال دیکھئے:

"نیشنل کانگریس کی دن دونی ترقی نے آخر اپنا رنگ جما ہی لیا۔ منافقین کی ایک پیش نہ گئی۔ ولایت اور ہندوستان کے وہ اخبار بھی جو اس کی ترقی کے دشمن تھے، مخالفت کی جڑ کاٹنے لگے۔ قصہ کوتاہ اب نیشنل کانگریس کی لاتعجب ترقی کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا اور ہر طرف سے یہی صدائیں آرہی ہیں کہ معززین نیشنل کانگریس ضرور سرکار سے حقوق رعایا ہند دلائیں گے۔ مسٹر ملن، مسٹر بریڈلے اور مسٹر ڈگبی وغیرہ کی شرکت اس کے واسطے اور بھی سونے میں سہاگہ ہوگئی۔ بانیان کانگریس نے اس سال حسب دلخواہ کامیابی کا رنگ دیکھ کر یہ عزم کیا کہ ولایت میں بھی اس سلگتی ہوئی آگ کی سینک پہونچائیں۔ چنانچہ مسٹر ہیوم بابو، سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر نارٹن مسٹر آدم اسی مہینہ میں عازم انگلستان ہونے والے ہیں یہ چار بردست اور عالی خیال اسپیکر اگر ملک کی بہتری کی کوئی خوش خبری ولایت سے لائیں تو عجب نہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ محیرین کانگریس کے اصول باقاعدہ رہے جس سے کسی کی دال نہ گلی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو منافقین کب کے اس کی ہڈیوں کو سڑا چکے ہوتے۔ اتفاق اور لیاقت کے یہی معنیٰ ہیں کہ اکثر باعزت لوگوں کی پسند کے خلاف کام کو کامیابی حاصل ہونے لگے۔"

افق ۱۹۰۹ء سے اودھ اخبار سے جتنے دل وابستہ رہے نرم دل بھی ترجمانی کرتے رہے لیکن انداز تحریر ہجو ملیح سے کبھی دامن کشاں نہیں ہوتا تھا۔

ہجو ملیح ایسی نثر نگاری کو کہتے ہیں جس میں فنکار ایسا طنز کرتا ہے جس سے پڑھنے والا زیر لب مسکرا کر حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ فن صحافت میں باقاعدہ کالم کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں اخبارات میں اس کا کالم ہوتا ہے۔

افق لکھنوی کی اخباری نثر

افق لکھنوی نے مختلف اخبارات اور رسالہ جات کے لئے مضامین قلمبند کئے تھے۔ ان کی نثر نگاری کا کمال یہ ہے کہ موضوع اور عنوان کے اعتبار سے زبان بدل جاتی ہے۔ سردست ان کے دو مضمون سامنے ہیں، ایک کا عنوان ہے ''سندھ یاترا'' بھارت پرتاپ فروری ۱۹۰۲ء اور دوسرا مضمون وفاداری رسالہ دربار جون ۱۹۱۲ پہلے مضمون کی زبان آسان، شگفتہ اور موجودہ دور کی طرح کی ہے اس کا ایک پیرا گراف ہدیہ قارئین ہے:

''ہولی خوشی کا نیچرل موسم ہے غیر ہندو قومیں بھی خوشی کرتی ہیں۔ سارے ولایت کے عیسائی بھی گرم اپریل میں خوشی مناتے ہیں اور اپریل فول بنتے ہیں اور بناتے ہیں تم بیساکھ کی دھوپ کو نہ سمجھ کر اس میں شریک ہوتے ہو اور اسے تہذیب سمجھتے ہو اور جس پر عقلمندی کا دعویٰ کرتے ہو۔ تمہیں شاباشی!''۔

دوسرے مضمون کی زبان موضوع کے اعتبار سے عالمانہ اور اس وقت کے لکھنؤ کے نثر کے پیکر میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اس مضمون کی تحریر کا ایک پیرا گراف پیش ہے جس سے افق کی زبان دانی کی وضاحت ہوتی ہے: ''قدرت آفرید گار نے دنیاوی انتظامات کو ایک شکنجہ میں کسنے اور مختلف طاقتوں کو خاص زنجیر میں جکڑنے کے لئے کائنات عالم میں ایک زبردست ذرہ ثقیل جیسی صورت پیدا کی ہے جس کو بعض کیلئے باغبان، جو نظام شمسی کے لئے کشش آفتاب سمجھ لیجئے۔ یا ہاتھی کے واسطے انکش، گھوڑے کیلئے لگام اور اونٹ کیلئے نکیل۔ اگر یہ طاقت نہ ہوتی تو تمام نظم ونثر کے آسماں درہم برہم ہو جاتے اور یہ زمین پر طوائف الملو کی ہی رہتی۔ ابنائے آدم میں اس قدرتی قوت کا نام بادشاہ ہے۔

کسی ملک یا کسی قوم کا بادشاہ ہو، اس کی رعایا ان قوانین کی پابند ہوتی ہے، جو اس کی حکومت میں رائج ہوتے ہیں، یہ بات اور ہے کہ بادشاہ اپنے قانون کی عزت خود قائم نہ رہنے دے اور خود ہی اپنے دائرۂ اختیار سے باہر قدم رکھے۔ بایں رعایا کی مجال نہیں طے اس کے قوانین حکومت کا ایک نقطہ ادھر سے ادھر کر سکے''۔

افق لکھنوی نے مسٹر ولیم بیل کی فارسی زبان میں ضخیم تاریخ کی کتاب 'مفتاح التواریخ' کے حوالے سے لکھا ہے :

''مکند برہمچاری نے ہمایوں بادشاہ کے عہد میں اپنے مذہبی طریقے سے تپسیا کی تھی، ۱۵۹۱ء مطابق ۹۴۹ھ ہجری میں بمقام پریاگ عرف الٰہ آباد جا کر ترونی کے کنارے ہون کیا، اور اپنے اعضاء کاٹ کر اگنی کنڈ میں جلا دیئے، پھر خود اُسی میں اس نیت سے جل گیا کہ تپسیا کی برکت سے وہ پھر دنیا میں پیدا ہو کر بادشاہ ہو، چنانچہ اس نے اس موقع پر ایک سنسکرت اشلوک تصنیف کیا، جسے تانبے پر کندہ کر کے وہیں سپردِ زمین کر دیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ''میں نے ۱۵۹۱ء میں ماگھ شلک دوادشی کو تیرتھ راج پریاگ میں دنیا کی بادشاہت ملنے کی غرض سے ہبہ کر دیا۔ میں مکند برہمچاری ہوں جس نے ہمیشہ دودھ پر بسر اوقات کی'' ''چونکہ جلال الدین اکبر بادشاہ انہیں ایام میں پیدا ہوا لہٰذا لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مکند برہمچاری ہی نے اکبر کے چولے میں ہون کی برکت سے ہندوستان کی بادشاہت حاصل کی، اکبر کی تاریخ ولادت پنجم رجب ۹۴۹ھ ہجری ہے۔ جس سے مکند برہمچاری کے روز اوقات کو ۸/مہینے، ۲۶/دن ہوتے ہیں، اور صرف چار روز کی کمی رہتی ہے جو قابل اعتراض نہیں۔ کیا تعجب کہ مسئلہ تناسخ کی رو سے ہندوؤں کا عقیدہ صحیح ہو بادشاہ کے اکثر عادات و اطوار بھی اس معاملہ کی تائید کرتے ہیں''۔

مذکورہ بالا پیراگراف افق کی ایجاز بیانی کی بہترین مثال ہے، دوسری چیز لفظوں کا استعمال ہے، جو اتنے اہم مسئلہ کو آسان طریقے سے بیان کر دیا ہے۔

اس مضمون میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ مضمون کی زبان آسان، عام فہم اور رواں ہونا چاہئے۔ اس سے مصنف کی قادرُ الکلامی اور ادب کی نبض شناسی کا احساس ہوتا ہے۔

افق لکھنوی بحیثیت ڈرامہ نگار

ہندوستان میں سنسکرت ناٹکوں کی روایت تو صدیوں پرانی ہے لیکن اردو ڈرامہ نگاری کی شروعات ۱۸۵۰ء کے آس پاس واجد علی شاہ کے رہسیہ اور امانت لکھنوی کے ''اندر سبھا'' سے ہوئی۔

اردو ڈرامہ نگاری کی داغ بیل سرزمین لکھنؤ پر پڑی اور یہیں یہ اسٹیج بھی کیا گیا۔ لکھنؤ کی فضا میں اس وقت عیش پسندی چھائی ہوئی تھی اور خصوصا اودھ کے نوابوں کو فرصت کے لمحہ بہت میسر تھے۔ وہ اپنی گم گشتہ عظمت کے غم کو رنگ رلیوں اور تفریح کے ذریعہ بھلانا چاہتے تھے۔ چونکہ اودھ کے نواب واجد علی شاہ بہت جدت پسند تھے، انہوں نے ہندوستانی تہذیب سے 'رہسیہ' (کرشن رادھا) کی لیلاؤں کو لے کر لکھنؤ میں ڈرامہ شروع کرایا جو صرف شاہی لوگوں کے لئے ہی تھا۔ رہسیہ میں ہندی پرانوں کے کردار کرشن اور رادھا کی لیلاؤں کو دکھایا جاتا تھا۔ امانت لکھنوی نے رہسیہ کی شہرت سن سن کر ناٹک 'اندر سبھا' ۱۸۵۳ء میں لکھا جو اردو ڈرامے کے فن کا اولین نمونہ ہے۔ اس کتاب میں ڈرامہ کے فن کی تلاش سعی لا حاصل ہے۔ حالانکہ اردو ناٹک کی شروعات ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہو گئی تھی لیکن اس کی ترقی ۱۹ ویں صدی کے آواخر میں ہوئی۔ جس میں کچھ ناٹک کمپنیوں اور ان سے جڑے ڈرامہ نگاروں کا اہم رول رہا، پہلے ہندو دیومالا کی کہانیاں ڈراموں میں کھیلی جاتی تھیں۔

اردو کے اہم ڈرامہ نگار

اردو ناٹکوں کی ترقی میں ونایک پرساد طالب بنارسی ایک اہم نام ہے۔ یہ وکٹوریہ ناٹک کمپنی کے اہم ناٹک کار تھے جنہوں نے ناٹک کی زبان اور تکنیک وغیرہ میں بہت ترقی کی۔ طالب کے مشہور ناٹکوں میں دلیل ونہار، جسکی کہانی ایک انگیریزی کتاب سے لی گئی تھی، دلیر دل شیر، ناز، نگاہ غفلت گوپی چند وغیرہ تھے۔ سید مہدی حسن احسن لکھنوی کا نام بھی اردو

کے مشہور ڈرامہ نگاروں میں ہے جنہوں نے الفریڈ تھیٹر یکل کمپنی کے لئے فروز گلزار، دلفروش، چندراولی، بھول بھلیاں، بکاؤلی اور ''چلتا پرزہ'' ناٹک لکھے۔ اس وقت تک ناٹک زیادہ تر نظم میں ہوتے تھے اور جہاں نثر ہوتی تھی وہ بھی مقفیٰ اور مسجع۔ ان ڈراموں میں گانے بہت ہوتے تھے اور طنز ومزاح بھی بلند معیار کا نہیں ہوتا تھا۔ اردو ناٹکوں کو شہرت دلانے میں نارائن پرساد بیتاب بھی ایک اہم نام ہے۔ انہوں نے بھی ایلفریڈ کمپنی کے لئے قتل نظیر، مہابھارت، زہری سانپ، فریب محبت، راماین، گورکھ دھندھا، پٹنی پرتاپ وغیرہ ناٹک لکھے۔ بیتاب کے ڈراموں کے گیت پسند کئے جاتے تھے۔ ہندی پر عبور حاصل ہونے کی وجہ سے ان کے گیت بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے ہندو دھارمک ناٹک 'مہابھارت' میں دروپدی کے چیر ہرن کا سین دکھا کر اس وقت کے حساب سے بہت ہمت کا کام کیا۔ بیتاب کے ناٹکوں میں کچھ نقص بھی بتائے گئے ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ ان کے ڈراموں کی زبان میں بناوٹی پن ہے، زبان میں روانی کم ہے، ناٹکوں میں شعروں اور گیتوں کی بھرمار ہے، بحث مباحثوں میں کردار شعر اور دوہے بولتے ہیں جن کی وجہ سے سارا ماحول بناوٹی لگنے لگتا ہے۔ پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیتاب نے ڈراموں کی تکنیک اور زبان کے بارے میں جدیدکاری کی ہے۔ ان کے کرداروں کی عکاسی جاندار ہوتی تھی، فنی نظریہ سے ان کے ناٹک اعلیٰ معیار کے تھے۔ ان کی رہنمائی میں اردو ڈرامے نے درحقیقت ترقی کی۔

اردو ناٹکوں کی دنیا میں چمکنے والے ایک اور ستارے کا نام آغا حشر کاشمیری کا ہے جنہوں نے بمبئی کی پارسی تھیٹر یکل کمپنی کے لئے 'مری دیشک، مارآستیں، میٹھی چھری، اور اسیر حرص، ناٹک لکھ کر اس میدان میں سب سے اپنا لوہا منوالیا۔ ان کے ہندو دھرم کے موضوعات پر لکھے ناٹک بلومنگل، گنگا اوترن، مدھر مرلی، سیتا بنباس، بھیشم پرتگیا ڈرامے بھی بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے اپنے ڈرامے آنکھ کا نشہ سے اردو ناٹکوں کی تکنیک کو ایک نیا موڑ دیا اس ناٹک کے مکالمے مقفیٰ اور مسجع زبان میں نہ ہو کر سادی اور سلیس نثر میں لکھے گئے تھے۔ بعد کے ناٹکوں میں یہی تکنیک اپنائی گئی۔ انکے کچھ اور ڈرامہ شہید ناگ، خواب ہستی، نعرہ توحید، خوبصورت بلا، ٹھنڈی آگ، تصویر وفا، خود پرستی، جرم نظر، ہندوستان قدیم اور جدید، بھی بہت مشہور ہوئے۔ حشر کو ڈرامے کے فن کی باریکیوں کا پورا علم تھا ان کے ڈرامے تیز رفتار ہوتے

تھے اوران کے مکالمے بیحد پراثر ہوتے تھے جس کی وجہ سے کردار جذبات اور جوش میں ڈوب کر اداکاری کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے ناٹکوں میں گیتوں کی کثرت ہو جاتی تھی اور کبھی طنز ومزاح کا معیار گر جاتا تھا۔ کبھی کبھی ان کے ڈراموں میں ہولناک سین بھی کئے گئے ہیں پھر بھی ان کو اردو دنیا کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار مانا گیا ہے۔ دوسرے اہم ڈرامہ نگاروں میں حافظ محمد عبداللہ، مرزا ناظر بیگ، منشی ابراہیم محشر، منشی رحمت علی، دوارکا پرساد افق اور مرزا عباس بیگ ہوئے ہیں۔

افق لکھنوی اردو ڈراموں کے عبوری دور کے ڈرامہ نگار ہیں، ان کے زمانہ تک اردو میں خالص ادبی، مذہبی، سماجی اور سیاسی ناٹک نہیں لکھے جارہے تھے۔ افق لکھنوی نے پنجاب کے دوران قیام (۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء) تین ڈرامے لکھے جس میں پہلا 'شری رام' ناٹک اور دوسرا 'کرشن سدامہ' تکمیل کو پہنچے ان کا تیسرا ڈرامہ 'بھیشم پتاماہ' پائے تکمیل تک نہیں پہنچا۔ افق نے اپنے ڈراموں کے لئے جو موضوعات چنے وہ ہندوستان کی قدیم مقدس کتابوں پرانوں سے ہیں۔ ظاہر ہے افق کا مقصد ہندوستان کی قدیم تہذیب وثقافت کی طرف توجہ دلانا تھا جس سے عوام میں اپنی تہذیب کے لئے فخر ہو اور ان میں خود اعتمادی کا جذبہ موجزن ہو۔ افق کے وقت میں اردو ڈراموں کے میدان میں پارسی تھیٹروں کا بول بالا تھا جن کا مقصد ادبی اور اخلاقی نہ ہو کر صرف تجارتی تھا۔ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی چاہت میں ان میں ایسے سین گانے اور ناچ شامل کئے جاتے تھے جو ادبی معیار سے گرے ہوئے ہوتے تھے اور جنہیں مہذب ذہن تسلیم نہیں کرسکتا تھا۔ سماج کے بیشتر حصہ پر ان کا اچھا اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ افق نے ایسے ناٹکوں کو سماج کی بہبودی کے لئے اچھا نہیں سمجھا اس لئے انہوں نے ثقافت اور مثالیت کے لئے مشہور ہندوستان کی قدیم کتابوں میں بیان کئے گئے قصوں کو اپنے مخصوص انداز میں ڈرامے کی شکل دینے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب ہوئے۔

افق کا ''شری رام ناٹک''

اردو ادب میں 'رام کتھا' پر غالباً پہلا ڈرامہ افق کا شری رام ناٹک ہے رامائن کا قصہ پیوراتک قصہ ہونے کی وجہ سے سامعین کے عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے دوسرے رامائن کی کہانی خود ناٹکوں کے عناصر سے پر ہے۔ رامائن میں زندگی کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اس میں مختلف طرح کے کرداروں کی عکاسی ہے کہانی میں اتنے اتار چڑھاؤ اور موڑ آتے ہیں، فلسفیات اور زندگی کے حقائق کی اتنی باتیں ملتی ہیں کہ سیکڑوں برس سے ہر سال اور ہر جگہ کھیلے جانے کے باوجود دیکھنے والوں کا اس سے دل نہیں بھرتا۔ اس لئے افق نے اپنے ڈرامہ کے لئے یہ موضوع چن کر دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ رامائن کی کہانی میں تو جدید کاری ممکن نہیں ہے دیکھنا یہ ہے کہ فنی اعتبار سے اس ڈرامہ کا کیا مقام ہے۔ شری رام ناٹک کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں زبان اور بیان کا لطف ڈرامہ کے ایک ایک مکالمہ اور ایک ایک گیت میں ملتا ہے۔ ڈرامہ میں منظر نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ کرداروں کے جذبات کی عکاسی اتنی ڈوب کر کی گئی ہے کہ قارئین اور سامعین ڈرامہ نگار کے ساتھ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور قصہ کا پورا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ درس بھی حاصل کرتے ہیں۔

شری رام ناٹک افق کے دور میں لکھے گئے ناٹکوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ رام ناٹک کا ذکر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادب اردو میں کیا ہے اور نور الٰہی کے ناٹک ساگر میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے اردو ساہتیہ کے اتہاس میں بھی اردو کے اہم ڈرامہ نگاروں میں افق کا ذکر کیا ہے۔

رام ناٹک چار حصوں میں ہے اور برسوں پوری پوری رات تھیٹروں میں اسٹیج پر کھیلا جاتا رہا ہے۔ بعد میں ناٹک کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناٹک کے مکالمہ بہت پر اثر ہیں اور زبان بیحد سلیس ہے۔ ڈرامہ نگار نے اس میں کردار کے اعتبار سے الگ الگ زبان استعمال کی ہے۔ ہلکے پھلکے الفاظ میں بھی رنگین بیانی کی ہے۔ اس ناٹک کے گیتوں میں افق کی اعلیٰ شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ سنسکرت ناٹیہ شاستر کے

آچاریہ بھرت منی کے مطابق ناٹک میں نورسوں ، واتسلیہ، شرنگار، کرونا، شانت، ویر، ہاسیہ، وبھتسو ، رودر کا اظہار اور عکاسی ڈرامہ نگار کی قابلیت کا ثبوت ہوتا ہے۔شری رام ناٹک میں افق نے ان نو رسوں کے بیان کی نظم اور نثر دونوں میں بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔افق کے رام ناٹک میں کچھ بیحد خوبصورت گیت شامل ہیں جن کی زبان، سلاست، بندش الفاظ شیرینی اور موسیقیت دیکھنے کے قابل ہے۔

افق کے رام ناٹک میں بیان کی خوبی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے، مثلاً اس ڈرامہ میں راج پریواروں کا پورا ماحول چند مکالموں اور گیتوں سے تیار کر دیا گیا ہے مکالموں میں چستی ہے، زبان کرداروں کے اعتبار سے بدلتی ہے اور مکالموں اور گیتوں میں موسیقیت پر زور ہے لیکن اس میں بناوٹی پن نہیں لگتا۔

شری رام ناٹک کی شروعات حمدیہ اشعار سے ہوتی ہے۔اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ ہر اچھے کام کی شروعات حمد سے ہوتی تھی حالانکہ بعد کے ڈراموں میں یہ روایت ختم ہو گئی اور بالواسطہ قصہ شروع کیا جانے لگا۔ ہندو مذہب میں ہر اچھے کام کی شروعات میں گنیش جی کی حمد کی جاتی ہے تاکہ کام خوشی خوشی اور بنا کسی رخنہ کے پایۂ تکمیل تک پہنچے۔افق لکھنوی نے اس روایت کو اپنے ڈرامہ میں برقرار رکھا ہے۔حمد کے بعد ڈرامہ کا پہلا سین شروع ہوتا ہے پہلا منظر راجہ دشرتھ کا دربار ہے۔راجہ کی آمد آمد ہے چوبدار اس کا اعلان کرتا ہے۔اس اعلان کو افق نے شعری پیکر دیا ہے جو زبان و بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔اس بیان کا انداز نعت کا ہے یہیں سے قاری اور سامعین کے دل پر ڈرامہ نگار کی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ دشرتھ کے دربار میں آمد کا منظر افق کی زبان میں دیکھئے:

آمد ہے تاجدار فلک بارگاہ کی
آنکھیں بچھی ہیں زیر قدم مہر و ماہ کی
امیدوار چشم کرم پا بوس ہیں
پیشانی ادب پہ ملیں خاک راہ کی

ہوجائیں پیشوائی کو استاد جاں نثار
پتلی کھڑی ہو دیدۂ ہر خیر خواہ کی
سب مل کے ذات پاک سے کردیں دعا افق
بڑھتی ہو مال و دولت و اقبال و جاہ کی

اہل دربار گانے سے راجہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہاں شاعر نے وہ زبان استعمال کی ہے عام طور سے ہندو راجاؤں کے درباروں میں لوگ اپنے راجہ کی تعریف میں ان کے جاہ وجلال بڑھنے کے لئے دعا مانگتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ اس گانے میں ہندی الفاظ کا خوبصورت اور موقع کے حساب سے استعمال کیا گیا ہے:

راجہ اودھیش آئے، جے ہو ان کے، ان کی جے
رگھوکل سنگھ رگھوکل سمن، تیجوان، بھانو، پنچ سمان
دھرم سہائک، ودیاوان، سب بدھی لائق، سب گن کھان
جگ سکھ دائک، روپ ندھان، کریں دیا بھگوان
ہو جے ہو جے دشمن کی چھے
نرپتی دشرتھ آئے راجاؤں کے سرتاج، ہو راج اٹل
سب کام سفل ہووے سدا کلیان

راجہ دشرتھ تخت سلطنت پر وراج مان ہونے کے بعد وشسٹھ منی سے اپنی لا اولادی کا ذکر کرتے ہیں۔ دیکھئے ڈرامہ نگار نے کس طرح اسے لفظوں کا پیکر دیا ہے جو مقفیٰ اور مسجع ہونے کے ساتھ ساتھ بیحد آسان ہے "مہاراج آج راج پاٹھ ٹھاٹھ باٹ سے میرا دل اچاٹ ہے، نہ تخت وتاج سے دل بہلتا ہے نہ راج کاج سے۔ دل پر داغ ہے گھر بے چراغ ہے کوئی آنکھوں کا تارا، بڑھاپے کا سہارا نہیں...... ہائے۔"

یہ بالکل خالص ڈرامہ کی زبان ہے۔ یہ زبان فنکار ہی لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ افق لکھنوی عظیم فنکار ہیں اس لئے وہ ہر جگہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ راجہ دشرتھ کے انہیں جذبات کو ڈرامہ نگار نے شعری جامے میں بھی ادا کیا ہے۔ پر اثر شاعری کے ساتھ زبان کی

سلاست اور روانی کو ڈرامہ میں نبھانا عظیم فنکار کا ہی کام ہے۔ دشرتھ کہتے ہیں:

سفید ہے رنگ موئے سر کا چراغ بجھنے کو ہے سحر کا
نہیں ہے گھر میں چراغ گھر کا، یہ کیا غضب ہے، یہ کیا غضب ہے؟
بسر ہے نور بسر نہیں ہے، نظر ہے نور نظر نہیں ہے
جگر ہے لخت جگر نہیں ہے، یہ کیا سبب ہے یہ کیا سبب ہے؟
نہیں نصیب آنکھ کا جو تارا، ہے روئے افکار کا نظارہ
ہو زندگی کا کوئی سہارا، یہی طلب ہے یہی طلب ہے
بغیر دل بند راحت جاں، ہیں جان و دل مضطر و پریشاں
یہ دل میں گریاں، وہ دل میں نالاں، یہ نیم جاں ہے وہ جان بلب ہے
افق شجر کیا جو بے ثمر ہو، صدف وہ کیا ہے جو بے گہر ہو
بشر وہ کیا ہے جو بے پسر ہو، کہ بے نگیں زیب تاج کب ہے؟

وششٹھ جی کے جواب کو ڈرامہ نگار نے مکالمے کی شکل میں جس زبان میں ادا کیا ہے وہ مقفیٰ نثر نگاری کا آسان زبان میں ایک بہترین نمونہ ہے: ''پرتھوی پال، ہے کس طرف خیال، گودی کا ایک لعل ملنا ہے کیا محال، اس کے لئے یہ حال، یہ رنگ یہ ملال، بھگوت پرتھوی پال جس وقت ہو دیال، پورا کرے سوال، پل میں کرے نہال۔''

مکالمہ نگاری

شری رام ناٹک میں ڈرامہ نگار نے کرداروں کے نفسیاتی پہلو کو جاندار مکالموں کے ذریعہ خوبصورتی سے ابھارا ہے۔ داسی منتھرا کے سکھانے پر رام کی سوتیلی ماں رانی کیکئی راجہ دشرتھ کو رام کا راج تلک کرنے سے روکتی ہے، اتنا ہی نہیں وہ دشرتھ سے اپنے بیٹے بھرت کو راج گدی دینے اور رام کو چودہ برس تک جنگل میں رہنے کا حکم دینے کیلئے ضد کرنے لگتی ہے۔ کیکئی اپنی باتیں منوانے کے لئے دشرتھ سے اسکو پہلے کبھی دیئے گئے دو قول (وردان) پورا کرنے کیلئے بضد رہی۔ اور اپنی شرطیں منوانے کیلئے کیکئی کوپ بھون میں جا کر رونے کلپنے کا

ناٹک کرنے لگی۔ راجہ دشرتھ اپنی سب سے پیاری چھوٹی رانی کا یہ حال دیکھ کر کہتے ہیں۔

دشرتھ: ”رانی یہ آج کیسی پریشانی، کیوں کیا حال ہے، کیا ملال ہے، کیوں بیچین ہو، تڑپنے کا باعث کیا ہے، کلپنے کا سبب منہ سے بولو، دل کا بھید کھولو کسی نے دل دکھایا ہو تو اس پر قیامت توڑوں، کسی نے ستایا ہو تو جیتا نہ چھوڑوں، کیا خواہش کیا کاہش ہے۔ کہو چپ نہ رہو تمہارا غم سہا نہیں جاتا، دل پہ جو صدمہ ہے کہا نہیں جاتا۔“

کیکئی ”بس بس بیٹھو منہ دیکھے کی محبت والے بہت، جھوٹی الفت والے بہت دیکھے ہیں مردوں کو اپنی غرض سے غرض ہے انہیں عورتوں کو صرف جال میں پھنسانے کا مرض ہے، یہ للو پتو کریں گے، پانی بھریں گے نہ پابندی قول سے مطلب نہ ایفائے اقرار سے۔ کسی کی جان بھی چلی جائے تو پیزار سے۔ آپ جائیں موج اڑائیں میں جیتی ہوں یا مرتی، خوش ہوں یا جان سے گذرتی، آپ کی بلا سے آپ کو کیا کام وفا سے۔“

دشرتھ ”رانی میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تم نے کیا گایا۔ دل کا حال کہو باعث ملال کہو، تم چاہو تو آکاش کے تارے توڑ لاؤں ہتھیلی پر سرسوں جماؤں جس کا کہو راج چھینوں تخت و تاج چھینوں۔“

کیکئی ”بس آپ کی عنایت درکار ہے آپ کو کیا اسرار ہے مجھے میرے حال پر رہنے دیجئے، دکھ درد جو کچھ ہو سہنے دیجئے“۔

دشرتھ ”بھلا میں نے کیا بگاڑا ہے مجھ سے کیوں خفا ہو، چراغ پا ہو، کہتا جاتا ہوں جو کہو وہی کروں۔“

عمر رسیدہ راجہ دشرتھ کا عمر میں اپنے سے کافی چھوٹی رانی سے اسی لہجہ میں بات کرنا فطرتاً مناسب ہے۔ کیکئی اپنی باتوں سے راجہ کو کس طرح مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق کام کریں، افق کی زبان میں دیکھئے۔

کیکئی: آلہانہ گائے زیادہ باتیں نہ بنایئے کہہ دیجئے قول نہیں ہارا، فقط زبان کا سینچر اتارا تھا۔ وعدہ کس منہ سے کیا تھا، قول کس زبان سے دیا تھا۔ جو کہتی ہوں کرنا پڑے گا میری آہ سے ڈرنا پڑے گا۔“

دشرتھ: قول گلے گلے پانی میں پورا کروں، قلزم موت کی طغیانی میں پورا کروں مگر

رانی رام ایسے کلیجہ کے ٹکڑے کی جدائی کیسے گوارا کروں۔ زندگی کا گذارا کیسے چارہ کروں، میں تو بے موت مرجاؤں گا جان سے گذر جاؤں گا۔"

کیکئی: میں باتوں میں آنے والی نہیں۔ عقل سے خالی نہیں۔ جو کہا ہے کرا کے چھوڑوں گی اپنی ہٹ سے منہ نہ موڑوں گی مرنے جینے کی دھمکی میں نہیں مانتی۔"

یہ مکالمے "تریا ہٹ" (عورتوں کی ضد) کی عکاسی کا بہترین نمونہ ہے۔ کیکئی راجہ دشرتھ کو ان کے دیئے گئے قول کی یاد دلا کر اپنی طرز گفتگو سے انہیں زیر کر دیتی ہے۔ دشرتھ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی رام کو بنباس جانے کا حکم دینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں، وہ صرف بخت کی گردش اور نیرنگی زمانہ کو کوس کر اور من مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں دشرتھ کی ذہنی اور دلی کیفیت کا بیان افق نے کتنے پراثر الفاظ میں کیا ہے دیکھئے:

دشرتھ" او چرخ کج رفتار، او فلک نا ہنجار، اے زمانہ کے نیرنگ یہ کیا رنگ میں بھنگ۔ وعدہ کرتے کیوں زبان نہ جل گئی اسی وقت جان کیوں نہ نکل گئی، کیکئی تو مجھے جیتے جی مارے ڈالتی ہے، نہ معلوم کب کا بخار نکالتی ہے۔ ہائے ہائے اب زندگی کی آس نہیں، میرے ہوش و حواس نہیں، روح بدن سے نکل جا، جسم سوز جگر سے جل جا، کس منہ سے کہوں کہ رام بن کو جائیں۔ کس زبان سے نکالوں کہ جنگلوں بیاباں کی ٹھوکریں کھائیں۔ ہائے میں تو بے موت مر گیا، تیر الم جگر سے گذر گیا۔"

اس پورے ڈرامہ میں ڈرامہ نگار نے تمام کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کو جاندار مکالموں کے ذریعہ خوبصورتی سے ابھارا ہے۔

گیت اور غزلیں

شری رام ناٹک میں کچھ بہت ہی اچھے گیت اور غزلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کیونکہ افق فطرتاً باکمال شاعر ہیں اس لئے ان کے لکھے اس ناٹک میں گیت اور غزلوں میں ان کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ گیتوں اور غزلوں کی زبان بھی موقع و محل کے حساب سے بدلتی رہتی ہے۔ کہیں کہیں پر شاعر فلسفیانہ انداز میں اپنے خیالات کو شعری جامہ پہناتے ہیں۔ شری

رام جنم کے مبارک موقع پر اپ نشدوں اور پرانوں میں بیان کئے گئے فلسفہ کو شاعر نے نہایت خوبصورت طریقہ سے نظم کیا ہے کہ نیک صفات لوگوں کی نگرانی کے لئے اور گناہ کرنے والوں کو تباہ کرنے کے لئے اور دیداری اور نیک عملی کو قائم رکھنے کے لئے ہر عہد میں ایشور کا آنا ممکن ہے۔ اسی خیال کو شری رام کے اوتار کی وجہ بتاتے ہوئے افق نے ناٹک میں یہ نظم لکھی ہے:

دنیا میں سری رام کا اوتار ہوا ہے
اب تک جو نراکار تھا ساکار ہوا ہے
ہے جلوہ گری کی وہ خوشی جلوہ نماں کو
دیدار سے خود طالب دیدار ہوا ہے
کیوں کر نہ کھلے رمز حقیقت کی حقیقت
خود پردہ کشا پردہ انوار ہوا ہے
جب پاپ بڑھا خود ہی نمودار ہوئے ہیں
بھکتوں پہ کرم یوں ہی کئی بار ہوا ہے
ظالم ہوں خبردار ستمگر ہوں خبردار
دنیا کا خبرگیر خبردار ہوا ہے

رام ناٹک کے گیتوں میں اردو اور ہندی کی ملی جلی زبان کا لطف دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان گیتوں میں موسیقیت کی خوبی بھی ملتی ہے۔ گیتوں میں لفظوں کا انتخاب ایسا ہے کہ ترنم خود بخود ہونٹوں پر آ جاتا ہے۔ کسی کسی گیت میں پرانوں کی تمام کتھائیں نظم کر دی گئی ہیں۔

ڈرامے کے ایک سین میں جہاں وشوامتر منی یگیہ پوجا میں رخنہ ڈالنے والے جنگل کے راکششوں سے پریشان ہو کر راجا دشرتھ سے رام اور لکشمن کو راکششوں کو ختم کرنے کے لئے اپنے ساتھ بھیجنے کی استدعا کرتے ہیں اور راجہ دشرتھ کو اپنے بیٹوں کی محبت اور کمسنی کی وجہ سے انہیں تاڑکا اور صباہو جیسے راکششوں کو مارنے کے لئے وشوامتر جی کے ساتھ بھیجنے میں تردد ہوتا ہے اس کو افق لکھنوی نے جو شعری پیکر دیا ہے اس میں شاعر کی مرصع کاری کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ نظم اعلیٰ شاعری اور ناٹک میں شفقت یا واتسلیہ رس کے بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اس گیت میں بھی موسیقیت کی خوبی ہے جو اردو شاعری کی ہی نہیں بلکہ سبھی زبانوں کی

شاعری کی ایک خاص خوبی تسلیم کی جاتی ہے۔ افق نے رام ناٹک کے اس گیت میں لفظوں کا انتخاب اور ان کی بندش اس طرح سے کی ہے کہ ایک ایسی آواز، ایسا سر، ایسی جھنکار پیدا ہوتی ہے جو ترنم سے پر ہوتی ہے۔ ڈرامہ کے اس سین میں راجہ دشرتھ، وشوامتر جی سے کہتے ہیں:

ابھی سن ہے رام لکھن کا کیا، کہاں ان میں تاب و تواں ابھی
نہیں دانت اکھڑے ہیں دودھ کے، بھری دودھ سے ہے زبان ابھی
میرے دونوں آنکھوں کے تارے ہیں، مجھے جان پران سے پیارے ہیں
میری زندگی کے سہارے ہیں، انہیں بن میں بھیجوں کہاں ابھی
یہ ہیں دونوں مجھ سے ملے ہوئے، دل و جان سے ہیں ملے ہوئے
یہ ہیں پھول ابھی کے کھلے ہوئے، کروں کیسے نظر خزاں ابھی
نہیں کھیل بچوں کا جنگ ہے، وہاں کار تیر و تفنگ ہے
نہ تو شیر ہے نہ پلنگ ہے، میرا کوئی راحت جاں ابھی
مجھے رنج ہوگا جدائی میں، نہ یہ ٹک سکیں گے لڑائی میں
کہ ہے موچ آتی کلائی میں، جو اٹھاتے ہیں یہ کماں ابھی
جو کرم کی مجھ پہ نگاہ ہو، تو نہ تاڑکا نہ صباہو ہو
ابھی ہم رکاب سپاہ ہو، چلے ساتھ فوجیں گراں ابھی

اولاد کی محبت میں ڈوبے ہوئے راجہ دشرتھ کے ان جذبات کو سن کر وشوامتر منی نے جو جواب دیا اسے شاعر نے رہسیہ وادی اور فلسفیانہ پیکر دیا ہے۔ اپنشد سے ماخوذ اس تصور کو کہ ایشور ساری کائنات میں موجود ہے، وہ حاضر اور ناظر ہے سب کچھ دیکھنے والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے اور مختار کل ہے، افق نے کس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے دیکھئے یہ ناٹک میں پرسکون علامت یعنی شانت رس کے اظہار کی بہترین مثال ہے:

جنہیں رام چندر سمجھتے ہو وہ تمہارے نور نظر نہیں
اگر ہیں تو کون جو ہیں تو کیا تمہیں نام کو بھی خبر نہیں
یہ جہاں میں جملہ ازاوست ہیں، ہمہ اوست ہیں ہمہ اوست ہیں
ہمہ اوست جملہ ازاوست ہیں، یہ بشر نہیں یہ بشر نہیں

یہ عدم میں ہیں، یہ وجود میں، یہ ہیں ہست میں یہ ہیں بود میں
یہ ہیں نفع میں یہ ہیں سود میں، یہ جگت پتا ہیں پسر نہیں
یہی آب و تیر و خدنگ ہیں، یہی دار تیغ و تفنگ ہیں
یہی شعر بیشہ جنگ ہیں، انہیں بن میں جانے دو ڈر نہیں
یہ ہے ڈر نہ قہر و عتاب ہو، دل و جاں پہ مفت عذاب ہو
کہیں عاقبت نہ خراب ہو، کہ نہیں نہیں سے مفر نہیں

رام ناٹک میں ڈرامہ نگار کے فن کا کمال یہ ہے کہ کردار کی ذہنیت کے حساب سے اس کے مکالمہ یا اس کے گیت اور غزلوں کی زبان بالکل بدل جاتی ہے۔

رام کے راج تلک کیے جانے کی خبر سے اور کوشلیہ کے راج ماتا ہو جانے کے امکان سے کیکئی کے دل میں جو حسد پیدا ہوتی ہے اس کا اظہار کیکئی کی زبان میں افق نے اس طرح کیا ہے:

لگی ہے سینہ میں آگ ایسی، دھواں ذہن سے نکل رہا ہے
ادھر کلیجہ سلگ رہا ہے، ادھر دل زار جل رہا ہے

راون کی بہن سورپنکھا شری رام چندر کو دیکھ کر ان پر فدا ہو جاتی ہے اور ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے۔ ایک بدکردار عورت کس طرح سے اور کن الفاظ میں اپنے دلی جذبات کا بیان کرے گی اسے افق کے مطابق سورپنکھا کے گائے ہوئے اس گیت میں دیکھئے جو سنیوگ شرنگار یعنی ملن کی چاہ کا بیان کرتا ہے:

دل آگیا ہے، طبیعت پہ اختیار نہیں
شکیب و صبر و تحمل نہیں، قرار نہیں
ہے ماننے کا یہاں شوق ہم کنار نہیں
کرو تم ایک نہیں کیا اگر ہزار نہیں
کہوں کر جوری
شمیم زلف سے تازہ دماغ کر دوں میں
گل عذار سے دل باغ باغ کر دوں میں

روا کے چشم رخ کو چراغ کر دوں میں
قمر کے نور سے کافور داغ کر دوں میں
دیکھو گت موری

لنکا کے راجہ راون کے سیتا جی کو ہر لے جانے کے بعد شری رام چندر اپنے رنج وغم اور ہجر کا بیان کرتے ہیں۔ رام کے ان جذبات کو افق نے اپنی شاعری میں نہایت پر درد انداز میں بیان کیا ہے۔ رام ناٹک کے اس گیت میں تشبیہات استعارات کا استعمال اور موسیقیت خاص طور سے قابل غور ہے، بہترین شاعری کے اس نمونہ سے لطف اندوز ہوں جس میں کروں رس کی عکاسی کی گئی ہے۔

گئیں سیتا، نہیں معلوم کہاں رو رو کر
پیچھے دشمن کے پڑا ہاتھ نہ کوئی دھو کر
نوک مژگاں کا نہ جنباں ہوا خارستاں میں
روکا جھاڑی نے بھی ظالم کو نہ کانٹے بو کر
الجھی سنبل بھی نہ زلفوں کی طرفداری میں
سرو نے بھی پائے قامت نہ لگائی ٹھوکر
عوض ان آنکھوں کے اٹھا نہ ہرن بھی کوئی
نہ لڑے دیدۂ نرگس بھی مقابل ہو کر
بولی سوسن بھی دہن کی نہ ہوا خواہی میں
نہر کی لہروں نے بھی غم نہ کیا رو رو کر
اے افق ہوش میں دشمن کو اسے لانا تھا
کی بڑی سبزۂ خوابیدہ نے غفلت سو کر

سیتا جی کی کوئی خبر نہ ملنے پر شری رام چندر کے رنج وغم کا اظہار افق نے ایک غزل کے ذریعہ بھی کیا ہے:

دل تڑپ جاتا ہے جس دم یہ خیال آتا ہے
سیتا کہتی ہیں کرو چت یہ غزال آتا ہے

غم میں سیتا کے بعینہ دل میں ہے شگاف
جس طرح ٹھیس سے آئینہ میں بال آتا ہے
جدت آتش غم سے نہیں تھمتے یوں اشک
آگ پر دودھ کے جس طرح ابال آتا ہے
ہائے سیتا یہی کہتا ہوں میں بخت فریاد
پیچھے غش آتا ہے پہلے مجھے حال آتا ہے
جان کی مجھ کو نہیں سیتا کے غم میں پرواہ
غم یہ ہے دم نہیں سینہ سے نکل جاتا ہے
چونک اٹھتا ہوں جو چلتی ہے نسیم سحری
جان کی جی کی خبر پہ کے صبا لاتا ہے
اے افق زردیٔ رخ ہی پہ نہیں کچھ موقوف
باہر آنکھوں سے جو اشک آتا ہے لال آتا ہے

یہ اشعار اس شخص کی کیفیت کو سہی طور پر بیان کرتے ہیں جس کا جان سے بھی زیادہ عزیز کو کوئی کہیں اٹھا لے گیا ہو اور اسے کون لے گیا ہے کہاں لے گیا ہے اس کی سراغ رسانی بھی نہیں ہو پا رہی ہو۔ اس نظم میں شاعر نے ہجر کی کیفیت یا و یوگ شرنگار کی اچھی مثال پیش کی ہے۔

شری رام ناٹک کے کچھ گیت اپنے وقت میں بہت مقبول ہوئے۔ ایسا ہی ایک گیت لکشمن جی کے شکتی بان لگنے اور شری ہنومان جی کے سنجیونی بوٹی لانے کے سلسلہ میں ہے۔ لکشمن جی کی جان بچ جائے اس کے لئے ضروری تھا کہ ہنومان جی سورج طلوع ہونے سے پہلے اکسیر بوٹی سنجیونی لے کر لکشمن جی کے پاس پہونچ جائیں۔ سنجیونی بوٹی لے کر پہنچنے میں ہو رہی دیر سے پریشان شری ہنومان جی سے شاعر نے سورج کی استتی ان الفاظ میں کروائی ہے:

بڑھا دے آج کی شب اور چرخ پیر تھوڑی سی
کہ لے آؤں لکھن کے واسطے اکسیر تھوڑی سے
نہ جانے زہر چھٹکا کس طرح رگ رگ میں نس نس میں
چبھی تھی صرف سینہ ہی میں نوک تیر تھوڑی سی

سحر ہوتے ہی سورج بنس میں مچ جائے گا ماتم
شری سورج نکلنے میں کریں تاخیر تھوڑی سے
سجیون کیا ہے راتوں رات پہنچوں کوہ کو لیکر
پون جی گر مدد تھوڑی سی دیں، رگھوبیر تھوڑی سی
جلانا لکشمن کو کون مشکل کام ہے لیکن
دکھانا ہے دوا کی بھی افق تاثیر تھوڑی سی

شری رام ناٹک کے گیتوں اور مکالموں میں رہسیہ واداور فلسفیات سے پر بیان ملتے ہیں جو یقیناً اس ناٹک کو اونچے مقام پر فائز کرا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب شری رام چندر جی کی پیروں کی دھول چھو جانے سے گوتم رشی کی پتنی اہلیہ کو دوبارہ پتھر سے انسان کا چولا مل جاتا ہے تو اہلیہ کی زبان سے شری رام چندر جی کی استتی اس طرح فلسفیات سے پر الفاظ میں کروائی ہے۔ یہ گیت بھگتی رس یا جذبۂ عقیدت کی عکاسی کا ایک اچھا نمونہ ہے:

شری رام تم مالک دو جہاں ہو
ترا زندۂ نقش کون و مکاں ہو
کہاں تم نہیں ہر جگہ تم کو پایا
ادھر ہو ادھر ہو، یہاں ہو وہاں ہو
تم ہی سے ہے جلوہ وجود عدم کا
ہویدا ہو، گم ہو، عیاں ہو، نہاں ہو
پھرو تم تو پھر جائے سارا زمانہ
ہو سب مہرباں اگر تم مہرباں ہو
کیا ہے جو احسان خاک قدم نے
کہاں تک بیاں ہو کہاں تک بیاں ہو
افق یہ ہوس چاہیئے زندگی میں
سدا رام نام اور اپنی زباں ہو

جٹایو کے مرنے پر رام چندر جی لکشمن کو زندگی کی بے ثباتی کی حقیقت کو کس طرح سمجھاتے ہیں اس کو افق نے ایک خوبصورت قطعہ کے ذریعہ بیان کیا ہے:

نہ کسی کا جہاں میں قیام رہا
یہ دو روزہ مسافرخانہ ہے
جو عدم سے وجود میں آیا تھا کل
وہی آج عدم کو روانہ ہے

افق نے راون کی موت سے پہلے اس کی زبان سے نوشتۂ قسمت کے رمز کا خلاصہ کس طرح کروایا ہے دیکھئے:

کھل گئی آنکھیں کچھ ایسا تیر مارا رام نے
بشن کی صورت لگی پھرنے نظر کے سامنے
جانئے موت اس کو یا کہئے دوامی زندگی
مکتی کا مژدہ سنایا موت کے پیغام نے
دست گیری عمر بھر کی جنکی اف رے انقلاب
کوئی ہاتھ اس وقت ان میں سے نہ آیا تھامنے
وقت مغرب آفتاب زندگی روشن ہوا
اختر تقدیر چمکایا سواد شام نے
تین جنموں سے جو چکر تھا ملی اس سے نجات
خوبئ قسمت دکھائی گردش ایام نے

رام ناٹک میں افق نے ٹھمریوں اور دوسری طرزوں کے ہندی گانے بھی شامل کئے ہیں جو اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔ افق کو ہندوستانی سنگیت کی بھی اچھی معلومات تھی اس لئے اس ناٹک میں کلاسیکل موسیقی کی کئی راگ راگنیوں کی طرز پر انھوں نے گانے لکھے۔ جن میں بعض ایک دھنیں بہت مشکل تھیں۔ کردار کے حساب سے انکے گائے گیتوں کی زبان اور طرز بھی الگ ہوتی تھی، مثال کے طور پر چتر کوٹ میں رام، لکشمن اور سیتا کو اپنی ناؤ میں گنگا جی کے پار اتارنے کے پہلے کیوٹ ان سے ایک گیت کے ذریعہ التجا کرتا ہے کہ رام اُسے

سنسار روپی سمندر کو پار کرنے میں مددگار ہو جائیں۔ اس گیت کو ساون میں گائے جانے والے اودھی زبان کے ایک بہت مقبول لوک گیت کی دھن میں باندھا گیا ہے، جو راگ ملہار پر مبنی ہے:

سیاپتی موری جھانجھر نیا بیگ لگا دیجئے پار رے
بھوساگر جل لیت ہلوریں، چلت ساون کی بیار رے
تم بن کو موری کھیوے نیا، کیوٹ نپٹ گوار رے
رین اندھیریا چھائی بدریا، اوپر پڑت فوہار رے
ڈوبت من جھانجھر نیا بیچ، تاکو لیو ابار رے

محاورات زبان کا استعمال

رام ناٹک میں ڈرامہ نگار نے مکالموں کے علاوہ شعروں اور غزلوں میں بھی بامحاورہ زبان استعمال کی ہے، جو ڈرامہ کے معیار کو یقیناً اونچا اٹھاتی ہے، مثال کے طور پر ڈرامہ کے حسب ذیل اشعار دیکھئے:

غافل کو لاؤ ہوش میں یہ جان کر افق
اندھے کو راستہ نہ بتانا گناہ ہے

***

مجھ سے بچے کو یہ فرسہ کا دکھانا کیسا
مار کر پھونک پہاڑوں کا اڑانا کیسا

***

یوں بپھرے ہوئے شیر کو ٹوکا ہے کسی نے
طوفاں کے تھپیڑوں کو بھی روکا ہے کسی نے

***

جو تڑپاتی ہے دل کو وہ صدائے ناز کس کی ہے
کلیجہ پر ہو جس سے چوٹ وہ آواز کس کی ہے

***

زخم الم سے پہلو پھوڑا سا پک رہا ہے
ناسور دردو غم سے دل میں تپک رہا ہے

***

آندھیاں گرد ہوئی خاک اڑائی ایسی
رو دیا ابر گھٹا رنج کی چھائی ایسی
پاؤں کی دیکھی نہ چھالوں نے تھکائی ایسی
جانتے ہی نہیں خار آبلہ پائی ایسی

***

منظر نگاری

شری رام ناٹک کے مناظر بہت دلکش اور دلفریب ہیں جو نثری اور شعری ادب سے مزین ہیں۔افق بہت بڑے منظر نگار ہیں، ڈرامہ نگاری کے فن کے اعتبار سے اور شعری ونثری اعتبار سے بھی عظیم ڈرامہ نگار کا درجہ رکھتے ہیں ان کی منظر نگاری محاکات کا خوبصورت نمونہ ہے۔نثر میں منظر نگاری کی ایک مثال دیکھئے۔

رام ''واہ کیا گلزار ہے، کیا باغ ہے، ہمیشہ بہار ہے، درخت جھومتے ہیں، طاؤس گھومتے ہیں، کبکوں کے قہقہے قلب کو لبھاتے ہیں، بلبلوں کے چہچہے دلوں کو لبھاتے ہیں شاخیں ہری ہیں، نہریں بھری ہیں''۔

لکشمن ''ہاں بھائی صاحب کیا واقعی عجب بہار ہے، عجیب سبزہ زار ہے۔''

نظم میں بھی افق کی منظر نگاری کے فن سے لطف اندوز ہوں:

دماغ وقلب بس جاتا ہے پھول ایسے مہکتے ہیں
کلی کھل جاتی ہے دل کی جہاں غنچہ چٹکتے ہیں

ہری ہوتی ہیں آنکھیں دیکھ کر سبزہ کا نظارہ
پھڑک اٹھتا ہے مرغ روح جب طائر چہکتے ہیں

***

طبیعت بوستاں کو دیکھ کر گلزار ہوتی ہے
کنول کھلتا ہے دل کا شاخ جب گلزار ہوتی ہے

اس ڈرامہ میں سیکڑوں مقامات ایسے آتے ہیں جہاں زبان و بیان معراج کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔ زباندانی اور بیان کی خوبصورت مثال دیکھئے خصوصاً ہندوستانی فطرت کے پس منظر میں:

''ہر رنگ کے پھول مہکتے ہیں، آم اور انگور ٹپکتے ہیں، شاخوں پے طیور چہکتے ہیں، طاؤس روش پہ تھرکتے ہیں۔''

افق کو منظر نگاری میں فطرت کے بیان میں ہی کمال حاصل نہیں ہے وہ کسی بھی شخص یا کسی بھی محفل میں بیٹھے تمام لوگوں کی دلی حالت اور کیفیت کو کم سے کم لفظوں میں اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ قاری کے سامنے پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ دھنش یگیہ کے موقع پر شیو کے دھنش کے ٹوٹنے کی خبر سن کر پرسرام جی غصہ سے آگ ببولا ہو جاتے ہیں اور اپنی گفتگو سے محفل میں ایک قہر سا برپا کر دیتے ہیں جس سے راجہ جنک سمیت محفل میں موجود سارے راجہ مہاراجہ ڈر جاتے ہیں، پرسرام جی کے رعب و داب کی منظر کشی کرتے ہوئے افق نے حسب ذیل صرف ایک شعر کے ذریعہ ہولناک منظر یا رودر رس کی عکاسی کی ہے۔

دبدبہ روح جنگ قبض کئے دیتا تھا
طنطنہ سلب ہر ایک نبض کئے دیتا تھا

اس ایک شعر کے ذریعہ شاعر نے بہت خوبی سے ہولناک منظر کی عکاسی کی ہے۔
اس طرح ناٹک سے مکالموں اور گیتوں کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں بڑا زور ہے اور جو منظر نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔

سراپا نگاری

شری نام ناٹک زبان، بیان اور فن ڈرامہ نگاری کے اعتبار سے افق لکھنوی کا عظیم کارنامہ اور شاہکار ہے، ان کے اس ایک ڈرامے میں ہی ڈرامہ کا فن اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ رام کا سراپا سیتا کی زبان میں ڈرامہ نگار نے جس طرح بیان کیا ہے اس کی نثر اور انداز بیان دیکھئے:

سیتا جی ''پیاری سکھیوں، سچ مچ بڑے اچھے سوروپ ہیں، کیسے وشال، کیسے انوپ نیلم میں کندن کی دمک، گھٹا میں بجلی کی چمک دیکھنا ہے تو سانولی صورت میں دیکھئے۔ سامنے والی موہنی مورت میں دیکھئے۔''

افق نے رام ناٹک میں رام کا جو سراپا بیان کیا ہے اس میں تقدس ملحوظ ہے یوں بھی شخصیت کے اعتبار سے لفظوں، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا انتخاب کرنے میں افق کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ رام ناٹک میں رام کا سراپا بیان کرنے میں ان کا فن شاعری اپنے عروج پر پہنچا ہوا معلوم دیتا ہے، کچھ مثال دیکھئے:

پتلیاں سانولی صورت پہ فدا رہتی ہیں
نظر منتظر چشم وفا رہتی ہیں
آنکھیں بیمار سی محتاج شفا رہتی ہیں
مائل سرمۂ خاک کف پا رہتی ہیں

***

سانولے رنگ میں چہرے کی چمک ملتی ہے
ابر میں روشنی برق فلک ملتی ہے

***

منفعل چاند سداشو کے دھنش سا دیکھا
جس نے دیکھا انہیں خورشید کے شک سے دیکھا

***

غم دنیا، غم فردا، غم عصیاں نہ رہا
دیوتا ہو گیا انساں سے وہ انساں نہ رہا

رام ناٹک میں سیتا جی کی سراپا نگاری بھی ایک گیت کے ذریعہ کی گئی ہے جس میں اودھی زبان اور برج بھاشا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

افق کا ایک دوسرا ڈرامہ 'کرشن سداما' دستیاب نہیں ہے لیکن ان کا صرف 'شری رام ناٹک' ان کو فن ڈرامہ نگاری میں حیات جاویدانی عطا کرنے کے لئے کافی ہے ان کے اس ایک ڈرامہ میں ڈرامہ کا فن اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔

****

****

***

افق لکھنوی اہل نظر کی نگاہ میں

''جناب افق نے مختلف حیثیتوں سے شعر و ادب کی بڑی خدمت کی۔ وہ کئی اخباروں کے اڈیٹر رہے، کئی ناول تصنیف کئے، کئی سوانح عمریاں لکھیں، رسالوں میں مضامین شائع کئے، گیت بنائے، ڈرامے لکھے، اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے اور خاص طور پر شاعری میں شہرت حاصل کی۔ انہوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ کی۔ وہ تمام اصناف سخن پر قادر تھے اور ان کی نظموں کا میدان بہت وسیع تھا۔ ان کا نظم اخبار جو تقریباً تمام نظم میں ہوتا تھا، ان کی پُرگوئی اور زودگوئی کا شاہد ہے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ مقدار اور معیار دونوں حیثیتوں سے قابل قدر ہے۔''

سید مسعود حسن رضوی

''منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی اپنے دور میں ادبی افق کے روشن ستاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کے کئی گوشوں کو منور کیا اور شعر و ادب کے ذریعہ ان تہذیبی قدروں کی ترجمانی بھی کی جس کے روشن پہلوؤں کے وہ رازداں تھے۔ یوں تو انہوں نے ناول، ڈرامے، تاریخ اور داستان ہر صنف کو اپنی قوت تخلیق کا کچھ حصہ دیا لیکن ان کا اعلیٰ ترین کارنامہ وہ ہے جو رامائن کے ترجموں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ خاص طور سے ان کے منظوم ترجمے ان کی قدرت زبان اور قوت اظہار کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ ترجمے پھر شائع کئے جائیں تاکہ موجودہ نسل کے پڑھنے والے بھی ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔''

سید احتشام حسین

''حضرت افق کو کون نہیں جانتا۔ مطلع شاعری پر آج بھی آپ کا آفتاب دمک رہا ہے اور ہمیشہ دمکتا رہے گا۔ ہر چند افق صاحب نے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن اس فرصت قلیل اور مہلت گریز اں کے باوجود آپ اردو زبان اور اردو ادب کو وہ عظیم سرمایہ دے گئے ہیں کہ دوسرے ایسا بیش بہا سرمایہ سو برس میں بھی نہیں دے سکتے۔''

جوش ملیح آبادی

''آپ کا میدان فکر و خیال وسیع تھا۔ شاعر، ناثر، اخبار نویس، مترجم، مؤرخ، ڈرامہ نگار، ناول نویس، ظرافت نگار غرض ادب کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا جس میں آپ کے قلم نے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ علم عروض و قافیہ اور صرف و نحو کے ماہر تھے۔ کئی کتابیں آپ نے قواعد پر لکھیں۔ تاریخی معلومات بہت وسیع تھی۔ نثر تو قلم برداشتہ لکھتے ہی تھے، نظم میں بھی یہ کمال تھا کہ بات بات میں مصرعے اور شعر زبان سے نکلتے تھے۔ نظم میں ہر صنف میں آپ نے زور قلم دکھایا۔ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ تحریر و تصنیف سے خالی نہ تھا۔ آپ کی تحریر میں روانی اور دلکشی ہے اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا چٹخارہ ہے۔''

منشی شیام نارائن لال جگر بریلوی

DESIGNED AT : S. F. GRAPHIX   PRINTED AT : KAKORI OFFSET PRESS, LKO. PH. : 2629616, 6535663